بابِ پنجم

''تنقید نگاری''

تنقید نگاری

لفظ تنقید عربی مادہ نقد سے مشتق ہے جس کے معنی کھرے کھوٹے کو الگ کرنا ہے۔ ویبسٹر انٹرنیشنل ڈکشنری میں تنقید کی تعریف یہ بتلائی گئی ہے کہ تنقید کامل بصیرت وعلم کے ساتھ موزوں ومناسب طریقہ سے کسی ادب پارے یا فن پارے کے معائب ومحاسن کی قدر شناسی یا اس کے بارے میں حکم لگانا یا فیصلہ صادر کرنا ہے۔ نیو انگلش ڈکشنری کے بموجب ''کسی ادب پارے یا فن پارے کے خصائص اور ان کی نوعیت کا تعین کرنا تنقید ہے۔ آئی اے رچرڈز کے خیال کے مطابق تنقید کا کام کسی مصنف کے کام کا تجزیہ، اس کی مدلل توضیح اور بالآخر اس کی جمالیاتی قدروں کے بارے میں فیصلہ صادر کرنا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ کا خیال ہے کہ تنقید فکر کا وہ شعبہ ہے جو یا تو یہ دریافت کرتا ہے کہ شاعری کیا ہے؟ اس کے فوائد و وظائف کیا ہیں؟ یہ کن خواہشات کی تسکین کرتی ہے۔ شاعر شاعری کیوں کرتا ہے؟ اور لوگ اسے کیوں پڑھتے ہیں؟ یا پھر یہ اندازہ لگاتا ہے کہ کوئی شاعری کیا نظم اچھی ہے یا بری ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کے مطابق تنقید کا کام فیصلہ ہے۔ تنقید دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتی ہے۔ تنقید وضاحت ہے، صراحت ہے، ترجمانی ہے، تفسیر ہے، تشریح ہے، تحلیل ہے، تجزیہ ہے،۔۔۔۔۔ تنقید انصاف کرتی ہے۔ ادنیٰ اور اعلیٰ اور جھوٹ اور سچ، پست و بلند کے معیار قائم کرتی ہے۔ تنقید ہر دور کی ابدیت اور ابدیت کی عصریت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔۔۔۔۔''

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کے مطابق صحیح، غلط، اچھے برے، حق و باطل کے درمیان فرق کرنے، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنے، صحیح مذاق پیدا کرنے کی کوشش کا نام تنقید ہے۔ بقول پروفیسر سیدہ جعفر تنقید دراصل بے لاگ جانچ پڑتال اور امتیازات کے جذبے سے بلند ہو کر تعین قدر و مقام کا نام ہے۔ تنقید تحلیل، تجزیہ، ترجمانی، تفسیر، ادراک، حقیقت اور ادبی محاسبہ ہے۔ وہ آرٹ کے اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے صادر کرنے اور جچے تلے محاکمہ کا نام ہے۔ ہڈسن کے مطابق تنقید میں ترجمانی، تشریح اور تجزیہ شامل ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے فن پارہ کو جانچنے، پرکھنے، اس کی اہمیت کا پتہ لگانے اور اس کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کو تنقید کا نام دیا ہے۔ تنقید نگار رہبری کرتا ہے، رہبر ہمدرد ہوتا ہے اور ہمدرد تضحیک نہیں کر سکتا اور جو لوگ فنکاروں کی تضحیک کرتے ہیں انہیں ڈاکٹر عبادت بریلوی کے الفاظ میں صحیح معنوں میں تنقید نگار کہا ہی نہیں جا سکتا۔ خواجہ الطاف حسین حالیؔ تنقید کو محض کھرے کھوٹے کی جانچ کا آلہ تصور نہیں کرتے بلکہ تنقید کو ادب میں اصلاح کردار اور اخلاق کو استوار کرنے کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے لکھا ہے ''تنقید کا مقصد ادب کے صرف معائب اور محاسن کو اجاگر کرنا نہیں معاشرتی اقدار کو بہتر بنانا، تہذیب کو مثبت راہوں پر لگانا اور اس کو نکھارنا بھی ہے۔۔۔ تنقید کا منصب۔۔۔ اس کو (ادب کو) انسانی تہذیب کی اعلیٰ اقدار کا وارث بنانا ہوتا ہے۔ انہوں نے میتھیو ارنلڈ کے اس قول کا بھی حوالہ دیا کہ فن پارے کا جائزہ لیتے ہوئے نقاد کو اس کے تہذیبی ماحول پر بھی نگاہ رکھنی چاہئے جس میں کہ وہ فن پارہ وجود میں آیا ہے۔ ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس کے مطابق تنقید کسی ادب پارے کا وہ مطالعہ ہے جو ہمیں کسی نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔ اس میں تشریح، تجزیہ، توضیح، تصفیہ (محاکمے)، تحسین، تقابل، تقدیر (قدر شناسی)، ترتیب، تدریج، توسیع، تحقیق اور تخلیق یہ سارے پہلو اور تمام زاویے شامل ہیں۔ 1

پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے مطابق ادبی تنقید کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ فنکار اور اس کے مخاطبین کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کی سب سے موثر، قابل اعتبار اور قابل وقعت تدبیر ہے۔ اعلیٰ فنکار جن نازک اشاروں، جن لطیف استعاروں، جن معنی خیز ایجاز و اختصار، جس اندرونی تخیلی ارتباط اور جس سخت گیر تنظیم و تطابق سے کام لیتا ہے وہ بسا اوقات عام قاری کے لئے ناقابل فہم ہوتا ہے اور تاوقتیکہ نقاد ان تمام محاسن اور خوبیوں کو پڑھنے والوں کے لئے نمایاں نہ کرے، فنی کارنامہ اپنے اصل مقصد یعنی ابلاغ کے حصول میں ناکام رہتا ہے۔ دراصل معیاری تنقید ادبی کارناموں کو حیات و دوام بخشتی اور ان کے خلاقین کو ان کے صحیح منصب پر سرفراز کرتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم، تنقید مستقبل کی تخلیق کو بے لگام ہونے سے بچاتی ہے یعنی تنقیدی عمل ماضی یا حال تک محدود نہیں ہوتا بلکہ مستقبل کے فنکاروں کے معیارات کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

نقطہ نظر کے اختلاف کی وجہ سے تنقید کے متعدد دبستان وجود میں آئے۔ مثلاً جمالیاتی تنقید ادبی فن پاروں میں مسرت اور حسن کے اجزاء تلاش کرتی ہے۔ تاثراتی تنقید میں تنقید نگار ان تاثرات کا اظہار کرتا ہے جو کسی تخلیق کے مطالعہ سے اس کے دل پر طاری ہوتے ہیں۔

اس کے سامنے کوئی متعین اصول نہیں ہوتے۔ وہ محض اپنے انفرادی شعور اور وجدان کی رہنمائی میں کسی ادب پارے کو پرکھتے ہیں۔ نفسیاتی نقاد مطالعہ فن کے لئے فن کار کی شخصیت، وراثت اور ماحول کا جائزہ لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق ان عناصر کے امتزاج سے فن کار کی ذہنی تشکیل ہوتی ہے۔

ترقی پسندی کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر فصیح احمد صدیقی نے لکھا ہے:

''ترقی پسندی حیات کے ہر شعبہ میں ترقی چاہتی ہے۔ لہٰذا وہ ہر شعبہ کے موجودہ انحطاط کی تصویر کشی کرتی ہے اور اس پر تنقید کرتی ہوئی مستقبل کی تبدیلی اور ارتقاء کی راہ دکھلاتی ہے۔ ترقی پسندی ہر نوع کی استحصالی قوتوں اور ہر قسم کے دباؤ کو عریاں کرتی، ان پر تبصرہ کرتی اور ان کے خلاف جہاد کرتی ہے۔ ترقی پسندی صرف مظلوم ہی کی حالت و کیفیات سے بحث نہیں کرتی بلکہ وہ ظالم کے چہرے سے نقاب اٹھاتی ہے اور اس کے دل کو بھی کھول کر رکھ دیتی ہے''۔2

ترقی پسند تنقید پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر سید محمود الحسن نے فنکار پر سماج اور اس کے ماحول کے اثرات کی نشاندہی کی ہے اور ترقی پسند نقادوں نے ادب سے زندگی کی بہتری کے لئے جو کام لیا ہے اس کی وضاحت بھی کی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

1۔ ترقی پسند تنقید کے نظریات میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ ادیب و شاعر کے جذبات کسی الہامی طاقت کا عطیہ نہیں بلکہ ان کے سارے احساسات، تاثرات اور شعور و ادراک کی تخلیق سماج اور ماحول کے زیر اثر ہوتی ہے''۔

2۔۔۔۔۔ادب سے ان نقادوں نے یہ کام لیا کہ اس کے ذریعہ زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے جس کے لئے اس بات پر زیادہ سے زیادہ توجہ کی گئی کہ سماجی زندگی کی ہر کمزوری، اس کی تلخی، گھناؤنے پن کی ہر بنیاد اور طبقاتی کشمکش کے ہر پہلو کو اجاگر کیا جائے تاکہ زندگی کی ان کجرویوں کو پیش کر کے ان میں افادیت اور اعلیٰ مقاصد شامل کئے جائیں۔ اس طرح ایک طرف اس تنقید میں فن کو محض داخلی کیفیات کے اظہار تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ خارجی مسائل بنیادی شکل اختیار کر گئے۔

دوسری طرف اس میں حقیقت پسندی اور افادیت کو زیادہ جگہ دی گئی جسے ان لوگوں نے فن کے ذریعہ زندگی کی تنقید کا ایک آلہ بنایا''۔۔۔۔۔

3۔۔۔۔۔اسی نظریہ کی روشنی میں ادب برائے ادب کے پیروؤں کی شدید مخالفت بھی کی''۔۔۔۔۔۔

4۔۔۔۔۔''ان نقادوں نے جب تخلیق کو اپنے دور کی سماجی زندگی سے گہرے طور پر مربوط ہونے پر زور دیا تو اس کے پیش نظر مقصدیت اور افادیت کی طرف بھی توجہ دلائی۔انہوں نے بتایا کہ جب ادب سماجی ضرورت کی عکاسی کے لئے استعمال کیا گیا تو اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کی طرح اسے بھی بغیر مقصد کے قبول نہیں کیا جا سکتا۔اور وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ محض حسن آفرینی یا ذاتی تراثرات کا اظہار ہی ادب نہیں ہے بلکہ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ سماجی زندگی کو متاثر بھی کر سکے۔''

پروفیسر احتشام حسین نے بتایا کہ ترقی پسند نقاد سماجی مسائل کا حقیقت پسندانہ جائزہ،طبقاتی کشمکش کی پیشکش اور انسانیت کی بہتری کے راستوں کو ادب کا مقصد قرار دیتے ہیں۔انہوں نے لکھا:

وہ (ترقی پسند نقاد) یہ دکھانا چاہتا ہے کہ کتاب سماج کی کن اچھائیوں اور برائیوں کی آئینہ دار ہے۔ان میں زندگی کے کن حالات کا جائزہ لیا گیا ہے اور کتنی گہری نظر سے۔جب ترقی پسند نقاد کتاب کا تجزیہ اس طرح کرتا ہے تو وہ ان باتوں کو بھی کھول کر رکھ دیتا ہے جنہیں لوگ سننا گوارہ نہیں کرتے تو غصہ کا اظہار کیا جاتا ہے حالانکہ نقاد نے سوائے اس کے کچھ نہیں کیا کہ اس نے سماج کی ان بیماریوں کی تشخیص کر دی ہے جن کا شکار یا تو مصنف تھا یا پورا سماج''۔۔احتشام صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا انہی کے لحاظ سے ترقی پسند ناقدین ادب میں حقیقت نگاری کی تخلیق پر زیادہ زور دیتے ہیں اور سماجی زندگی کے ہر طبقہ کے مسائل کو ادب کے موضوع کی حیثیت سے شامل کرتے ہیں۔جس ادبی تخلیق میں زندگی کے مسائل کو موضوع نہیں بنایا گیا ہے وہ ترقی پسند نقادوں کے مطابق معیار پر پوری نہیں اترے گی۔۔۔۔وہ عام انسانی زندگی کے مسائل سے ادیب کی تخلیقات کو قریب رکھنا چاہتے ہیں اور اسی لئے انداز بیان اور ہیئت کے مقابلہ میں وہ مواد کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ شعر و ادب میں طبقاتی کشمکش مزدوروں اور سرمایہ داروں کے تصادم اور گرد و پیش کے حالات کی آئینہ داری کرنے کے ساتھ سماج کی بہت سی برائیوں کو سامنے لا کر انسانیت کی بہتری کے لئے راستے بنائے جا سکتے ہیں اور یہی ادبی تخلیق کا سب سے بڑا مقصد اور موضوع ہونا چاہئے۔۔۔۔۔۔ 3

مارکسی فلسفہ کی وضاحت کرتے ہوئے ظہیر احمد صدیقی نے بتایا کہ اس میں تمام انسانی اعمال بشمول وجدان، روحانی تجربہ اور تصور اقدار پر ماحول کے اثرات اور معاشی عوامل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

انہوں نے لکھا:

''مارکس کے فلسفہ کی رو سے انسانی زندگی کے تمام شعبے حتیٰ کہ مذہب اور اخلاق، رسم و رواج، کلچر اور آرٹ کلیتاً مادی اور معاشی عوامل کے تابع ہیں۔اس فلسفہ کے نزدیک افادیت (فرد کی ذاتی تسکین اور معاشرہ کی اجتماعی بہبود) سے ماورا کسی جمالیاتی قدر کا کوئی وجود نہیں۔مارکس کی نظر میں 'انسانی شعور انسان کے اپنے ماحول سے تعلق ہی کا نام ہے' اور جس طرح انسان کے تمام اعمال ماحول سے متاثر ہوتے ہیں اسی طرح اس کا وجدان روحانی تجربہ اور تصور اقدار بھی اسی مادی ماحول کی

پیداوار ہیں۔مارکسی فکر کے معذرت خواہ حامیوں (Appologists) کی تمام تاویلات کے باوجود ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ اس نظام فکر میں جمالیاتی تجربہ کی مستقل بالذات حیثیت کا جسے جمالیاتی افکار میں ہمیشہ مرکزیت حاصل رہی ہے کوئی مقام نہیں ہے۔اسی لئے مارکسیت پر راسخ عقیدہ رکھنے والوں کا یہ اصرار کہ ادب اور صحافت یا فن اور پروپگنڈہ میں بھی کوئی حد فاصل قائم کرنا ممکن نہیں اور اس نظام میں صرف اسی ادب اور فن کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے جو اس کے تصورات 'افکار اور اجتماعی مقاصد کی تفسیر و تبلیغ کر سکے۔ 4

خالد علوی نے مارکسی نظریہ پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ اس نظریہ میں انسانی زندگی میں مادیت کی اہمیت اور ادب میں سماجی استحصال کی مخالفت کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔

''مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ سیاسی، سماجی اور ذہنی زندگی کو عام طور پر مادی زندگی کے طریقے اور آداب مقرر کرتے ہیں۔ ہمارا تمام ادب اور فنون لطیفہ ہماری مادی زندگی کے اردگرد گھومتے ہیں۔مارکسی نظریہ ادب میں حقائق ہی اہم ہیں اور تخئیل کی گنجائش نہیں ہے۔مارکسی حقیقت نگاری میں سماجی رشتوں کی کشمکش میں ہمیشہ اپنے نقاط نظر کی عکاسی کرنا پڑتی ہے۔زندگی جیسی ہے بالکل ویسی تصویر کشی کر دینے سے گمراہ کن ثابت ہو سکتی ہے بلکہ ایسی معنی خیز ہو جو انقلاب کے لئے ممد و معاون ثابت ہو۔ اس حقیقت نگاری میں بورژوائی محبت اور عشق بیان کرنا بے معنی ہے بلکہ سماجی کشمکش کو نمایاں کرنا ضروری ہے۔ہندوستانی ترقی پسند اس ادبی نظریئے کے مبلغ تھے اور ادب کے افادی پہلو پر زور دیتے تھے۔ان کے نزدیک اچھے ادب کی پہچان یہ تھی کہ وہ سماجی استحصال کے خلاف تحریک دیتا ہو''۔ 5

خالد علوی نے یہ بھی لکھا ہے:

''مارکسی نظریات، ترقی پسندوں کے آدرش تھے۔۔۔۔۔جس سوشلزم کی تبلیغ ترقی پسند کرنا چاہتے تھے وہ مارکس کے خیالات سے ماخوذ تھا۔ 6

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے مارکسی نقطہ نظر پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ اس نظریہ میں ادیب کی عصری آگہی اور ادب میں تاریخ اور حالات کی اہمیت اور سماجی مفاد پر زور ملتا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

1۔ہر دور کا ادب اپنی زندگی کا تضاد بھی رکھتا ہے اور اس کا اظہار بھی کرتا ہے جو لوگ ادب کے مارکسی نظریہ کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ مارکسزم ادب کی جہت کو کم کر کے اسے صرف ایک رخ میں بڑھنے کی اجازت دیتا ہے اور اس میں انفرادی کوششوں کو پھلنے پھولنے کے مواقع نہیں ہوتے۔ایسے لوگ یا تو مارکسزم کو سمجھتے نہیں یا اسے سمجھنا نہیں چاہتے۔اس لئے اس حلقے سے اعتراض ہوتا ہے کہ جب ایک ہی سماجی، تہذیبی اور اقتصادی پس منظر میں ادب کی بارآوری ہوتی ہے تو تمام ادیب ایک ہی طرح کیوں نہیں سوچتے۔ایک طرح کی چیزیں کیوں نہیں لکھتے۔ان کا اسٹائل ایک ہی کیوں نہیں ہوتا اور چونکہ ایسا عملی طور پر نہیں ہوتا، اس لئے کسی ادب کی تفہیم میں سماجی اور تہذیبی ونشیب و فراز یا تاریخی تجزیے کی بات بیکار کا عمل ہے۔ایسے معترض ادب کی تخلیق اور انسانی ذہن کی پسند ناپسند اور اس کے طریق کار کی انفرادیت کو پس پشت ڈال کر یہ سمجھتے ہیں کہ اگر سب

حالات ایک جیسے ہیں تو ہر تخلیق مشین سے نکلتے ہوئے بٹن یا سوئی کی طرح برابر ہونی چاہئے اور چونکہ ایسا نہیں ہوتا اس لئے ادب کو سماجی، اقتصادی یا تاریخی حالات سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ ادب تو ادیب کی صرف انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہے''۔۔۔۔

2۔''۔۔۔۔۔مارکسی نقطہ نظر تاریخ اور حالات کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ کسی فرد واحد یا ادیب کا کوئی محاکمہ اس کے حالات سے اسے کاٹ کر نہیں کیا جاتا، وقت اور تاریخ ادیب کے حالات پر اثر انداز ہوتے ہیں تب جا کر تخلیق صورت پذیر ہوتی ہے۔ پھر ادیب خود بھی حالات کے تحت بدلتا جاتا ہے۔

3۔تخلیق کی سطح اگر ترسیل سے ہمکنار نہیں ہوئی تو ادب کی تخلیق ایک لایعنی عمل بن جاتی ہے۔ مارکسی ادیبوں نے اس نکتے کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے۔ سجاد ظہیر، کرشن چندر، منٹو، عصمت، بیدی، احمد ندیم قاسمی، فیض، سردار جعفری، محمد حسن اور قاضی عبدالستار سب کی تخلیقات یہی نتیجے برآمد کرتی ہیں۔ پھر مارکسی نقطہ نظر قدیم ادب کی تفہیم کے لئے بھی انہیں معیاروں پر اصرار کرتا ہے۔ مارکسی نقطہ نظر طبقاتی طرف داری کا بھی قائل ہے، اگر اس سے سماجی مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ وہ غیر مارکسی ادیبوں کی ادبی خوبیوں کو بھی سراہتا ہے، اگر ان سے زندگی کا کوئی گوشہ منور ہوتا نظر آتا ہے۔''

4۔''جو ادیب سڑک پر چلنے والوں کی آوازوں، اپنے دور کی روحوں کے اندرونی خلفشار اور عصری آگہی سے بے خبر ہے، وہ کبھی ادب کی عظمت کا ادراک نہیں کر سکتا۔ پھر اسے ادب کے منبر سے نیچے اترنا چاہئے کہ وہ اس عظیم منصب کا حقدار نہیں ہے۔ ادب کا مقصد صرف جذبات کی بازآفرینی نہیں ہے نہ اس کا منصب صرف حظ اور تزئین ہے۔ اگر ادب نے اپنا رشتہ اپنے گردوپیش سے توڑ لیا ہے تو یہ ایسا نامناسب، غیر حقیقی اور گمراہ کن ادب ہے جو انسانوں کو Organic Wholeness سمیت ان کی دانشورانہ طاقت کے ساتھ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ادب زندگی کی تہذیب ہے اسے صرف تحیر زا اور بے مقصد سمجھنا، کم نظری اور ادب کے صحیح منصب سے بے خبری کی دلیل ہے''۔ 7

شارب ردولوی نے مارکسی نظریہ تنقید کے آغاز، اس کی غایت اور مارکسی ناقدین کے بارے میں لکھا ہے:

''جب تخلیق کا موضوع خیال سے نکل کر حقیقت ہوا، جب ہیئت کے بجائے مواد کسی فن پارے کی اہمیت کی بنیاد قرار پایا جب صرف گل و بلبل، عارض و رخسار یا دہان و کمر کے بیان کے بجائے زندگی کے تجربات و مشاہدات کو پیش کیا جانے لگا جب زندگی کے خالص رومانوی تصور کے بجائے سماجی حقیقت نگاری ادب کا موضوع بنی اور بات تسلیم کر لی گئی کہ ادب زندگی اور سماج سے توانائی اور دلکشی حاصل کرتا ہے اور اسی حسن و دلکشی کو پیش کرتا ہے جو ہمارے ماحول، سماج اور زندگی کی دین ہے تو اس وقت تنقید کا پرانا انداز اور فنی پرکھ کا نظریہ بھی تبدیل ہوا۔ یہ نیا نظریہ تنقید وہی تھا جس نظریہ کے تحت نیا ادب تخلیق ہو رہا تھا اور جس کی بنیاد تاریخ، روح عصر اور جدلیاتی مادیت پر تھی''۔۔۔ 8

مارکسی ناقدین کے بارے میں انہوں نے لکھا:

''اردو ادب میں جن ناقدین نے مارکسی نظریات پر اپنی تنقید کی بنیاد رکھی ان میں اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر عبدالعلیم، سجاد ظہیر، احتشام حسین، اختر انصاری، سردار جعفری، ممتاز حسین اور محمد حسن، سید محمد عقیل کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ ناقدین کا ایک اور بڑا حلقہ مارکسی نظریات سے متاثر رہا ہے جس میں ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر آل احمد سرور، اختر اورینوی اور

سید محمد عبداللہ وغیرہ قابل ذکر ہیں"۔

"ترقی پسند ناقدین میں دو طرح کے نقاد ملتے ہیں۔ایک وہ جنہوں نے سختی سے جدلیاتی مادیت اور مارکسی فلسفہ پر عمل کیا دوسرے وہ جو مارکسی نظریات کو وسیع پس منظر میں رکھتے ہوئے ادبی تخلیقات کو اعتدال وتوازن کے ساتھ جانچنے و پرکھنے کے قائل ہیں۔درحقیقت انتہاپسند نقطہ نظر کے ردعمل ہی نے اعتدال پسند تنقید کو جنم دیا جسے سائنٹفک نظریہ تنقید سے تعبیر کیا گیا ہے۔9

بقول شارب ردولوی:

تنقید کے اسالیب میں ادب کا سماجی نظریہ بھی تھا۔ابتداء میں خالص طبقاتی کشمکش، ذرائع پیداوار اور اقتصادی و مادی میکانیت کی شکل میں ابھرا جو ادب کی اقدار معین کرنے کے سلسلہ میں اتنا ہی ناقص تھا جتنا دوسرے متذکرہ اسالیب لیکن کچھ آزمائشوں سے گذر کر اس نے ایک سائنٹفک نظریہ تنقید کو جنم دیا"۔ 10

مزید وضاحت کے ساتھ شارب صاحب لکھتے ہیں:

"مارکسی، سماجی یا عمرانی تنقید اپنی ابتداء میں نظریاتی طور پر خام ہونے کی وجہ سے انتہاپسندی کا شکار رہی۔ادیبوں نے طبقاتی کشمکش کو پروپگنڈہ جنس کو حقیقت نگاری اور مزدور کو فیشن کے طور پر استعمال کیا اور نقادوں نے انہیں بندھے ٹکے اصولوں پر ان کی عظمت کا حکم دیا لیکن رفتہ رفتہ اس میں اعتدال آتا گیا اور وہ سائنٹفک تنقید کی طرف بڑھتی گئی۔ادب پارے کا اندرونی تجزیہ تفہیم اور بازآفرینی، جمالیاتی قدروں کا احساس، ماضی کی صحت مند روایات کا احترام زندگی اور عہد کی تصویر کشی، مادی، تاریخی اور جمالیاتی حقیقتوں اور فنی قدروں کے شعور نے اسے سائنٹفک تنقید کا درجہ دے دیا"۔ 11

بقول شارب ردولوی:

"سائنٹفک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جمالیاتی اور نفسیاتی پہلو بھی نظر انداز نہ ہوں۔سائنٹفک تنقید ادبی تخلیقات اور فنکار سے متعلق تمام مباحث کو اپنے اندر سمو لیتی ہے اور جمالیاتی، نفسیاتی، سماجی اور مروجہ خیالات کی روشنی میں فنی تخلیق کی اہمیت کا پتہ لگاتی ہے۔ 12

فدا المصطفیٰ فدوی کے مطابق مارکسی تنقید کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

1۔"انسان فطری طور پر اقتصادی ضروریات کا پابند ہے اور اس کی ضروریات میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔لہٰذا وہی ادب اچھا ادب ہے جو حیات انسانی کے فروغ میں ممد و معاون ثابت ہو اور معاشی و اقتصادی مسائل کا حل پیش کرے"۔

2۔مارکسی تنقید فرد کے بجائے جماعت پر زور دیتی ہے اور مارکسی نقاد ادب میں معاشی و معاشرتی اور اقتصادی مسائل کا حل تلاش کرتا ہے"۔

3۔مارکسی ادب وتنقید کا انحصار مادیت پر ہونے کی وجہ سے اس میں مذہب، روحانیت اور ماوٗرائیت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔اس میں ہیئت اور اسلوب سے زیادہ مواد کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے اور ادب کے جمالیاتی عناصر سے بھی ایک حد تک چشم پوشی کی جاتی ہے۔اشتراکی تنقید ادب کو پرکھنے کے لئے داخلی اصولوں کو بڑی حد تک نظر انداز کرتے ہوئے خارجی اصولوں سے کام لیتی ہے"۔

4۔مارکس کی جدلیاتی مادیت کے فلسفے پر مبنی یہ مارکسی ادب اور تنقید انسانی ذہن کو ماوٗرائیت کے طلسم سے نجات دلا کر مادی حقائق تک محدود کر دیتے ہیں''۔ 13

شعروادب کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے تنقیدی اصول ونظریات کا استعمال عملی تنقید کہلاتا ہے۔

عبدالمغنی نے لکھا ہے:

''تنقید کی دو قسمیں ہیں۔ایک نظری تنقید اور دوسرے عملی تنقید۔نظری تنقید وہ ہے جس میں اصول تنقید سے بحث ہوتی ہے اور ایک ناقد کے تصور ادب اور نظریہ تنقید پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔پھر ادب وفن کے عام اصول وقواعد اور افکار وتصورات پر گفتگو کی جاتی ہے۔ادیب اور شاعر کے عمومی مسائل کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔عملی تنقید وہ ہے جس میں ادب اور تنقید کے اصول و تصورات اور نظریات وافکار کا اطلاق ادبی تخلیقات کے نمونوں پر کیا جاتا ہے اور تجزیہ وتبصرہ کر کے بتایا جاتا ہے کہ یہ نمونے کن اوصاف اور اقدار ومعیار کے حامل ہیں اور تاریخ ادب میں ان کی کیا قیمت وحیثیت متعین ہوتی ہے۔

---آئی اے چرڈس نے اپنی تنقیدی تصنیف پریکٹیکل کریٹی سزم یعنی عملی تنقید میں اس عملی تنقید کے باضابطہ نمونے پیش کئے ہیں جو منفرد ادب پاروں کے تجزیہ پر مبنی ہیں''۔ 14

ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس نے اپنے ایک مضمون ''عملی تنقید: ایک مطالعہ'' میں عملی تنقید کے ان رہنمایانہ اصولوں سے بحث کی ہے جو مغرب میں رائج ہیں۔

اس کا خلاصہ اس طرح ہے:

1۔''عملی تنقید میں فن پارے کے تھیم (Theme) پر غور کیا جاتا ہے۔عملی تنقید میں اس مرکزی خیال تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔ادیب زندگی کی صداقتوں کا تجربہ کر کے اس کی قدریں تخلیق کرتا ہے۔نقاد کا کام ان قدروں کو سمجھنا اور ترتیب دینا ہوتا ہے''۔

2۔زندگی حادثات وتغیرات سے عبارت ہے جو زماں ومکاں کے پردے پر رونما ہوتے ہیں۔یہ سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وقوعہ (Juncture) کس وقت ہوا؟ کس جگہ ہوا؟ کب ہوا اور اس کے محرکات کیا تھے یعنی اس میں واقعات کا زمانی و مکانی پس منظر اور پیش منظر دونوں دیکھے جاتے ہیں۔

3۔زیر نظر فن پارے میں کس پہلو، کس حقیقت یا زندگی کے کس رخ کو اجاگر کیا گیا ہے۔کس چیز پر بل دیا گیا ہے، کس امر کی صراحت کی گئی ہے۔مثلاً اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کی عملی تنقید کے دوران ہم یہ دیکھتے ہیں۔اس نظم میں شاعر نے مسجد قرطبہ پر Stress نہیں دیا ہے بلکہ اس کا Stress فن اور عشق پر ہے جس کا ایک مظہر مسجد قرطبہ ہے۔اب تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ آہنگ صرف شعر میں ہوتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ آہنگ کا وصف نثر میں بھی ہوتا ہے۔تخلیق کار الفاظ کی نشست کے ذریعہ آہنگ پیدا کرتا ہے۔اس نشست اور الفاظ کو قواعد کے اعتبار سے بھی درست ہونا چاہئے۔شاعر جس طرح کا تاثر پیدا کرنا چاہتا ہے اس تاثر کی مناسبت سے الفاظ کا استعمال کرنا ضروری ہے۔آہنگ، اوزان، بحور، قوافی، تکرار قوافی، انفی آواز، مصوتوں اور مصمتوں کے استعمال سے پیدا کیا جاتا ہے۔منظر، موضوع، کردار اور جذبات وغیرہ سے آہنگ کا مطابقت رکھنا ضروری

ہے"۔

4۔"قواعد لفظ کے صرفی اور نحوی پہلوؤں سے بحث کرتی ہے۔لغت الفاظ کے معنی کا تعین کرتی ہے لیکن لفظ میں کتنی وسعت، پھیلاؤ، گہرائی، گیرائی، تاثیر ہے اور الفاظ کا باہمی ربط کیا ہے یہ ہمیں Lexics سے پتہ چلتا ہے"۔

5۔"یہ دیکھا جاتا ہے کہ ادب پارے میں جو لفظ یا الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان سے کس قسم کا لہجہ Tone ترتیب پاتا ہے۔لہجہ کئی قسم کا ہوتا ہے جیسے استفہامی/استعجابی/طنزیہ/فریادی/اشاراتی/رمزیہ/بیانیہ اور ڈرامائی وغیرہ۔عملی تنقید میں ہم کسی فن پارے میں فن کار کے لہجہ کا بھی تجزیہ کرتے ہیں"۔

6۔تخلیق کے پیچھے خالق کا کوئی نہ کوئی قصد یا Intention ضرور ہوتا ہے۔اذیت رسانی یا جذبات کو مشتعل کرنا زیادہ اچھا قصد نہیں ہے البتہ جذبات کی تطہیر یا جذبات کا تزکیہ کرنا (Catharsis) اعلی درجہ کا قصد ہے"۔

7۔"ڈکشن Diction میں شاعر و ادیب کی لفظیات سے بحث کی جاتی ہے۔لفظوں کی انتخابیت Diction کہلاتی ہے۔اس پر تجسس اور Feeling کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ڈکشن کے ذریعہ ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ جس شاعر یا ادیب کا ڈکشن ہے اس کی حس کیسی ہے؟ قوت حاسہ کتنی تیز ہے؟ لطیف ہے یا کثیف ہے؟ محسوسات کس انداز کے ہیں؟ Perverted حس کی انتخابیت Perverted ہوتی ہے جس سے اس کی ذہنی کجروی کا پتہ چل سکتا ہے۔ڈکشن میں الفاظ کی انتخابیت کے علاوہ شاعر/ادیب کی لفظیات میں پھیلاؤ Extention، عمق Depth، تناؤ Tention پیدا کرنے کے طریقوں اور لفظ کی حالتوں سے بحث کی جاتی ہے۔ہر لفظ یا تو سکونی حالت Synchronic ہوگا یا متحرک Diachronic۔خود اپنی جگہ معنی دیتا ہے یا معنی کے لئے دوسرے لفظ کا محتاج ہے۔ڈکشن میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جو لفظ استعمال ہو رہا ہے وہ تہذیبی اقدار سے ہم آہنگ ہے یا نہیں۔پھر اس کے ساتھ لفظوں کی گونج اور ارتعاش Echo اور لفظوں کی تجسیم Body Images اور تمثال اور پیکریت کا بھی تجزیہ اور تشریح کی جاتی ہے۔

8۔عملی تنقید میں نثری تخلیقات کے لئے جملہ Sentence کو اکائی/وحدت بنا کر ان کا بھی تجزیہ کرنا پڑتا ہے۔جملوں کے تجزیہ میں جملوں کی ترتیب/جملوں کا دروبست/جملوں کا نظم اور ان کی موزونیت کو پرکھا جاتا ہے۔اس کے علاوہ جملوں میں خیالات کی ترتیب و تشکیل اور ان کی تنظیم پر بھی نظر کی جاتی ہے"۔

9۔"عملی تنقید کے مغربی اصولوں میں ایک اصول نہیں ملتا وہ ہے صنفی خصوصیات کا مطالعہ جو کہ اردو ادب پاروں کی عملی تنقید میں ناگزیر ہے یعنی اگر ہم غزل کی عملی تنقید کر رہے ہوں تو صنف غزل کی روایات اور خصوصیات بھی پیش نظر رکھیں گے۔اسی طرح مرثیہ یا نثر میں افسانہ یا ناول وغیرہ کی منفرد و مخصوص صنفی خصوصیات ہوتی ہیں۔عملی تنقید میں ان صنفی خصوصیات کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔صنفی خصوصیات کے تحت مواد اور ہیئت کی بحثوں کو سمیٹنا ہوتا ہے"۔ 15

مذکورہ بالا عملی تنقید کے رہنمایانہ اصولوں کی وضاحت کے بعد ڈاکٹر محمد نسیم الدین نے ایک بہت اہم بات کی اہمیت کو اجاگر کیا کہ فن پارے کو ہر پہلو اور ہر زاویہ نظر سے دیکھا جائے تا کہ اس کا کلی وجود اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ ہمارے سامنے آسکے۔وہ رقمطراز ہیں:

''جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ زندگی ایک کلی وجود ہے اس کو خانوں میں نہیں بانٹا جاسکتا تو پھر ہم یہ محسوس کرنے میں حق بجانب ہیں کہ تنقید کا کوئی دبستان کسی تخلیق یا فن پارے کی مکمل تنقید نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ادب زندگی کا آئنہ ہے تو زندگی کی طرح اس کو بھی خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی جس طرح زندگی صرف روحانیت یا مادیات نہیں ہے بلکہ ان دونوں کا حسین امتزاج ہے۔ زندگی صرف عقلیات سے، صرف جذبات، صرف معاشیات،، صرف جمالیات، صرف نفسیات نہیں ہے بلکہ ان سب کا مجموعہ ہے۔ بعینہ ادب ہو یا کوئی اور فن پارہ کسی ایک دبستان تنقید کے اصولوں سے اس کا مطالعہ اور تنقید ناقص ہوگی۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر پہلو اور ہر زاویہ نظر سے اس کو دیکھا جائے اور ہر سمت سے اس پر روشنی ڈالی جائے تا کہ اس کا وجود خانوں میں نہ بٹ جائے بلکہ اس کا کلی وجود اپنی تمام تر صداقتوں اور رعنائیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آسکے۔ 16

ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے آئی اے رچرڈز کے تنقیدی نظریہ کلی تنقید Total Criticism کی وضاحت کرتے ہوئے اسے فن پارے ہی کی تنقید نہیں بلکہ زندگی کی تنقید بتلایا۔ وہ رقمطراز ہیں:

''آئی اے رچرڈز کے عملی تنقید کے تصور سے تنقید کا ایک نیا نظریہ پیدا ہوتا ہے وہ ہے کلی تنقید Total Criticism کا تصور۔ یعنی کسی ادب پارے کی عملی تنقید میں دبستان انتقاد کے اصولوں کو پیش نظر رکھیں اس میں کلاسیکی روایات بھی ہوں، رومانی آزادی، فکر و انفرادیت بھی، جمالیاتی جذبہ بنشاطِ حسن بھی ہو اور تاثراتی اثر پذیری بھی۔ مارکسی طبقاتی کشمکش پر بھی نگاہ ہو تو تحلیل نفسی کے اصولوں کے تحت فن کار کی نفسیات کی گرہ کشائی بھی کی جائے۔ اس طرح جو تنقید وجود میں آئے گی وہ واقعتاً ادب کی تنقید نہیں بلکہ زندگی کی تنقید ثابت ہوگی''۔ 17

آئی اے رچرڈس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک اچھے نقاد میں تین خوبیاں ہونی چاہئیں۔ پہلی خوبی اس کیفیت ذہنی تک پہنچنا جو مصنف یا تصنیف کی ہے۔ دوسری خوبی ہے تجربات اور احساسات میں امتیاز کرنا تا کہ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے، جبکہ تیسری آخری خوبی ہے قدروں کا انباض ہونا۔ 18

سردار جعفری نے اپنے نقاد نہ ہونے کا اعتراف کیا:

''حقیقتاً میں نے نقاد کی فرائض انجام نہیں دیئے ہیں کیونکہ مجھے نقاد ہونے کا دعوی نہیں ہے۔ میں نے خود ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اس تحریک کے بارے میں جو کچھ محسوس کیا ہے، جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے اور جس سے میرا شروع سے قریبی تعلق رہا ہے اسے کاغذ پر منتقل کردیا ہے''۔ (سردار جعفری، ترقی پسند ادب)

''میں اپنے آپ کو نقادوں کی صف میں شمار نہیں کرتا اور میں نے پیشہ ور نقادوں کا سا رویہ بھی نہیں اختیار کیا ہے۔ میرے لئے کبیر، میر اور غالب کی شاعرانہ دنیا کی بازیافت خود میری شعر گوئی کے لئے ضروری ہے''۔

میں جس نظریہ جمال اور نظریہ تاریخ پر یقین رکھتا ہوں اور جو میرے اندر گذشتہ تیس سال میں رچ بس چکا ہے میں نے اسی نظریہ سے ان بزرگ شعرا کے کلام پر نظر ڈالی ہے۔ عظیم ادب کی جڑیں اس عہد کی زمین میں پیوست ہوتی ہیں لیکن پھول اور پھل عہد کی حدوں کو توڑ کر نکل جاتے ہیں''۔ 19

''نقاد کی جو تربیت ہوتی ہے اور خاص طور پر یوروپ کی تنقیدی کتابیں پڑھ پڑھ کر، وہ میری تربیت نہیں ہے۔ میں نے پرانے شعراء کا جائزہ لیا۔ اس میں غالب اور میر کے علاوہ کبیر بھی ہیں۔ رومی بھی ہیں، حافظ بھی ہیں ۔۔۔۔ میں ان کا جائزہ اس نظر سے لیتا ہوں کہ اپنی شاعری کے لئے معیار بنا سکوں، تلاش کر سکوں، اپنی شاعری کی تربیت کے لئے''۔

(افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر)

18 اپریل 1990 کو ممبئی میں راہی معصوم رضا کو انٹرویو دیتے ہوئے سردار جعفری نے کہا کہ انہوں نے بڑے شعراء کا جائزہ اس لئے لیا کہ وہ اپنی شاعری کے لئے معیار بنا سکیں۔

''میں ہمیشہ، بار بار یہ لکھتا رہا ہوں، کہتا رہا ہوں، پھر کہہ رہا ہوں کہ میں نقاد نہیں ہوں۔ اس لئے کہ نقاد کی جو تربیت ہوتی ہے اور خاص طور سے یوروپ کی تنقیدی کتابیں پڑھ پڑھ کر۔ وہ میری تربیت میں نہیں ہے۔ میں نے پرانے شعراء کا جائزہ لیا۔ اس میں غالب اور میر کے علاوہ کبیر بھی ہیں۔ میرا بائی بھی ہے۔ رومی بھی ہیں، حافظ شیرازی بھی ہیں۔ میں نے بار بار لکھا کہ میں ان کا جائزہ اس نظر سے لیتا ہوں کہ میں اپنی شاعری کے لئے معیار بنا سکوں۔ تلاش کر سکوں اپنی شاعری کی تربیت کے لئے''۔ 20

سردار جعفری نے اپنے تنقیدی مضمون ''کالو بھنگی: ایک کردار، ایک علامت'' کی شروعات ہی ایک ایسے اعتراف سے کی ہے اور پھر اپنے تنقیدی مطالعوں کی غرض و غائت بھی بیان کی ہے۔

ملاحظہ کیجئے:

''پہلے تمہید کے طور پر ایک حرف معذرت۔ میں اپنا شمار نقادوں میں نہیں کرتا۔

میں اس ڈسپلن اور اس ٹریننگ سے بے بہرہ ہوں۔ بعض مغربی نقادوں کو پڑھا ضرور ہے جن کے حوالہ اکثر ہمارے نقادوں کی تحریروں میں بھی عام ہیں۔ اگر میں نے کبھی کوئی ایسی چیز لکھی ہے جس پر تنقید کا شبہ ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ایک شاعر کی حیثیت سے اپنے شاعرانہ ورثہ کو خود تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔۔۔۔۔ میں نے آج تک کسی ناول نویس یا افسانہ نگار پر ایسے مضامین نہیں لکھے جیسے اپنے بزرگ شعراء پر لکھ چکا ہوں جن کا مقصد ان کے فن کے آئنہ میں اپنے فن کی صورت دیکھنے کوشش کی ہے۔ 21

محمد ایوب واقف نے سردار جعفری کی قابلیت کی ستائش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''علی سردار جعفری کے مطالعہ کی وسعت اور گیرائی و گہرائی کا اعتراف سبھی کرتے ہیں۔ انہوں نے صرف اردو شعر و ادب کا ہی عمیق مطالعہ نہیں کیا تھا بلکہ عالمی ادب پر بھی ان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ ادب کے علاوہ مذہبیات، سیاسیات، عمرانیات، سماجیات اور اقتصادیات سے متعلق امور میں بھی وہ درک رکھتے تھے۔ ان کے مطالعہ اور حافظہ کا زور (Pursuance) واقعتاً اپنے آپ میں بے نظیر تھا۔ اس کے باوجود اپنے بعض احباب میں بلاشبہ کوپی چندنا رنگ شامل تھے''۔ 22

تصانیف

1۔مخدوم محی الدین:

سردار جعفری نے 64 صفحات پر مشتمل کتاب ’مخدوم محی الدین‘‘ لکھی جسے 1948ء میں پہلی بار کتب پبلشرز ممبئی نے شائع کیا۔ پہلے حصہ میں مخدوم سے متعلق ’’مخدوم سرخ سویرے کا شاعر‘‘ کے عنوان سے ایک مضمون ہے اور دوسرے حصہ میں مخدوم کی چھ نظمیں اندھیرا، جنگ، آزادی، اسٹالن، انقلاب، ٹوٹے ہوئے تارے اور حویلی شامل ہیں۔اس کتاب کے بارے میں عمر رضا لکھتے ہیں:

’’34 صفحات پر مشتمل اس کتاب کے پہلے حصہ میں سردار جعفری نے مکالماتی اندازاختیار کیا ہے جس میں انہوں نے مخدوم کی شاعری، قومی و بین الاقوامی صورتحال نیز تحریک آزادی کی سمت ورفتار پر روشنی ڈالی ہے۔مخدوم کی رومانیت سے انقلابیت تک کے سفر اور حیدرآباد تحریک سے ان کی وابستگی کا بھی ذکر کیا ہے۔

اقبال، ٹیگور اور مخدوم کا موازنہ کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

’’اقبال اور ٹیگور کے مقابلہ میں مخدوم کی شاعرانہ حیثیت کچھ بھی نہیں ۔۔۔پھر بھی اقبال اور ٹیگور کی نظم اور گیت کا ہندوستان چھوٹا اور محدود ہے۔وہ دنیا کے نقشہ میں ایک الگ جغرافیائی وحدت ہے لیکن مخدوم کی ’’جنگ آزادی‘‘ کا ہندوستان وسیع اور بے کنار ہے۔اس کی سرحدیں کہیں ختم نہیں ہوتیں۔وہ ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔اس کی آزادی کے سپاہی صرف ہندوستانی نہیں بلکہ امریکی، فرنگی، چینی، روسی بھی ہیں اور اس کی آزادی کے سرخ سویرے کا گلنار پرچم مشرق ومغرب میں ایک ساتھ لہراتا ہے۔اقبال اور ٹیگور کی نظموں کی محرک ہندوستان کی قومی آزادی تھی، مخدوم کی نظم کی محرک ساری انسانیت کی بین الاقوامی جدوجہد ہے‘‘۔

عمر رضا نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

’مضمون سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ 1937ء میں اسپین کی خانہ جنگی میں رالف فوکس اور کرسٹوفر کاڈویل نے عوامی لڑائی میں لڑتے ہوئے فرانکو کی فاشزم کی قربان گاہ میں جس طرح اپنی جان دے دی تھی اس سے سردار جعفری کس قدر متاثر تھے اور کس طرح ان کے دل میں ظلم، جہالت، شہنشاہیت اور بربیت کے خلاف لڑ کر جان دینے کی امنگیں بار بار جوان ہو رہی تھیں۔۔۔

انہوں نے لکھا:

’’ہمارا پورا نیا ادب گروپ اسپین کی خانہ جنگی سے بہت متاثر تھا۔ہم نے اسی زمانہ میں اسپین کے شاعر لورکا کی کچھ نظمیں اور نوجوان انگریزی ادیب کاڈویل، ریلف فاکس اور جان کرافورڈ کے حالات پڑھے تھے اور ہمارے دل میں بھی یہ امنگ تھی کہ ان جمہوری ادیبوں کی طرح ظلم، جہالت، شہنشاہیت اور بربریت کے خلاف لڑ کر ہم بھی کہیں اپنی جان دے دیں‘‘۔ 24

2۔دراصل اس زمانہ میں سردار جعفری بیحد جذباتی تھے اور ظلم وستم کے خلاف بغاوت کر کے اسے نیست ونابود کرنے کی

مختلف تدابیر پیش کیا کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ کسی بھی ادب میں مایوسی اور بے چارگی کے اظہار کو برداشت نہیں کرتے تھے۔اس زمانہ میں کئی اچھے شاعر وادیب ان کے اس عتاب کا شکار ہوئے مثلاً اقبال،فیض،فراق اور منٹو وغیرہ۔اس زمانہ میں سردار جعفری نے ان شاعروں اور ادیبوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جن کے کلام میں انقلابیت،گھن گرج،ظلم سے مقابلہ کرنے کی طاقت اور اسے نیست ونابود کردینے کا عزم پایا جاتا تھا۔

چنانچہ مخدوم کو مذکورہ پس منظر ہی میں دیکھتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

''اس دنیا کے مظلوم محنت کشوں کے جھنڈے کے نیچے آکر دم لیا ہے جس کی چھاؤں میں وہ صرف اپنے لئے نہیں بلکہ سب کے لئے ایک نئی زندگی کی تعمیر کررہا ہے''۔ 25

3۔''۔۔۔لیکن اس کے ساتھ ہی سردار جعفری نے مخدوم کی جگہ جگہ نکتہ چینی بھی کی ہے اور ان کی شاعری پر بہت سے سوالات قائم کئے ہیں مثلاً انہوں نے لکھا ہے کہ مخدوم نے سامراجی جنگ پر کوئی نظم نہیں کہی اور کہی ہے تو اس میں اداسی اور افتادگی ہے۔اس میں انقلابی آگ نہیں ہے،محض خواہش ہے کہ سویرا ہوجائے ورنہ ابھی تو کہیں سویرے کے آثار نظر نہیں آتے۔درد ہے،دکھ ہے،تکلیف کا احساس ہے لیکن وہ اعتماد ویقین اور حوصلہ نہیں،وہ آن بان اور جوش وخروش نہیں جو انقلابی شاعری کی شان ہے۔۔۔''

4۔''۔۔۔مضمون میں جو بھی بحث کی گئی ہے اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سردار جعفری اس زمانہ میں کمیونسٹ پارٹی کے مبلغ تھے اور مارکس،انگلز،لینن،اسٹالن،اشتراکیت اور روس سے وہ گہری محبت وعقیدت رکھتے تھے۔ان تمام چیزوں نے مل کر سردار کے مزاج کو انقلابی اور باغیانہ قسم کا بنادیا تھا۔نہ صرف یہ کہ وہ انقلاب پسند تھے بلکہ ایسے ادب کی وکالت کرتے تھے جو ظلم وناانصافی کو ختم کردینے کا عزم وحوصلہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔یہی وجہ ہے کہ جب مخدوم کی نظموں میں انہیں ایسے عزائم اور حوصلہ کی کمی کا احساس ہوتا ہے تو مخدوم پر بھی وہ نکتہ چینی کرنے سے گریز نہیں کرتے''۔

5۔''۔۔۔کتاب کے دوسرے حصہ میں مخدوم کی تقریباً ان انقلابی نظموں کا انتخاب پیش کیا گیا جن میں آزادی کا جذبہ،ظلم وبے انصافی سے نفرت اور اس کو ختم کردینے کا عزم پایا جاتا ہے۔مثلاً ''اندھیرا'' میں سرمایہ دارانہ قوتوں کے سبب پیدا ہوئے ایسے سماج کا نقشہ کھینچا گیا ہے جہاں خندقیں ہیں،باڑ کے تاروں میں الجھے ہوئے ہاتھ،پاؤں،کٹی انسانوں کی لاشیں ہیں،جن پر گدھ منڈلا رہے ہیں،شب کے سناٹے میں بچوں اور ماؤں کے رونے کی صدائیں ہیں،غرض ہر طرف نوحہ ونالہ وفریاد ہے اور ماتم کی صدا گونج رہی ہے۔۔۔۔نظم ''جنگ آزادی'' میں آزادی کی جنگ کو دہقانوں،مزدوروں،محکوموں اور مجبوروں کی جنگ بتا کر انہیں جھنجھوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔نیز دنیا کے تمام مزدوروں کو متحد ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور ایسی دنیا پر سوالیہ نشان لگادیا گیا ہے جس میں مزدوروں کی حکومت نہ ہو''۔۔۔ 26

(عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 331 تا 336)

ترقی پسند ادب

سردار جعفری کی تنقید نگاری کے آغاز اور ان کی پہلی با قاعدہ تنقیدی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' (پہلا ایڈیشن 1951) کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر قمر رئیس رقمطراز ہیں:

1۔ ''سردار جعفری یوں تو زمانہ طالب علمی سے ہی ادبی مسائل پر سوچنے اور لکھنے لگے تھے لیکن ان کی تنقید کا باضابطہ آغاز 1950ء میں اس وقت ہوا جب ترقی پسند تحریک اپنے اولین سنہرے دور کی تکمیل کر چکی تھی اور خود سردار جعفری اس کے ایک نمائندہ اور ہر دلعزیز شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت بنا چکے تھے''۔۔۔۔

2۔ ''۔۔۔۔جب ان کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' شائع ہوئی تو اگر ایک طرف ترقی پسند حلقہ سے باہر اسے ترقی پسند تحریک اور نظریات کا ترجمان سمجھا گیا تو دوسری طرف خود ترقی پسندوں کے مخصوص حلقہ میں اسے متنازعہ دستاویز کا درجہ حاصل ہوا اور یہ فطری بھی تھا۔ اس لئے کہ اس وقت تک ترقی پسند ادبی نظریات کے خط و خال واضح نہیں ہوئے تھے۔ بہت سے تصورات سیال اور اختلافی تھے اور ان پر غور و خوض اور بحث کا سلسلہ جاری تھی لیکن تحریک کی شیرازہ بندی اور اشاعت کی خاطر یہ خطرہ تو کسی نہ کسی کو مول لینا ہی تھا۔ سردار جعفری چونکہ ابتداء ہی سے اس تحریک کے فعال رکن تھے اور اس کی دستاویزوں اور جرائد کی تسوید و ترتیب میں وہ اہم رول ادا کرتے تھے۔ اس لئے یہ قرعہ فال ان کے نام ہی پڑا اور اس میں شک نہیں کہ جہاں تک ترقی پسند ادب و تحریک کے بنیادی کلیدی تصورات کی تفہیم و تعبیر کا سوال تھا انہوں نے بڑی محنت اور لگن سے اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے''۔۔۔

3۔ اس تصنیف کے محرکات خود جعفری کے نزدیک کیا رہے ہیں؟

''میری کتاب کا موضوع صرف نظریاتی مباحث اور ترقی پسند تحریک کے محرکات اور رجحانات تک محدود ہے اس لئے بیشتر ادیبوں اور ان کی تخلیقات کا ذکر صرف حوالوں اور مثالوں کی شکل میں آیا ہے''۔

''اس وقت تک (ترقی پسند ادب کی اشاعت) سید احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری اور ممتاز حسین نے اپنے مضامین میں جس نئے تنقیدی شعور کے نقوش ابھارے تھے سردار جعفری نے اسی کو ایک واضح تر اور اصولی نظم و ضبط کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی''۔۔۔27

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے ''ترقی پسند ادب'' کے محرکات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سردار جعفری کی یہ کتاب ایک حلقہ میں متنازعہ فیہ رہی ہے۔ کہا گیا کہ سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک کا غیر جانبداری سے نہیں ایک طرفہ اور سفارتی نقطہ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے کسی جج کے نہیں وکیل کے فرائض انجام دیئے۔ یہ بات کسی حد تک درست سہی لیکن ایسا ضروری بھی تھا کہ یہ کتاب ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں لکھی گئی تھی اور اس کا مقصد تحریک کو عوام سے متعارف کرانا اور اس کی بنیادوں کو مستحکم کرنا تھا۔ ویسے اس پہلو سے بھی صرف نظر نہیں کرنا چاہئے کہ لکھنے والا کٹر ترقی پسند ہے''۔۔۔۔ 28

سردار جعفری کی کتاب ترقی پسند ادب کے بارے میں محمد اجمل خاں نے لکھا ہے:

1۔ ''یہ کتاب سردار جعفری کے تنقیدی نظر اور شعور کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے''۔

اس کتاب کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد اجمل خاں نے لکھا ہے:

2۔انہوں (سردار جعفری) نے یہ نثری کتاب اس وقت تحریر کی جب ترقی پسند تحریک پر مختلف سمتوں سے حملے شروع ہوئے تھے۔ ہر اچھے اور برے ادب کو ترقی پسند ادب سمجھ لیا گیا تھا۔ نیا ادب اور ترقی پسند ادب ہم معنی سمجھے جانے لگے تھے۔ اس پر فحش نگاری اور بے معنی پروپگنڈہ کا بھی الزام تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس سے اپنا رشتہ منقطع کرلیا تھا۔اس لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ عوام کو ترقی پسند تحریک کے بارے میں بتایا جائے۔ ترقی پسند تحریک پر اعتراضات اور مخالفت کے جوابات سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری، احمد علی، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر علیم، احتشام حسین، سبط حسن، فیض احمد فیض اور ممتاز حسین نے اپنے مضامین کے ذریعہ دیئے اور ترقی پسند ادب کے متعلق غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی۔عزیز احمد نے ''ترقی پسند ادب'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔اس کے علاوہ پنڈت کشن پرشاد کول کی کتاب ''نیا ادب'' بھی شائع ہوئی۔لیکن سردار جعفری جو کہ ان سب سے زیادہ فعال اور سنجیدہ لگن رکھنے والے ترقی پسند شاعر اور ادیب تھے اور تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر کے بھی ماہر تھے اور بحث ومباحثہ کے بھی عادی تھے اور اپنی بات کو دلائل پیش کر کے دوسروں کو منوانے کے بھی ماہر تھے، دوسرے لوگوں کے مضامین سے انہیں اطمینان نہیں ہوا اور خود ہی ''ترقی پسند ادب'' لکھنے کا فیصلہ کیا۔یہ نثری کتاب پڑھ کر ان کے تنقیدی نقطہ نظر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔انہوں نے ترقی پسند ادب کی ابتداء، ارتقاء، خامیاں، خوبیاں، اس کی ضرورت اور اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی۔ترقی پسند ادیبوں کا تنقیدی جائزہ لیا۔زیادہ تر سے کچھ معاملوں میں اختلاف بھی کیا جن میں جوش اور اقبال بھی شامل ہیں جس کے لئے ان پر سخت تنقید کی گئی۔بعد میں 'اقبال شناسی'' کتاب میں اپنی تنقید پر نظر ثانی کر کے اس کا ازالہ بھی کیا۔سردار جعفری نے اس کتاب کا خاکہ 1949ء میں سنٹرل جیل ناسک میں بنایا تھا۔بعد میں اسے ستمبر 1950ء میں قاضی عبدالغفار کے کہنے پر لکھنا شروع کیا اور ڈیڑھ برس میں اسے پورا کرلیا''۔۔۔

3۔ترقی پسند تحریک میں شمولیت کے لئے وہ ایک اصول وضع کرتے ہیں اور وہ ہے ادب میں عوامی زندگی کی ترجمانی کرنا''۔

4۔اس کتاب کے بعد انہوں نے دوسری جلد ترقی پسند شاعری، تیسری جلد ترقی پسند افسانہ اور چوتھی جلد ترقی پسند تنقید کے عنوان سے لکھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن بعد میں یہ ارادہ ختم کردیا۔29

ترقی پسند ادب کے حرف اول میں سردار جعفری نے ترقی پسند ادب کے بنیادی مقاصد اور اس تحریک کے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے۔انہوں نے انسانوں اور انسانیت سے بے پناہ خلوص ومحبت کی اہمیت اور ضرورت کو اجاگر کیا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''اپنے خوابوں کو حقیقت بنانے کے لئے موجودہ حقیقت کا مطالعہ ضروری ہے جسے ہم بدلنا چاہتے ہیں۔سماجی کشمکش اور اس کی جڑوں تک پہنچنا ضروری ہے اور ان عوام کے ہاتھ دینا ضروری ہے جو ہمارے خوابوں کو اپنے کھردرے ہاتھوں سے

تراش کر حقیقت کا حسین اور پرشکوہ مجسمہ تیار کریں گے۔اور یہ کام بظاہر جتنا آسان معلوم ہوتا ہے اتنا آسان نہیں ہے۔اس کے لئے اس سوز و گداز کی ضرورت ہے جو انسانوں سے بے پناہ محبت اور خلوص پیدا ہوتا ہے جو عوام کے دلوں کی دھڑکنوں میں کھو جانے کے بعد بھی حاصل ہوتا ہے۔اس کے لئے اپنے کتب خانوں، شیش محلوں سے باہر نکلنے اور شہرت اور عظمت کے بلند میناروں سے نیچے اتر کر انسانیت کے وسیع سمندر میں تیرنا ضروری ہے۔ 30

سردار جعفری نے مزدوروں کے مسائل پر لکھنے کے لئے اسلوب، موضوع، ہیئت کی اہمیت اجاگر کی اور مظلومی، مفلسی، ناداری کے اسباب کا پتہ لگانے پر زور دیا۔

''ہمیں مزدوں کے مسائل کے بارے میں لکھنا ہے لیکن اس طرح کہ ادب اور فن کی بلند سطح باقی رہے۔۔۔۔ہم ادیب ہیں اور ہمارا کام ادب کی تخلیق کرنا ہے۔اگر ادب میں فن ہی ہاتھ سے چلا گیا تو کیا باقی رہ جائے گا؟ محض برہنہ موضوع، نعرہ بازی اور پروپگنڈا۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادب غیر شعوری طور سے اس ہیئت پرستی کا شکار ہو جاتا ہے جس کے لئے ہم رجعت پرستوں پر لعن طعن کرتے رہتے ہیں''۔۔۔یہ کہنا کافی نہیں ہوگا کہ تم مظلوم ہو، ان کی مظلومی، مفلسی اور ناداری کے اسباب کا پتہ لگانا پڑے گا۔۔۔۔سماج کی پوری ساخت، اس کی حرکت اور جنبش کو سمجھنا ضروری ہے۔۔۔۔تب ہم وہ ادب پیدا کر سکیں گے جو مزدوروں کے لئے ہوگا جس کی زبان آسان اور عام فہم، انداز بیان سیدھا سادا اور پرجوش، ہیئت خوبصورت اور معنویت سے بھرپور ہوگی''۔ 31

علی رضا نے سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

1۔یہی وجہ ہے کہ سردار جعفری نے منٹو کو رجعت پسند اور حسن عسکری کو فاشسٹ قرار دیا ہے اور جوش، جگر مرادآبادی، مجروح سلطان پوری، نیاز حیدر اور کرشن چندر وغیرہ کی تخلیقات کو عوام سے قریب تر بتایا ہے۔۔۔علاوہ ازیں اس زمانہ میں ترقی پسندوں پر پروپگنڈہ کا جو الزام عائد کیا جا رہا تھا اس کا بھی انہوں نے دفاع کیا''۔۔۔۔جہاں انہوں نے موضوع کی اہمیت کو سراہا ہے وہیں ہیئت کی اہمیت کو بھی واضح کیا ہے۔۔۔۔ماضی کے ادب اور بیرونی ممالک کے ادب کے مطالعہ کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔مزید اس سے استفادہ کرنے پر زور دیا گیا ہے جس سے بقول سردار جعفری ''نظر میں گہرائی اور علم میں وسعت پیدا ہوتی ہے''۔بالخصوص ماضی کے ادب کو انہوں نے بہت بڑا خزانہ قرار دیا ہے''۔ 32

2۔تیسرے باب میں ترقی پسند تحریک کے تاریخی پس منظر کو پیش کیا گیا۔اس کے تحت 1857ء کے بعد کے ان ادبی حالات و رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے جو ترقی پسند تحریک کے لئے پیش خیمہ ثابت ہوئی تھیں۔۔۔۔ترقی پسند ادب میں اقبال سے متعلق سردار جعفری نے جو گفتگو کی ہے اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔''اقبال کی شاعری سرسید، حالی اور شبلی کی روایات کا امتزاج ہے لیکن علم و فن کی سطح زیادہ بلند ہے۔اقبال کے نزدیک وہ شاعری مہمل اور بے معنی ہے جو کوئی پیام لے کر نہ آئی ہو، اقبال کا پیام بڑا تھا لیکن اپنے عہد کے الجھاؤ سے آزاد نہ ہو سکا۔اس لئے اس شاعری میں زندگی بخش رجحانات زہریلے رجحانات کے ساتھ اس طرح پیوست ہو گئے ہیں جیسے دودھ میں پانی ملا دیا گیا ہو۔اقبال کی شاعری کی ابتداء حب وطن اور سامراج دشمنی کے جذبہ سے ہوئی ہے اور یہ جذبہ آخر وقت تک باقی رہتا ہے۔خودی کی بنیاد، عینیت کے فلسفے اور ہیگل کی

جدلیت (Dialectics) پر ہے جس کو اقبال نے اسلامی فلسفہ اور روایات سے تقویت پہنچائی۔ اقبال نے اس خودی کو مردِ قلندر اور شاہین کا پیکر محسوس کیا ہے اور ابھرتی ہوئی تحریک آزادی کی ساری خصوصیات اس کے اندر بھر دی ہیں لیکن انقلابی طبقہ سے علیحدگی کی وجہ سے جو سنہ 1920ء کے بعد سے تحریک آزادی کا سب سے بڑا اہم حصہ بن گیا تھا۔ یہ دونوں علامتیں ابھرتے ہوئے بورژوا کی خصوصیات سے پاک نہیں رہ سکیں۔ اقبال نے اپنے اس شاہین کو تیمور، ابدالی، نپولین اور مسولینی کی شکل میں دیکھا تھا اور اقبال کے نزدیک پوری انسانی تاریخ ایسے ہی خودی سے سرشار افراد کے اشاروں پر چلتی ہے اور فوق البشر کی تلاش میں ہے۔ یہ انفرادیت پرستی اور ہیرو پرستی حالص بورژوا تصور ہے جو اپنی آخری شکل میں فاشسٹ و ڈکٹیٹر کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہ اقبال کا مستقل تضاد ہے کہ وہ اپنی شاعری میں جس حسین و جمیل دنیا کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں ان کا فلسفہ اس دنیا کے تباہ کرنے والے افراد کی پیدائش میں مدد کرتا ہے۔ اس لئے اقبال کی شاعرانہ شخصیت کو ان فلسفیانہ شخصیت سے الگ کر کے کہنا پڑتا ہے کہ وہ شاعر بڑے ہیں اور فلسفی چھوٹے"۔ 33

سردار کی اقبال سے متعلق مذکورہ بالا رائے پر عمر رضا نے تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

3۔ "تیسرے باب کا زیادہ حصہ اگر چہ اقبال کے لئے وقف ہے اور اقبال کی شاعری پر بہت ہی تفصیل سے بحث کی گئی ہے لیکن اقبال کے متعلق کچھ ایسی باتیں بھی رقم کر دی گئی ہیں جس سے سردار جعفری کی ناپختہ تنقید کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں مختلف نقادوں نے اقبال کے حوالہ سے ان کی اس طرح کی بچکانہ اور مفتیانہ تنقید کی خوب مذمت کی تھی جس کا بعد میں سردار جعفری کو بخوبی احساس ہوا اور انہوں نے اقبال کا از سر نو مطالعہ اپنی ایک اہم کتاب "اقبال شناسی" میں پیش کیا۔۔۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مذکورہ تیکھی اور بچکانہ باتوں کے باوجود سردار جعفری نے اقبال کی شاعرانہ عظمت سے انکار نہیں کیا ہے بلکہ ان مباحث کے بعد ان کی شاعری کے ترقی پسند پہلوؤں کی بھرپور نشاندہی کی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

اقبال نے فن برائے فن کے رجعت پرست نظریہ کی بڑی شدت سے مذمت کی اور اسے افیون کی چسکی قرار دیا اور کہا کہ یہ ہم سے زندگی اور قوت چھین لینے کا ایک عیارانہ حیلہ ہے۔ اقبال نے آرٹ اور شاعری پر یہ فریضہ عائد کیا کہ وہ جد و جہد حیات میں ہمارا ساتھ دے اور جس وقت ہمارے قویٰ کمزور ہو رہے ہوں ہمارے اندر ولولہ اور امنگ پیدا کرے۔

ہیئت پرستی کے بھی سخت دشمن تھے۔ ان کے نزدیک زبان صرف معنی کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لئے اصل اہمیت موضوع کی ہے اور سب سے اچھی وہ ہیئت ہے جو موضوع کو موثر طریقہ سے ادا کر سکے۔ موضوع کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ وہ صحت مند ہو اور قوم اور معاشرہ کے لئے مفید ہو۔ اقبال نے سامراج اور سرمایہ داری کے خلاف جس نفرت کا اظہار کیا اور انسان کا جو عظیم الشان تصور دیا ہے وہ پہلے کے اردو ادب میں اور کہیں نہیں ملتا۔ 34

"یہی وجہ ہے کہ سردار جعفری نے اقبال کی شاعری کو عظیم اور اردو شاعری کو نئی سطح پر پہنچانے والا بتایا اور اخیر میں یہ لکھا کہ "اقبال نے۔۔۔ اردو شاعری کو نئی سطح پر پہنچا دیا اور آج یہ سب تصورات ترقی پسند شاعری کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہے ہیں"۔ 35

4۔ پانچویں باب کے آخر میں انہوں نے ترقی پسند مصنفوں کی قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

''یہ کامیابیاں آسانی سے حاصل نہیں ہوئی ہیں۔اس کے لئے ترقی پسند مصنفوں نے دکھ جھیل کر، افلاس کی مصیبتیں برداشت کر کے اور قربانیاں دے کر جدوجہد کی ہے۔کتنے ہی ادیبوں کی کتابیں اور تحریریں ضبط ہوئی ہیں۔کتنے ہی رسائل پر پابندیاں لگائی گئی ہیں۔کتنے ہی ادیبوں نے لاٹھیاں کھائی ہیں۔بندوقوں کی گولیوں کا مقابلہ کیا ہے اور جیل خانوں میں دن گذارے ہیں۔سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، رشید جہاں، سبط حسن، احمد ندیم قاسمی، مخدوم محی الدین، ممتاز حسین، غلام ربانی تاباں، خلیل الرحمٰن اعظمی، ہنس راج رہبر، نیاز حیدر، مجروح سلطان پوری، سلیمان اریب، سید مطلبی فرید آبادی، علی جواد زیدی، ظہیر بابر، حمید اختر، ظہیر کاشمیری، پرویز شاہدی، عبداللہ ملک اور بہت سے دوسرے ترقی پسند ادیب اور شاعر اپنے عقائد کی وجہ سے برسوں جیلوں میں پڑے رہے ہیں تب کہیں جا کر وہ ادب پیدا ہوا ہے جس میں زندگی کے دل کی دھڑکنیں، عوام کے جذبات اور تاریخ کا خون ہے''۔ 36

ترقی پسند ادب میں ترقی پسند تحریک کی پندرہ سالہ کارکردگی اور کتاب کی اشاعت 1951ء تک تخلیق کردہ ادب پر بحث کی گئی ہے۔سردار جعفری کی عوامی ادب کی ضرورت، ابہام سے گریز، عام فہم اسلوب کی ضرورت، حالی، شبلی کے تنقیدی کارناموں کی ستائش پر اظہار خیال کرتے ہوئے عمر رضا رقمطراز ہیں:

1۔ترقی پسند تحریک کے تحت لکھنے والے ادیبوں کا سردار جعفری نے میکانکی انداز میں جائزہ لیا ہے۔اس کے لئے انہوں نے ترقی پسند ادب کے بنیادی مقاصد ''انسانیت اور آزادی کی جدوجہد'' کو پیش نظر رکھا ہے۔بالخصوص عوامی ادب کی تخلیق پر زور دیا ہے اور ابہام کو زہر قرار دیا ہے۔اس بات پر سب سے زیادہ زور صرف کیا گیا ہے کہ محض مزدوروں کے مسائل کے متعلق لکھا جانے والا ادب ہی کافی نہیں بلکہ مزدوروں کے لئے لکھنا بھی ضروری ہے۔اس کے لئے مزدوروں اور عام انسانوں کی فہم کے مطابق الفاظ، تشبیہ و استعارہ اور علامتوں کا استعمال ترقی پسند ادب کی بنیادی شرط ہے۔یہی وجہ ہے کہ جس ادیب میں بھی سردار جعفری کو ابہام نظر آیا، اس پر سخت تنقید کی۔مثلاً منٹو، عصمت، حسن عسکری جیسے ادیب۔علاوہ ازیں ترقی پسندوں پر پروپگنڈہ کا جو الزام عائد کیا جارہا تھا اس کا بھی دفاع کیا۔۔۔۔''

2۔''۔۔۔سردار جعفری نے اپنی کتاب میں حالی، شبلی اور اقبال کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کرنے بعد انہیں ترقی پسند کہا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ انہوں نے ترقی پسند تحریک کے لئے خام مواد فراہم کیا۔بالخصوص اقبال کے تصورات کی خوب تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ''اقبال نے ان تصورات سے اردو شاعری کو نئی سطح پر پہنچا دیا اور آج یہ سب تصورات ترقی پسند شاعر کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہے ہیں۔ہم اس سرمایہ کی قدر کرتے ہیں اور اس کے لئے اقبال کا بے انتہا احترام ہمارے دل میں ہے۔اقبال کے بغیر ہم اپنی موجودہ شاعری کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔۔ 37

چنانچہ پوری کتاب میں پندرہ سال کے دوران لکھے گئے ادب اور ترقی پسند تحریک کی سمت و رفتار کا بڑے میکانکی انداز میں مطالعہ کیا گیا ہے اور ترقی پسند ادیبوں کو وہ ہدایتیں بھی جاری کی گئی ہیں جن کے تحت انہیں اپنی تخلیقات پیش کرنا چاہئے۔ایسے میں کہیں کہیں تنگ نظری کا بھی احساس ہوتا ہے۔دراصل ترقی پسند ادب میں سردار جعفری کا جس طرح کا تنقیدی رویہ نظر آتا ہے وہ سردار کے تخلیقی رویہ کا جواز فراہم کرتا ہے اور وہ رویہ تھا انجمن سے وفاداری بشرط استواری''۔ 38

سردار جعفری نے شعرالعجم جلد چہارم اور مقدمہ شعروشاعری کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''حالی اور شبلی کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلی بار ادب اور تنقید کی بنیاد مادی حالات پر رکھی۔انہوں نے بتایا کہ ادب مادی حالات کے مطابق اپنا چولا بدلتا ہے اور مواد اور ہیئت دونوں میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔شبلی نے تو تشبیہوں اور استعاروں کی تبدیلی کے بھی مادی اسباب دریافت کرنے کی کوشش کی (شعرالعجم جلد چہارم)۔اس اعتبار سے حالی کا ''مقدمہ شعروشاعری'' اور شبلی کی شعرالعجم بہت بڑے کارنامے ہیں اور ابھی تک اردو تنقید کی کوئی کتاب ان سے آگے بڑھنا تو درکنار ان کے قریب بھی نہیں آسکی۔ 39

سردار جعفری نے منٹو کے بارے میں لکھا ہے:

''منٹو کے ہیرو مسخ شدہ انسان ہیں اس لئے وہ نمائندہ حیثیت نہیں رکھتے کیونکہ وہ زندگی کے ارتقاء کی نمائندگی نہیں کرسکتے''۔ 40

ڈاکٹر صادق نے مذکورہ رائے پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

1۔''منٹو کے افسانوں کے بارے میں دونوں ترقی پسند ناقدین (عزیز احمد اور سردار جعفری) کی رائیں مبنی بر حقیقت نہیں ہیں بلکہ ان کے پس پشت ایک خاص قسم کا ذہنی تعصب کارفرما نظر آتا ہے۔منٹو کو پرکھنے کے لئے انہوں نے جو کسوٹی تیار کی ہے اس پر تو ''پوس کی رات'' اور ''کفن'' جیسے پریم چند کے شاہکار افسانے بھی کھرے نہیں اترتے کیونکہ ان کے کردار بھی مسخ شدہ انسان ہیں جو زندگی کے ارتقاء کی نمائندگی نہیں کرتے اور ان کے یہاں بھی انسانیت کا وہ راسخ عقیدہ جس پر بقول عزیز احمد ہر اچھے انقلابی فلسفے کی بنیاد ہے کہیں نظر نہیں آتا''۔

2۔منٹو کے افسانے حقیقت نگاری کی اس روایت کا ایک لاینفک جزو ہیں جو ترقی پسندی کی روایت کے نام سے موسوم ہے''۔

3۔''منٹو نے ''مجھے بھی کچھ کہنا ہے'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ اگر ویشیا کا ذکر فحش ہے تو اس کا وجود بھی فحش ہے۔اگر اس کا ذکر ممنوع ہے تو اس کا پیشہ بھی ممنوع ہونا چاہئے۔ویشیا کو مٹایئے اس کا ذکر خود بخود مٹ جائے گا''۔ 41

4۔''وہ (منٹو) اپنے گردوپیش کی باریک سے باریک چیزوں کا گہرائی سے مشاہدہ کرتے ہیں اور اپنے افسانوں میں تاثر پیدا کرنے کے لئے معمولی سے معمولی بات اور انتہائی غیر اہم واقعات پر بھی نظر رکھتے ہیں اور ان سے اپنے افسانوں میں وقت ضرورت کام لیتے ہیں۔ 42

شافع قدوائی نے سردار جعفری کی منٹو پر تنقید پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''معاصر ادب کی بارے میں سردار جعفری کے تنقیدی محاکمہ پر بسا اوقات مناظرہ کا گمان ہوتا ہے۔منٹو کی افسانہ نگاری سے متعلق اظہار خیال سردار جعفری کے یک رخی تنقیدی نقطہ نظر کی عبرت ناک مثال ہے۔سردار جعفری نے نہ صرف منٹو کو غلاظت نگار ٹھہرایا بلکہ ان کے افسانوں کو کرشن چندر کے مقابلہ میں بالکل ہیچ اور بے مایہ قرار دیا۔''منٹو اور کرشن کی کہانیوں کا بنیادی فرق یہی ہے کہ منٹو کے ہیرو مسخ شدہ انسان ہیں اس لئے وہ نمائندہ حیثیت نہیں رکھتے کیونکہ وہ زندگی کے ارتقاء کی

نمائندگی نہیں کرتے۔کرشن چندر کے ہیرو سماج کے ہوشمند اور باشعور معمار ہیں وہ ارتقاء کی ترجمانی کرتے ہیں اس لئے نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں"۔(ترقی پسند ادب صفحہ 16)

منٹو نے مزدوروں کے مسائل پر واشگاف صحافتی اظہار سے گریز کیا نیز اپنے کرداروں کے جنسی افعال واعمال کو وسیع تر انسانی سیاق وسباق میں پیش کیا۔اس ضمن میں سردار جعفری کی رائے ملاحظہ فرمائیں:''مزدور ایک ایسی قوت ہے جو بیسویں صدی کے ہندوستان میں ابھری ہے۔یہ قوت زندگی کے بنیادی حقوق (معاشی اور سیاسی مطالبات) کے ساتھ ادب وتہذیب میں بھی اپنے حقوق کا مطالبہ کر رہی ہے اور سماج اور تاریخ میں اس مطالبہ کو ٹھکرانے کی قوت نہیں ہے اور جو ادیب اس مطالبہ کو ٹھکرانے کی کوشش کرے اس کا وہی حشر ہوگا جو منٹو کا ہو رہا ہے''(ترقی پسند ادب صفحہ 65)۔سردار جعفری کی متذکرہ پیش قیاسی کو ان کی پیشتر پیش گوئیوں کی طرح وقت نے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔اب منٹو کے افسانوں اور اس کے فنی شعور کی عام طور پر پذیرائی ہو رہی ہے اور کرشن چندر کے نیم رومانی اسلوب پر فراموش کاری کی گہری دھند مستولی ہے"۔ 43

ن۔م۔راشد،میراجی اور اختر الایمان پر سردار جعفری کی تنقید پر شافع قدوائی نے اظہار خیال کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

''ن م راشد،میراجی اور اختر الایمان کی شاعری کے بارے میں یہ رائے کہ ان کی شاعری قنوطیت اور کلیت کی مظہر ہے، خامی یک رخی ہے۔ویسے کلیت بھی سماج سے برگشتگی کے اظہار کی ایک شکل ہے جو اکثر صورتوں میں واشگاف اظہار سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے"۔ 44

حسرت موہانی نے آزادی کی جدوجہد میں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ان کی شاعری میں ان کے سیاسی عقائد اور جیل کی تکالیف کا عکس نمایاں نہیں ہے۔

علی سردار جعفری نے حسرت موہانی کی شاعری پر تنقید کی۔

اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں انہوں نے لکھا:

''ان (حسرت) کی شاعری پر ان کے سیاسی معتقدات کا اثر بہت کم پڑا۔انہوں نے اپنی شاعری کو غزل تک اور غزل کو زیادہ تر عشقیہ مضامین تک محدود رکھا۔شاذ ونادر ہی انہوں نے ایسے اشعار کہے ہیں جن میں سماجی زندگی یا سیاسی تصورات کی جھلک ہو اور یہ اشعار بھی ان کے فنی معیار کے مطابق بلند پایہ نہیں ہیں۔

ان میں سب سے اچھی غزل وہ ہے جس کا مطلع ہے ؎

رسم جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے
حب وطن محو خواب دیکھے کب تک رہے

45

پروفیسر کوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''مزے کی بات ہے کہ سردار جعفری نے حسرت سے زیادہ اہمیت جگر کو دی جن کی شاعری کو اگرچہ انہوں نے سطحی کہا لیکن

جہاں انہوں نے حسرت کا ایک شعر نقل کیا وہاں غزل میں سیاسی عنصر کے ضمن میں جگر کے آٹھ اشعار پیش کیے۔ 46

ہماری تنقید نے حسرت کی سیاسی شاعری کی قدر و قیمت کے تعین میں بے توجہی سے کام لیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حسرت نے نہ صرف عاشقانہ شاعری میں تہذیب عاشقی کو زندہ کیا بلکہ باغیانہ شاعری کو بھی تہذیب عاشقی کے آداب سے روشناس کرایا اور غزل کی فضا میں بھرپور طور پر غیر ملکی سامراج کے خلاف آواز اٹھائی۔ البتہ اس میدان میں ان کا کوئی حریف ہے تو وہ بھی ایسا جس کی غزلیہ شاعری کے سیاسی احساس کو اب تک اسی طرح نظر انداز کیا گیا ہے جس طرح حسرت کو اور وہ ہیں مولانا محمد علی جوہر۔۔۔ان (جوہر) کی غزلوں میں اکثر بیشتر جذبہ حریت اور سیاسی احساس جاری و ساری ہے۔ مولانا اگرچہ بڑے رہنما تھے لیکن حسرت ان سے بڑے شاعر تھے۔ مولانا کا بیشتر کلام بھی زمانہ قید فرنگ کا ہے۔۔۔گمان غالب ہے کہ حسرت کے باغیانہ کلام کی چھوٹ مولانا پر بھی پڑی ہو اور تغزل کے پیرائے میں حب وطن اور تحریک آزادی کی حمایت کا اظہار مولانا کے یہاں حسرت کے اثر سے آیا ہو۔" 47

کلیم الدین احمد نے اپنے ایک مضمون "ترقی پسند ادب پر دو کتابیں" میں علی سردار جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" میں خامیوں کی نشاندہی کی ہے جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

1۔ "علی سردار جعفری نقاد نہیں ہیں۔ وہ سائنٹفک اور علمی ہونا چاہتے ہیں لیکن جو وہ لکھتے ہیں وہ تنقید نہیں، ایک شاعر کے تاثرات ہیں اس لئے ان کی تنقید افراط و تفریط کا شکار ہو گئی ہے"۔۔۔۔

2۔ "جو چیز مفید نہیں وہ حسین نہیں ہو سکتی"۔ یہ بھی عام غلط فہمی ہے۔۔۔۔

کمہار مٹی کے برتن بناتا ہے، یہ برتن مفید ہے۔ پھر وہ اس برتن پر کچھ لکیریں بناتا ہے، کچھ نقش و نگار بھی بناتا ہے۔ یہ لکیریں یہ نقش و نگار اس برتن کی افادیت میں اضافہ نہیں کرتے لیکن وہ کمہار ایک اندرونی جذبہ سے مجبور ہو کر ایسا کرتا ہے۔ اس کے جمالیاتی احساس کی تسکین ہوتی ہے۔ دیکھنے والے کے جمالیاتی احساس کی بھی تسکین ہوتی ہے۔ یہ لکیریں، یہ نقش و نگار مفید نہیں حسین ضرور ہیں"۔

3۔ "وہ شاعر ہیں، نقاد نہیں" وہ کبھی کبھار اپنے تاثرات کو زور و شور سے بیان کرتے ہیں اور اس بیان میں خطابت کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے تاثرات کو مربوط و مسلسل کر کے کوئی نظام تنقید مرتب نہیں کرتے۔ ترقی پسند تنقید نے تنقید کے فن کو سائنس بنا دیا ہو لیکن "ترقی پسند ادب" میں تنقید نہ تو فن بن پائی اور نہ سائنس۔ اس کتاب میں کام کی باتیں مفید باتیں نہیں ملتی ہیں"۔ 48

سردار جعفری کا خیال ہے ترقی پسند نظریہ شعر اس تصور پر قائم ہے کہ جو چیز مفید نہیں وہ حسین بھی نہیں ہو سکتی۔

سردار جعفری اس جملے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میری مراد حسین موضوع سے وہ موضوع ہے جس کے ذریعہ انسانوں کی زندگی کو خوبصورت بنایا جا سکے۔ جس کا کوئی سماجی مقصد ہو۔ اسے میں موضوع کی معنویت کہوں گا۔ معنویت حسین نہیں ہوگی تو موضوع حسین نہیں ہوگا اور موضوع حسین نہیں ہوگا تو ادب حسین نہیں ہو سکتا۔ 49

1948-49 میں ترقی پسند تحریک انتہاپسندی کا شکار ہوگئی ۔یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ کون ترقی پسند مصنف ہے اور کون نہیں ۔

سردار جعفری نے اپنی کتاب ترقی پسند ادب میں لکھا ہے:

''سنہ 49-1948ء کی تنگ نظری اور انتہاپسندی بھی کچھ اسی نوعیت کی تھی جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں کہ تحریک کے ابتدائی زمانہ میں جب ایک طرح کا رومانی ابال تھا اس میں مختلف قسم کے رجحانات اور نظریات شامل ہو گئے ہیں جن میں بعض قطعاً رجعت پرست اور غیر صحت مند تھے لیکن دس بارہ برس کے دوران سماجی حالات کی پیچیدگی، عوامی تحریکوں کی وسعت اور انقلابی ابال کے ساتھ ساتھ رومانیت کی جگہ حقیقت نگاری آنے لگی تھی اور اس کا تقاضہ یہ تھا کہ تحریک میں نظریاتی صفائی پیدا ہو اور غیر ترقی پسند رجحانات اس سے خارج کئے جائیں''۔ 50

بیگ احساس نے لکھا:

''چنانچہ سردار جعفری نے ابراہیم جلیس، ممتاز شیریں، صمد شاہین، ن م راشد، حسن عسکری، ممتاز مفتی، یوسف ظفر، مختار صدا قی وغیرہ پر تنقید کی ۔سعادت حسن منٹو پر خصوصیت سے تنقید کی ۔کرشن چندر، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، رشید جہاں، سبط حسن، احمد ندیم قاسمی، مخدوم محی الدین، ممتاز حسین، ہنس راج رہبر، نیاز حیدر، مجروح سلطان پوری، علی جواد زیدی اور عصمت و عباس کو سراہا''۔ 51

سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' پر ڈاکٹر محمد حسن نے اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری کے سخت گیر رویہ کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ بعد میں اتنے شدت پسند نہیں رہے ۔

وہ لکھتے ہیں:

''انہوں (سردار جعفری) نے اسی زمانہ میں ''ترقی پسند ادب'' نام کی کتاب لکھی جو اس دور کی ترقی پسندی کو تقریباً سبھی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پیش کرتی ہے ۔یہ بات قابل ذکر ہے کہ احتشام حسین، ممتاز حسین اور ان دونوں نے بڑھ چڑھ کر خود سجاد ظہیر اور مجنوں گورکھپوری نے کبھی ترقی پسند تحریک پر کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی ۔سجاد ظہیر نے ''روشنائی'' لکھی بھی تو محض تحریک کے تنظیمی پہلو کو پیش نظر رکھا باقی باتیں ضمنی طور پر تھیں ۔ہاں عزیز احمد نے ترقی پسند ادب کے نظریہ اور تحریک پر پہلی مستقل کتاب لکھی تھی اور آج بھی اس تحریک پر کسی جائزہ کو منصفانہ اور غیر جانبدانہ کہا جا سکتا ہے تو عزیز احمد کی کتاب ہے ۔ سردار جعفری نے تمام ترقی پسند نقادوں کے برعکس ترقی پسندی کا خاصہ سخت گیر رویہ اپنایا ۔حد یہ ہے کہ پریم چند، راشد اور سعادت حسن منٹو بھی ان کی ضرب کلیمی سے نہ بچے ۔بعد کو سردار خود بھی شاید اتنے شدت پسند نہیں رہے تھے جو اقبال سے ان کی غیر معمولی عقیدت سے ظاہر ہوتا ہے''۔52

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے علی سردار جعفری کی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' پر اعتراضات کئے ۔ان اعتراضات پر بہت سے نقادوں نے تبصرے بھی کئے ۔

چند مبصرین کی آراء پیش خدمت ہیں ۔ملاحظہ کیجئے:

ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے تبصرے میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے اعتراضات کو معاندانہ رویہ کا غماز اور عصبیت اور جارحیت کی

دلیل بتایا ہے۔

''اس کتاب (ترقی پسند ادب از سردار جعفری) پر سب سے شدید اعتراضات ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم نے کئے جو 1948ء تک خود بڑے جوشیلے ترقی پسند تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ سردار جعفری کے شعری اسلوب کے سب سے بڑے مقلد بھی تھے جس کا ثبوت ان کی طویل سیاسی نظم ''آئنہ خانہ'' ہے جو کتابی صورت میں شائع ہوئی تھی۔ 50-1949ء میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی قید سے رہا ہوئے تو بعض دوسرے نوجوانوں کی طرح وہ بھی ترقی پسند خیالات سے منحرف اور تائب ہو گئے۔ یہاں یہ حقیقت یاد رکھنے کی ہے کہ ڈاکٹر اعظمی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' میں سردار جعفری پر جو اعتراضات کئے ہیں ان میں بیشتر ان دو مضامین کے حوالے سے کئے گئے ہیں جو جعفری نے زمانہ طالب علمی میں یعنی 1936 تا 1939 کے دوران لکھے تھے اور جن میں اختر حسین رائے پوری کی طرح ایک انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا گیا تھا اس لئے ان اعتراضات کی نوعیت ایسی ہے جیسے آج ڈاکٹر اعظمی کی شاعری سے بحث کرتے ہوئے ان کی طالب علمی کے زمانہ کی سطحی اور جذباتی شاعری کی مثالیں دی جائیں۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ جہاں تک جعفری کی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' کا تعلق ہے ڈاکٹر اعظمی کے اعتراضات ایک سوچے سمجھے معاندانہ رویہ کے غماز ہیں۔ صرف یہی نہیں انہوں نے سردار جعفری کے بعض بیانات کو سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر اعظمی لکھتے ہیں:

''جعفری نے اپنی ذات کا جو طلسم تیار کیا ہے وہ اس خود پسندی اور خود فریبی کو اور بھی آگے لے جاتا ہے۔ چونکہ وہ عوام کے لئے عوام ہی کی زبان سے براہ راست شاعری کرتے ہیں اس لئے ان کو محض فیض ہی پر فوقیت حاصل نہیں ہے بلکہ ہم اپنے بزرگ اساتذہ سے زیادہ خوش قسمت ہیں کہ ہمارے سننے اور پڑھنے والوں کا حلقہ زیادہ ہے اور آج ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ آرٹ اور ادب زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچ سکتا ہے''۔ 53

''جعفری نے اس اقتباس میں ان نئے مادی حالات، تعلیم اور اشاعت اور نئے ذرائع ترسیل کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں ادبی تخلیقات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکتی ہیں لیکن ڈاکٹر اعظمی نے اسے جعفری کی نیت اور ذات پر حملہ کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ کچھ یہی نوعیت ان کے دوسرے اعتراضات کی ہے''۔۔۔ جعفری کے تنقیدی مسلک کے بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی کا یہ بیان بھی عصبیت اور جارحیت کی دلیل ہے کہ ''یہ تنقید ترقی پسندی اور شاعری دونوں کو اپنے معیار پر لانا چاہتی ہے تا کہ سب سے اونچے منصب پر جعفری کو فائز کر دیا جائے۔ اس لئے صحت مند سماجی اور نظریاتی رویوں پر اصرار صرف جعفری کی کمزوری نہیں تھی بلکہ یہ ادعائیت اس زمانہ کی عالمی ترقی پسند تنقید کا عام انداز تھا''۔ 54

سردار جعفری کی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' پر کلیم الدین احمد کے اعتراضات کو شافع قدوائی نے تعصب پر مبنی قرار دیا۔

وہ لکھتے ہیں:

''اس کتاب (ترقی پسند ادب) کو قبول عام حاصل ہونے کے باوجود معطون بھی کیا گیا۔ کلیم الدین احمد اور خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ نے اس کے مشمولات کو برملا ہدف ملامت بنایا۔ کلیم الدین احمد نے اپنی مخصوص انتہا پسندی اور جارحانہ تنقیدی نقطہ

نظر کے پیش نظر لکھا ''اس میں کوئی خاص نئی بات نہیں ہے۔ مارکسی رنگ کے خیالات ہیں جو کاڈول اور دو تین روسی لکھنے والوں سے مستعار لئے گئے ہیں اور انہی مستعار باتوں کے سہارے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ خیالات صاف نہیں، وہ ٹھیک سے ہضم نہیں ہوئے ہیں۔ اس لئے کتاب نہیں، بدہضمی کی لمبی ڈکار ہے''۔ (اردو تنقید پر ایک نظر صفحہ 366)

خلیل الرحمٰن اعظمی نے تو ترقی پسند ادب میں سردار جعفری کی شعری شخصیت کا پرتو دیکھا اور انہیں یہ پوری کتاب جعفری کی شاعری کا جواز فراہم کرنے کی کوشش کرتی نظر آئی۔ مذکورہ نقادوں کے محاکمہ کا اگر معروضی نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ صاف نظر آئے گا کہ کلیم الدین احمد کی رائے ان کے تعصب کی چغلی کھاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سردار جعفری نے روسی مفکرین کے حوالے سے مارکسی تنقید کے اصولوں کی منطقی تشریح کی ہے اور اس تعبیر و تشریح پر اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، عزیز احمد اور احتشام حسین کا پرتو نظر آتا ہے لیکن اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مارکسی اصولوں کی وضاحت میں یکسانیت کا پیدا ہونا لابدی ہے۔ ویسے بھی سردار جعفری نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔ حقیقتاً میں نے نقاد کے فرائض انجام نہیں دیئے کیوں کہ مجھے نقاد ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ 55

''ترقی پسند ادب'' میں پائے جانے والے تضادات کی نشاندہی کرتے ہوئے شافع قدوائی لکھتے ہیں:

1۔ ''سردار جعفری ادب کے عوامی کردار کے سب سے بڑے نقیب نہیں ہیں اور وہ ترسیل کو مقصد اولین قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فنی امور کی شعوری پاسداری اور فارسی تراکیب کا استعمال انہیں گراں محسوس ہوتا ہے۔ سردار جعفری کے مطابق ترقی پسند ادیبوں کے سامعین اور قارئین میں مزدوروں کی کافی بڑی تعداد ہے اور چونکہ وہ ادب کی باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتے ہیں اس لئے انہیں سیدھے سادے ادب میں مزہ آتا ہے۔۔۔ ادب کے عوامی کردار کے پیش نظر جب فراق گورکھپوری نے بالکل براہ راست انداز میں کچھ نظمیں اور امریکی بنجارہ نامہ کی قسم کی نظمیں لکھیں تو سردار جعفری نے لکھا ''آسان شاعری اور جنتا کے لئے شاعری کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شاعری کے سارے لوازمات اٹھا کر بالائے طاق رکھ دیئے جائیں''۔ اس نوع کے متعدد تضادات سردار جعفری کی تنقید میں نمایاں ہیں''۔

2۔ ''سردار جعفری نے اپنی کتاب تحریک شروع ہونے کے 15 سال بعد لکھی جب ان کے بقول تحریک سن بلوغ کو پہنچ چکی تھی لیکن کتاب کے صفحہ 268 پر یہ جملہ بھی درج ہے ''آج ترقی پسند ادب پر ایک جمود سا طاری ہے''۔ 56

سردار جعفری نے اپنی کتاب ترقی پسند ادب میں اقبال پر جو رائے پیش کی تھی اس پر سید فضل امام رضوی نے تبصرہ کیا۔

وہ لکھتے ہیں:

انہوں نے سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' سے حسب ذیل میں اقتباسات نوٹ کرنے سے پہلے یہ لکھا ہے کہ ''اقبال کی شاعری کے بارے میں بھی سردار جعفری کا انتقادی انداز بالکل مختلف ہے اور عدم توازن کی اعلیٰ مثال ہے۔

اقتباسات یہ ہیں:

1۔ اقبال کا پیام بڑا تھا لیکن اپنے عہد کے الجھاؤں سے آزاد نہ ہو سکا۔ اس لئے اس شاعری میں زندگی بخش رجحانات زہریلے رجحانات کے ساتھ اس طرح پیوست ہو گئے ہیں جیسے دودھ میں پانی ملا دیا گیا یا پانی میں رنگ گھول دیا گیا ہے۔۔۔۔

اقبال کی شاعری میں دونوں قسم کے رجحانات آپس میں گتھے ہوئے ہیں اور اندیشہ رہتا ہے کہ تجزیہ کرتے وقت کہیں ریشم کے ساتھ سوت کا بھی کوئی تار نہ کھنچ آئے۔ 57

2۔اقبال نے اپنے شاہین کو تیمور، ابدالی، نپولین اور مسولینی کی شکل میں دیکھا تھا اور ان کے نزدیک پوری انسانی تاریخ ایسے ہی خودی سے سرشار افراد کے اشاروں پر چلتی ہے اور فوق البشر کی تلاش میں ہے۔یہ انفرادیت پرستی خالص بورژوا تصور ہے جو اپنی آخری شکل میں فاشسٹ کا روپ دھار لیتی ہے'' 58

3۔پھر بپھرے ہوئے انداز میں اقبال کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے یہاں تک کہتے ہیں''۔بقول فضل امام''ظاہر ہے کہ یہ درویشی اور قلندری، شاہینی اور انفرادیت پرستی تجدید مذہب اور احیائیت اور تصوف ہمارے کام کی چیزیں نہیں ہیں کیونکہ ان سے آج عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ 59

سردار جعفری کے مذکورہ بالا اقتباسات کے بعد پروفیسر سید فضل امام رضوی نے سردار جعفری سے اختلاف کرتے ہوئے دلائل پیش کئے البتہ سردار جعفری کی بعد کی لکھی ہوئی کتاب (اقبال شناسی 1976 کو پہلی کتاب ترقی پسند ادب کا ایک حد تک کفارہ قرار دیا۔

''ظاہر ہے کہ اقبال کی شاعری کے متعلق ان کا یہ انداز نظر قطعی مناسب نہیں۔کلام اقبال کی تفہیم کے لئے قرآن وحدیث کا غائر مطالعہ ضروری ہے اور اس کے لئے قلب مومن لازمی ہے جو ایمان ویقین کی شمعوں سے قلب ونظر کو منور کر سکے۔ہر کس و ناکس اور خاص طور سے وجود خدا اور رسول کا منکر کبھی بھی کلام اقبال کی عظمتوں اور اس کی گہرائیوں کو نہیں سمجھ سکتا۔اقبال کا شاہین دراصل وہ مرد مومن ہے جو تسخیر قلوب میں یقین رکھتا ہے تسخیر ممالک میں نہیں۔۔وہ روحانی صداقتوں کا حامل ہے۔شاہین کا فلسفہ اقتدار پرستی کا نتیجہ نہیں بلکہ رفعت انسانی کا اشاریہ ہے۔یہ خود اعتمادی کا درس دیتا ہے۔مغربی تمدن پر ضرب کاری لگاتا ہے اور وجود خداوندی کا دلیل محکم ہے۔اقبال منکر خدا نہیں تھے اس لئے کچھ کٹر اور تنگ نظر انہیں فاشسٹ قرار دیتے ہیں۔یہ دراصل کلام اقبال کے مختلف عظیم جہات سے عدم معرفت کی دلیل ہے، جو دلیل کم نظری کہی جاسکتی ہے۔درحقیقت اقبال کے لاشعور میں شاہین کے صفات مرتسم ہیں جس کا اعلان اس کی روح ارتقائی طور پر کررہی اور جس پر شعریت کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔اقبال کا شاہین ہمہ تن سرگرم عمل اور سرگرم پرواز ہے۔آشیانے یا ساز وسامان کی حرص وآز سے بے نیاز ہے۔وہ قصر سلطانی یا سیاست کے مراکز سے وابستہ نہیں۔اس کی صفات اور اصول پرستی چٹانوں کی طرح اس کی رفیق ہیں۔ اقبال نے شاہین کے تصور کو مرد مومن، صاحب فقر، صاحب عشق، صاحب سیف، صاحب قلم، قوی بازو، جاں باز اور صاحب تسخیر کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ہاں 1976 میں ان کی ایک مختصر کتاب''اقبال شناسی''منظر عام پر آئی جو کل 111 صفحات پر مشتمل ہے جسے ان کی گذشتہ تحریروں کا ایک حد تک کفارہ کہا جاسکتا ہے جس میں وہ معترف ہیں''اقبال کو ان کے عہد نے پیدا کیا تھا لیکن وہ اپنے عہد سے بڑے تھے۔وہ مہاتما گاندھی، ٹیگور اور جواہر لال نہرو کے ہم عصر تھے۔ان چاروں کی بلند قامت پرچھائیاں مستقبل کی صدیوں پر پڑ رہی ہیں۔ 60

ضرورت اس بات کی تھی کہ پروفیسر سید فضل امام رضوی، اقبال شناسی کا تفصیلی مطالعہ پیش کرتے۔

عمر رضا نے لکھا ہے:

''قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں ایسا نہیں کہ سردار جعفری، اقبال کے معترف نہیں تھے، لیکن 1960 کے بعد اقبال کے تعلق سے ان کے یہاں جو نظریہ قائم ہوا، اس میں اور 1960ء سے قبل کے نظریہ میں جو کافی فرق پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''ترقی پسند ادب'' میں بھی سردار جعفری نے اقبال پر جو تنقید کی ہے وہ بعد کی تحریروں مثلاً ''اقبال شناسی'' کے بیان سے فرسودہ ہو جاتی ہے''۔ 61

''ترقی پسند ادب'' میں سردار جعفری نے اقبال پر جو کچھ لکھا تھا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

1۔ ''سردار جعفری نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں اقبال کی اہمیت اور اس کے اثر کو قبول کرنے کی تین اہم وجوہات ظاہر کی ہیں سب سے پہلی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ ''اقبال نے آرٹ اور شاعری پر فریضہ عائد کیا ہے کہ وہ جد وجہد حیات میں ہمارا ساتھ دے'' دوسری وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ ''اقبال نے سامراج اور سرمایہ دار کے خلاف جس نفرت کا اظہار کیا ہے، اس کی مثال اس سے پہلے کے اردو ادب میں نہیں ملتی''۔ سردار جعفری نے اقبال کو صحیح طور پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی لیکن فوراً ہی ان کا عقیدہ ان کو دوسرے راستے پر ڈال دیتا ہے وہ یہ ضرور مانتے ہیں کہ اس کا علاج اقبال نے ''انقلاب'' تجویز کیا ہے جو بالکل صحیح ہے مگر اس کے ساتھ اقبال نے انقلاب کے بعد جو راستہ دکھایا ہے وہ چونکہ مارکسی راستے سے علیحدہ ہے لہٰذا وہ ان کے نزدیک قدامت پرستی ہے اور سرمایہ داری کو ہی زندگی عطا کرنے والا ہے''۔

2۔ ''سردار جعفری نے اقبال کی شاعری کو ان کے فلسفہ فکر سے الگ کر کے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے کیونکہ سردار جعفری نے اپنے عقیدہ کے لحاظ سے اقبال کے پیام اور فکر میں ''زہر'' گھلا ہوا پا رہے تھے۔ یہاں سردار جعفری نے ایسی مثالیں دی ہیں جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کی پوری شاعری زہریلی تھی کو شعوری طور پر ان کا یہ مقصد نہیں۔ لیکن اپنی عقیدہ پرستی کو تنقید میں لازمی طور پر سامنے رکھنے کی وجہ سے وہ ایسے غلط نتیجہ پر پہنچے ہیں، اس لئے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اقبال کی شاعری اور فلسفہ میں ہم آہنگی نہیں اور ان کے پیام اور فلسفہ کی وجہ سے ان کی شاعری کو نقصان پہنچا ہے''۔

3۔ ''اقبال نے جہاں مسولینی، نپولین اور تیمور وغیرہ کی شخصیت کی بعض صفات کی تعریف کی ہے وہیں کسی بناء پر مارکس، لینن کو بھی خراج تحسین پیش کیا ہے۔ 62

اقبال پر مذکورہ بالا تبصرہ سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' پر مبنی ہے۔ اس کے بعد ''اقبال شناسی'' میں سردار جعفری نے اقبال سے متعلق اپنی رائے الگ دی ہے۔ پروفیسر یوسف سرمست نے بھی اسی کا اظہار کیا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''گو وہ (سردار جعفری) آج اس کشمکش سے نکل چکے ہیں۔ ''اقبال شناسی'' میں انہوں نے اپنے معتقدات کی روشنی میں اقبال کو پرکھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ یہ عمل غیر شعوری رہا ہے۔ وہ اپنے عقیدے کو اب بھی عزیز رکھتے ہیں لیکن اب وہ اسے اقبال کے عقیدے سے متصادم ہونے نہیں دیتے۔ بلکہ صرف ادبی قدروں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اقبال فہمی اور اقبال شناسی میں

اہم رول ادا کررہے ہیں۔ترقی پسند تحریک کے زور کے زمانہ میں ان کا رویہ اقبال کے ساتھ کچھ اور رہا ہے۔"(ایضاً صفحہ 35)

شافع قدوائی نے اقبال پر سردار جعفری کی رائے جو انہوں نے "ترقی پسند ادب" میں دی تھی، اس کا تقابل اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری اور عزیز احمد سے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان تین ناقدین کے مقابلے میں سردار جعفری نے پھر بھی اقبال کی شاعری کے پس منظر کی وضاحت میں دقت نظر کا ثبوت دیا ہے:

"ترقی پسند ادب کے پیش لفظ میں سردار جعفری نے کتاب کی غرض و غایت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ "چند سال پہلے عزیز احمد کی ترقی پسند ادب شائع ہوئی تھی مجھے ان کے نقطہ نگاہ کے بعض زاویہ ٹیڑھے معلوم ہوتے ہیں"۔مصنف نے عزیز احمد کی وضع کردہ بعض تنقیدی اصطلاحوں اور اقداری فیصلوں سے برملا اور مدلل اختلاف کیا۔اقبال کی شاعرانہ عظمت ترقی پسند نقادوں کی نگاہ میں متنازعہ فیہ رہی ہے۔اختر حسین رائے پوری اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ نے اقبال پر فاشسٹ ہونے کا الزام لگایا اور عزیز احمد نے اقبال کی شاعری کو اسلامی اشتراکیت کی رہین منت قرار دیا۔اقبال کی ماضی پرستی اور احیاء پرستی کو بھی ہدف ملامت بنایا گیا۔سردار جعفری بھی اقبال کی تعین قدر میں اس افراط و تفریط سے بچ نہیں سکے،لیکن انہوں نے کہیں کہیں اقبال کی شاعری کے پس منظر کی وضاحت میں دقت نظر کا ثبوت دیا ہے۔مثلاً اقبال کی ماضی پرستی کا ذکر کرتے ہوئے وہ عزیز احمد کی اصطلاح اسلامی اشتراکیت کو بے معنی قرار دیتے ہیں۔سردار جعفری کا خیال ہے کہ "اردو زبان نے اقبال سے بڑا شاعر پیدا نہیں کیا وہ ہمہ گیری اور وسعت بھی ابھی کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی جو اقبال کی شاعری میں پائی جاتی ہے"۔(ترقی پسند ادب صفحہ 102)۔سردار جعفری نے اقبال کی سامراج اور انگریز دشمنی کی داد دینے کے علاوہ حرکت اور تغیر کو ان کی شاعری کا شناس نامہ قرار دیا اور لکھا "یہ صرف موضوع کی حد تک نہیں بلکہ ہیئت میں بھی بلا کا جادو اور بیان میں بھی تیز رفتاری پیدا ہو جاتی ہے۔پرانی بحریں جنہیں فارسی اور اردو کے اساتذہ استعمال کر چکے ہیں اقبال کی شاعری میں نیا ترنم اور آہنگ اختیار کر لیتی ہیں جیسے کہ نفس نے ان کے اندر کوئی کیمیاوی تبدیلی پیدا کر دی ہو۔انہی سے حفیظ جالندھری کے گیت نما نظموں کے لئے راستے کھلتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالقیوم نے سردار جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" پر ایک مضمون قلمبند کیا ہے جس میں انہوں نے کتاب کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔

اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

1۔"اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے اشتراکیت کے فلسفہ کو ادبی روایات اور تجربات میں سمونے کی کوشش کی ہے۔جعفری صاحب اشتراکیت کے راستہ سے بنی نوع انسان کی تکالیف اور سماجی کشمکش کا علاج تلاش کرنے میں منہمک ہیں"۔

2۔"سرسید کا زمانہ بڑی الجھنوں کا زمانہ تھا۔ہر طرف انتشار،قدامت پرستی، جہالت اور تعصب عام تھا۔زندگی کے تقاضے کچھ اور تھے۔لوگ دوسری طرف جا رہے تھے۔اس افراتفری کے زمانہ میں علم و عمل میں یکسوئی پیدا کرنا صرف سرسید کا کام تھا۔اس مشکل کام میں انہیں مصلحتوں سے بھی کام لینا پڑا۔کبھی دب کر صلح کی یہاں تک کہ انگریزوں کی طرف دوستی کا ہاتھ

بڑھانا پڑا۔سردار جعفری نے سرسید کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ان پر مغرب پرستی کا الزام لگایا ہے۔یہ الزام سراسر غلط ہے۔۔۔۔سرسید مغرب پرست نہیں تھے بلکہ مجبوراً مغرب دوست ضرور بن گئے تھے''۔

3۔''اقبال پر یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ اقبال کے شاہین کا تصور دنیا کے غارت گروں (مسولینی) کو مدد دیتا ہے حالانکہ یہ شاہین کا کردار اقبال کا ایک مثالی کردار ہے جو مضبوط اور طاقتور ہونے کے باوجود ظالم نہیں۔انہوں نے شاہین کے کردار کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور اس کے صفات فقر، خودداری، علوے ہمتی، انسانی زندگی کی ضمانت ہیں۔یہی توازن قوت مختلف قوموں کو ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ قریب کرتا جائے گا۔بدگمانیاں دور ہوتی جائیں گی۔اقبال پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فارسی میں جو کچھ کہا ہے وہ ہمارے کام کا نہیں۔اقبال کے مخاطب صرف اہل ہند ہی نہیں تھے۔ساری دنیائے انسانیت خاص اور خاص کر دنیائے اسلام کے مسلمان تھے۔اس لئے انہوں نے فارسی زبان کو اختیار کیا ہے۔یہ ایک مجبوری تھی''۔

4۔''جگر صاحب کے متعلق یہ رائے ظاہر کی گئی کہ وہ مشاعرہ کے شاعر ہیں ان کے یہاں سماجی احساس بعض مخصوص حالات کے علاوہ نہیں ملتا۔یہ صحیح نہیں ہے۔انہوں نے انسان دوستی، خلوص، جذبہ حریت اور خودداری کو ہمیشہ برقرار رکھا۔وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں لیکن ان کے یہاں سماجی احساس ملتا ہے اور آزادی کی لگن کی اچھی مثال ساقی نامہ ہے۔غزل کے شاعر ہونے کی وجہ سے ان کے یہاں مسائل زندگی اشاروں اور کنایوں میں ادا ہوتے ہیں''۔

5۔''سردار صاحب کا خیال ہے کہ کیفی اور ساحر کی شاعری انتہاپسندی کا شکار ہے۔انہوں نے ترقی پسندی کے زعم میں فنون لطیفہ کا مذاق اڑایا ہے اور تاج محل کی تخلیق کو نہ صرف بے کار بلکہ مضحکہ خیز بتایا ہے۔جعفری صاحب نے یہ کہہ کر کہ ان حضرات میں تاریخی بصیرت کی کمی ہے تنقید کا حق ادا نہیں کیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کے ذہنی پس منظر میں نفرت شبہ اور تلخی کا شدید جذبہ کارفرما ہے۔انہیں ماضی سے نفرت اور قدیم زندگی سے بیزاری ہے۔ان کا تاریخی شعور نہ صرف ناقص بلکہ خطرناک بھی ہے۔ان کی یہ زہرناکی زندگی کے تسلسل کو منقطع کر دیتی ہے اور تعمیر کے بجائے نفرت اور انتشار کی طرف لے جاتی ہے۔یہ حضرات ہر دور کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ان کی ذاتی پسند و ناپسند ہر جگہ چھائی ہوتی ہے۔انہیں ماحول، حالات اور زمانہ کا بالکل لحاظ نہیں ہے۔یہ لوگ شاعر سے زیادہ پروپگنڈسٹ ہیں''۔

6۔''اس میں کوئی شک نہیں کہ آج تک ترقی پسند ادب پر جتنی کتابیں لکھی گئیں، ان میں یہ کتاب سب سے بہتر ہے لیکن بعض بڑی بے اعتدالیاں بھی موجود ہیں''۔64

ڈاکٹر قمر رئیس نے سردار جعفری کی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے اس خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی مدلل انداز میں کی ہے:

1۔''سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' زیادہ نزاعی اس لئے ٹھہری کہ انہوں نے مثالیں اپنے معاصرین سے دی تھیں اور ''ترقی پسند ادب'' کے جائزہ میں بڑی سفاکی سے بعض کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ان کے بعض فیصلے اگر صحیح ہیں تو بعض جارحانہ رویہ کی غمازی کرتے ہیں مثلاً سعادت حسن منٹو کی کچھ کہانیوں کو اگر فحش اور مریضانہ مان لیا جائے تب بھی انہیں

غلاظت نگار کہنا یا انہیں بنیادی طور پر انسانوں کی محبت سے عاری بتانا تنقید کا بڑا ادعائی انداز تھا جو جعفری نے روا رکھا"۔۔۔

2۔"۔۔۔سردار جعفری نے بلنسکی گورکی مورس ڈاب اور خود لینن کے ادبی نظریات سے استفادہ کیا ہے"۔۔۔

3۔"۔۔۔انہوں نے بیسویں صدی کے سیاسی اور تاریخی عوامل کے تجزیہ سے جن ذہنی اور ادبی رجحانات کی نشاندہی کی ہے اس میں ایک صاف منطقی ذہن کی کارفرمائی دیکھی جاسکتی ہے۔۔۔

4۔"۔۔۔یہ بات بھی فراموش نہیں کی جاسکتی کہ سردار جعفری نے ترقی پسند ادب کی جمالیاتی اساس تلاش کرنے کی کوشش کی یا کم از کم اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ مبذول کرائی۔۔۔

5۔"۔۔۔سردار جعفری نے پلیخانوف کے حوالہ سے انسان کے ذوق و جمال کے ارتقاء اور سرچشموں کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔تہذیبی ارتقاء کی مختلف سطحوں اور سماج کے مختلف طبقوں کے ذوق جمال کے فرق کی نشاندہی بھی انہوں نے کی ہے۔ذوق جمال کے اجتماعی یا طبقاتی کردار پر زور دینے کے باوجود انہوں نے اس کے انفرادی پہلو کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا۔لکھتے ہیں "تہذیب وتمدن کی ایک سطح پر بھی ایسے دو آدمی نہیں ملیں گے جن کے جمالیاتی احساسات یکساں ہوں"۔ احساس جمال کی اس انفرادی شناخت کو انہوں نے متضاد سماجی عوامل میں تلاش کیا ہے۔۔۔

6۔"۔۔۔اسی طرح سردار جعفری کا یہ خیال بھی ہے کہ ذوق صحیح کا غماز ہے کہ "جب تک ادیب اور اس کے پڑھنے والوں کے درمیان مشترک جمالیاتی قدریں نہ ہوں گی ان دونوں کے جمالیاتی ذوق کی قدریں ملیں گی نہیں، تب تک نہ ادب سے لطف اٹھایا جاسکتا ہے نہ اسے سمجھا جاسکتا ہے۔۔۔

7۔"۔۔۔جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" کم از کم دو دہوں تک ترقی پسند ادبی نظریات کی تفہیم اور فروغ میں موثر رول ادا کیا ہے۔35 سال قبل لکھی ہوئی اس کتاب میں آج اگر گہرائی کی کمی محسوس ہوتی ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ آج کی مارکسی تنقید میں زیادہ دقت نظر اور حکیمانہ بصیرت پیدا ہوگئی ہے۔مارکسی تنقید اب بڑی حد تک مارکسی تصورات کے ایک رخے میکانکی اطلاق سے آزاد ہوگئی ہے۔۔۔خود جعفری کے شعور اور تنقیدی رویوں میں گذشتہ پندرہ برسوں میں نتیجہ خیز اور خوشگوار تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ہر چند کہ اس دور میں انہوں نے تنقید کم لکھی ہے اور انہیں نقاد ہونے کا دعوی بھی نہیں لیکن اقبال اور بعض کلاسیکی شعرا کے بارے میں انہوں نے جو مقالات، دیباچے لکھے ہیں وہ نئی بصیرت کا ثبوت ہیں۔

65

اقبال شناسی

ایک سو گیارہ صفحات پر مشتمل سردار جعفری کی کتاب "اقبال شناسی" کو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے 1976ء میں شائع کیا۔ سردار جعفری نے اقبال صدی 1977 کے خیر مقدم کے لئے اس کتاب کو لکھا تھا۔

سردار جعفری نے اپنی تصنیف "اقبال شناسی" میں اقبال کے فکر و شعر کا جائزہ "شاعر مشرق"، "اقبال اور فرنگی" اور "اقبال کا تصور وقت" کے تحت لیا ہے۔بقول سردار جعفری "تین مقالات میں اقبال کی فکر و شعر کے ان ترقی پسند پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کے بغیر اقبال کی عظمت کا پورا راز سمجھ میں نہیں آسکتا"۔ (اقبال شناسی صفحہ 11، 12)

1۔"اس کتاب میں سردار جعفری نے اقبال کے متعلق جو باتیں کہی ہیں وہ "ترقی پسند ادب" میں کہی گئی باتوں سے بالکل مختلف ہیں"۔ 66

"اقبال شناسی" کے دیباچہ میں سردار جعفری لکھتے ہیں:

"اقبال مسلم بیداری کے شاعر تھے۔اس میں ایشیائی بیداری شامل ہے۔اقبال ہندوستان کی بیداری کے شاعر تھے۔ اس میں پوری تحریک آزادی شامل ہے اور اقبال عالم انسانیت کی بیداری کے شاعر تھے۔صحیح معنوں میں عالمی شاعر تھے۔ ۔۔۔۔ان کی شاعری میں سامراج دشمنی کی لے شعلہ نوائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ہندوستان کی آزادی کا جذبہ خون بہا کی طرح ان کے اشعار میں رواں دواں ہے۔وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی ترقی کے خواہاں تھے اور انسانی تخلیقی قوتوں کے مداح اور قصیدہ خوان تھے۔ایسا شاعر فرقہ پرستی کے تنگ دائرہ میں سانس نہیں لے سکتا"۔۔۔۔

سردار جعفری نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اقبال سے پہلے اردو شاعری میں خودی کا لفظ قابل احترام نہیں تھا۔پرانے شعراء خودی کے خلاف تھے۔ 67

عمر رضا نے لکھا ہے:

"اس کے ثبوت کے لئے سردار جعفری نے حافظ، میر، سودا اور اکبر الہ آبادی کے اشعار پیش کئے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال بیچارگی کے قائل نہیں۔اقبال پر جس طرح کی فرقہ پرستی کا الزام عائد کیا جاتا ہے، اس مقالہ میں اس کی نفی کی گئی ہے اور اقبال کو ایک سیکولر اور عالمی شاعر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔سردار جعفری نے اقبال کی خودی کو انقلاب، سرمایہ پرستی کے خلاف احتجاج اور اشتراکیت میں تلاش کیا ہے۔(ضرب کلیم 1936)۔فرشتوں کا گیت، فرمان خدا، فرشتوں کے نام جیسی نظموں سے اس کی مثالیں پیش کی ہیں۔ 68

اقبال شناسی میں شامل سردار جعفری کے مضمون شاعر مشرق (تحریک آزادی کے پس منظر میں) پر تبصرہ کرتے ہوئے عمر رضا لکھتے ہیں:

"اول الذکر مقالہ (شاعر مشرق) میں اقبال کے فلسفہ خودی کو تحریک آزادی کے پس منظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ اقبال پر جس طرح کی فرقہ پرستی کا الزام عائد کیا جاتا ہے اس مقالہ میں اس کی نفی کی گئی ہے اور اقبال کو ایک سیکولر عالمی شاعر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔مقالہ میں اقبال کے فلسفہ حرکت و عمل، تسلسل حیات اور خودی کو بھی اقبال کے اردو اور فارسی اشعار کے حوالہ سے پیش کیا گیا ہے۔خصوصاً فلسفہ خودی میں تحریک آزادی اور اشتراکیت کو تلاش کیا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ" اقبال کا فلسفہ خودی ہندوستان کی تحریک آزادی کی عطا کی ہوئی بیداری سے ہم آہنگ تھا"۔ 69

علی سردار جعفری کا مضمون "اقبال اور فرنگی" فکر اقبال، مقالات حیدر آباد سمینار مرتبین ڈاکٹر عالم خوندمیری و ڈاکٹر مغنی تبسم (جنوری 1977) میں شائع ہوا۔

کولونیل ازم (Colonialism) کی وضاحت اور اس کی مخالفت میں پیدا ہونے والی دو طاقتوں کا ذکر کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

''جدید شہنشاہیت جس کے لئے اردو میں عام اور مقبول لفظ سامراج ہے، سرمایہ دارانہ نظام کا آخری نقطہ عروج تھا۔ جب مغربی ممالک کا بینکی سرمایہ فائی نمس بن کر اپنی ملکی اور قومی سرحدوں سے باہر نکلا اور دور دراز فاصلے طے کرتا ہوا غیر ممالک کی صنعتوں پر قابض ہو گیا تا کہ سستے کچے مال اور سستی مزدوری سے زیادہ سے زیادہ نفع کمایا جا سکے اور اس کی حفاظت کے لئے فوجوں اور حکومتوں کی ضرورت پڑی۔ اس سرمایہ داری شہنشاہیت کا نظام غلامی وجود میں آیا اس کو انگریزی میں کولونیل ازم کہتے ہیں۔ اردو میں کوئی معقول لفظ نہیں ہے۔ اس نظام نے دو سطحوں پر اپنی مخالف طاقتوں کو جنم دیا قومی اور ملکی سطح پر مزدور تحریک اور بین الاقوامی سطح پر غلام ممالک کی تحریک آزادی کو۔ 19 ویں صدی کے اختتام اور 20 صدی کی ابتداء عالمی سرمایہ داری نظام کا آخری نقطہ عروج بھی ہے۔ عروج کا عمل ختم ہو کر زوال کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور یہ عمل زوال کے ساتھ ساتھ کسی نئے طلوع کی بشارت بھی لے کر آتا ہے۔ تاریخی، معاشی اور سیاسی سطح پر اس نئی طلوع ہوتی ہوئی حقیقت کا نام اشتراکیت ہے''۔۔ 70

سردار جعفری نے بتایا ہے کہ اقبال نے تین لفظ فرنگ، مغرب اور یوروپ ایک ہی معنوں میں استعمال کئے ہیں یعنی ایشیاء کے مغرب میں واقع وہ ممالک ہیں جن میں صنعتی انقلاب کے بعد سرمایہ داری نظام اپنی ترقی کی آخری منزل یعنی سامراج تک پہنچ گیا اور اب اس سامراج کی شکست کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ فرنگ فرانس کی فارسی شکل ہے جس سے فرنگی بنا ہے یوروپ کے ہر رہنے والے کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے۔

سردار جعفری نے لکھا ہے کہ فرنگ اور فرنگی کی طرف اقبال کے دو رویے تھے۔ ایک عقیدت کا دوسرا مخالفت کا۔

(الف) اپنی عقیدت کے رویے کے سلسلہ میں اقبال نے چند فرنگیوں کا ذکر کیا ہے۔ ہندوستان میں تعلیم کے زمانہ میں اقبال آرنلڈ سے متاثر ہوئے۔ بانگ درا کے ابتدائی کلام میں 1905 سے پہلے کے حصہ میں نو نظمیں انگریزی شعرا کی نظموں کے تخلیقی ترجمے ہیں جن پر اقبال نے ماخوذ کا لفظ لکھ دیا ہے۔ ان میں ایمرسن، ولیم کوپر، لانگ فیلو اور ٹینی سن کے نام شامل ہیں۔ سردار جعفری نے بتایا کہ اقبال کے فلسفہ خودی میں عشق کا جو مقام ہے اس کے ابتدائی نقوش ٹینی سن سے ماخوذ نظم ''عشق اور موت'' سے ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مضمون میں اس نظم کو پوری کی پوری درج کیا ہے۔ سردار جعفری نے لکھا ہے کہ فرنگی شاعر گوئٹے نے اقبال کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ اقبال نے گوئٹے کو حکیم حیات کا خطاب دیا ہے۔ اقبال کی تربیت میں اسلامی علوم اور روایات کے ساتھ ساتھ جرمن فکر و ادب کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ وہ کانٹ، ہیگل، فشٹے اور نٹشے کے فلسفوں سے سیراب ہوئے۔ ''پیام مشرق'' میں زیادہ تر چیزیں طبع زاد ہیں لیکن گوئٹے کی بعض تخلیقات یا تو ترجمہ کی شکل میں یا تخلیق نو کی شکل میں پیش کی گئی ہیں جن سے گوئٹے اور اقبال کے نقطہ ہائے نگاہ کی مماثلت کا اندازہ ہوتا ہے اور اقبال کے فلسفہ خودی اور حرکت اور ارتقاء کے نظریات پر روشنی پڑتی ہے۔ ''جوئے آب'' کو گوئٹے کی ایک مشہور نظم ''نغمہ محمدؐ'' کا آزاد ترجمہ بتایا گیا ہے۔ نظم ''حور و شاعر'' گوئٹے کی اس عنوان کی ایک نظم کی آزاد تخلیق نو ہے جس میں اسلامی تخئیل حیات اور اقبال کا فلسفہ حرکت و ارتقاء نئے حسن کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ سردار جعفری نے بتایا کہ اپنے تصور ابلیس و آدم کو اقبال نے اپنی نظم جبریل و ابلیس میں پیش کیا ہے جس کا مقدمہ فاؤسٹ کے ابتدائی حصہ سے لیا گیا ہے۔

ب۔ دوسرا رویہ اقبال کی فرنگیوں سے مخالفت کا ہے۔ سردار جعفری نے بتایا کہ اقبال کے شعری مجموعہ ''پیام مشرق'' کی

بہت سی نظمیں فرنگی سیاست اور معاشرت پر بھرپور تنقید ہیں۔پہلی بار اس تصنیف میں انقلاب روس،کمیونزم کا ذکر آتا ہے اور کارل مارکس اور لینن کے نام شعر کا حصہ بنتے ہیں۔فرنگی کے خلاف اقبال کے رویے کی ابتداء 1908ء کے آس پاس بتلائی گئی ہے۔سردار جعفری نے اقبال کے اس رویہ کے کئی پہلو بتلائے ہیں جیسے! جن کے الفاظ میں

1۔فرنگی یا مغربی معیشت و سیاست اور اس سے پیدا ہونے والی تہذیب کی مخالفانہ تنقید جسے شہنشاہیت اور سرمایہ داری کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔

2۔اس نظام کے یقینی زوال کی پیش گوئی اور اس کے معاشی اسباب۔

3۔مسلمانوں اور محکوم قوموں کی بیداری جو براہ راست اس نظام پر ضرب لگا رہی تھی۔

4۔مشرق کی آزادی کے ساتھ نئے نظام کی بشارت۔

5۔اشتراکی انقلاب کا خیر مقدم،لیکن اشتراکی نظام کی مادیت کی تنقید اور مادیت میں روحانیت کی آمیزش کا نظریہ جسے اقبال نے اسلام کا جدید معاشی نظام تصور کہا ہے۔71

1905 اور 1908 کے درمیان اقبال کے سفر یوروپ کا زمانہ ہے۔بحر روم سے گزرتے ہوئے اقبال نے سسلی کے جزیرہ کا نظارہ کیا تو بقول سردار جعفری اقبال کو ملت اسلامی کا پرانا جاہ و جلال یاد آ گیا اور عہد حاضر کی بدحالی کی تصویر کھنچ گئی۔یوروپ جا کر اقبال نے وہاں کی تہذیب و معاشرت پر گہری نظر ڈالی اور اپنی غزل میں ان کی تہذیب کو ہدف تنقید بنایا۔ 1923ء میں شائع ہونے والی کتاب پیام مشرق میں پورا ایک حصہ نقش فرنگ کے نام سے ہے۔ایک نظم ''پیام'' کی طرف سردار جعفری نے متوجہ کیا ہے جس کی ابتداء میں اقبال نے بتایا کہ علم و عقل کا استعمال اگر انسان کی بہبود کے لئے نہ ہوگا اور صرف منافع خوروں کے لئے ہوگا تو عشق انسانی سے محروم ہو کر عقل و علم لعنت بن جائیں گے۔اس نظم کا اردو ترجمہ پیش کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے کہ اقبال نے عشق کو عقل سے زیادہ اہم بتایا ہے۔اقبال نے مغرب کو مخاطب کرتے ہوئے ایک اور عقل کی نشاندہی کی جو خود بیں نہیں ہے بلکہ جہاں بیں ہے یعنی عشق سے تربیت حاصل کی ہے،اس عقل کے ساتھ فرشتے کا نور اور آدم کے دل کا سوز و گداز ہے اور کہا کہ اس عقل کو ترک کر کے فرنگی نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ انسانی تباہی کا راستہ ہے۔ اس کا باعث بالادستوں کی ہوس ہے جو زیردستوں کا معاشی استحصال کرتی ہے اور اس استحصال کے لئے جنگ کا سامان کرتی ہے اور اپنی رہزنی کو جہاں بینی کا نام دیتی ہے۔اس سے پیدا ہونے والی تہذیب بے حیائی سکھاتی ہے اور کم مایہ عزیزوں کے خون کے جام چھلکاتی ہے۔اب جب استحصال اور خون آشامی اپنی آخری حد پر پہنچ گئی ہے تو نئے نظام کی بشارت کا وقت ہے۔ اقبال کو انقلاب آتا دکھائی دے رہا ہے۔

سردار جعفری نے پیام مشرق کے ایک سال بعد شائع ہونے والے شعری مجموعہ بانگ درا (1924) میں شامل تین نظموں شمع اور شاعر،خضر راہ اور طلوع اسلام کا حوالہ دیا۔شمع اور شاعر 1919 کو مسلمانوں کی زبوں حالی کا مرثیہ اور بیداری کا مژدہ بتایا ہے اور مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ انہیں خوف باطل نہیں ہونا چاہئے کیونکہ وہ غارت گر باطل ہیں،مسلمانوں کی بیداری اشیاء کے لئے اور ساری بنی نوع انسانی کے لئے سامانِ نور بننے کی پیشین گوئی کی۔

سردار جعفری کے الفاظ میں:

''اور واقعی دنیا چند سالوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔ ہندوستان سے طرابلس تک ایشیاء کی زمین ہل گئی۔

تین تاریخی واقعات نے مغربی سامراج پر کاری ضرب لگائی۔ ہندوستان کی سیاست میں مہاتما گاندھی کی آمد نے صدیوں کے سوئے ہوئے کسانوں کو جگا دیا۔ روس کے انقلاب نے بین الاقوامی سامراج کے قلعے میں شگاف ڈال دیا اور ترکی میں انگریزوں کی شکست نے مسلمانان عالم میں ایک جوش اور ولولہ پیدا کر دیا۔ ان تینوں سے پیدا ہونے والے جذباتی اور ذہنی انقلاب کو شاعر مشرق نے اپنی نظم خضر راہ میں سمیٹ لیا ہے اور ایشیاء کی نئی بیداری کا جشن طلوع اسلام میں منایا ہے۔

اب فرنگی اقبال کی زد پر تھا۔ اس کی سیاست، معیشت، معاشرت، تہذیب، تمدن کوئی چیز نہیں تھی جو شاعر مشرق کا ہدف نہ ہو۔ اس معاشرت کی ظاہری چمک دمک اور حسن کے اعتراف کے باوجود شکایت یہ ہے کہ روح میں گرمی اور دل میں حرارت نہیں ہے۔ اس انداز کی بنیاد پیام مشرق میں رکھی گئی ہے۔ اب اقبال نے غزل کی قدیم روایت کے مطابق فرنگی کے ساتھ وہ رویہ اختیار کیا جو ساتذہ نے زاہد، محتسب، ملا اور قاضی کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ فرنگی، فرنگ، مغرب اور یوروپ کے الفاظ بال جبریل کی غزلوں میں کردار بن گئے اور ایک ہی غزل میں جہاں حکیمانہ اور عارفانہ مضامین کے اشعار ہیں وہیں وہ اشعار بھی ہیں جن میں فرنگی ہدف ملامت ہے لیکن غزل کی نرم گفتاری کے ساتھ غزل کے رمز اور کنایہ کے ساتھ، غزل کی روایت کے ساتھ''۔ 72

اقبال شناسی کا تیسرا مقالہ ''اقبال کا تصور وقت'' ہے۔ اس میں اقبال کے اردو فارسی اشعار اور انگریزی اردو کی نثری تحریروں کے حوالہ سے اقبال کے تصور وقت کو واضح کیا گیا ہے۔ مقالہ کی ابتداء میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

''تصور وقت فلسفہ اور سائنس کا مسئلہ ہے جسے اقبال نے شعر کے سانچے میں ڈھال کر جمالیاتی احساس دے دیا ہے اور نہایت خوبصورت اشعار کی تخلیق کی ہے۔ وہ وقت کا ایک نیا اور حسین احساس پیدا کر کے بیدار ہوتی ہوئی انسانی زندگی کی پیچیدہ راہوں پر خود اعتمادی سے چلنے کی تعلیم دینا چاہتے تھے''۔ 73

سردار کے مقالہ اقبال اور تصور وقت کا جائزہ لیتے ہوئے عمر رضا رقمطراز ہیں:

1۔ ''سردار جعفری نے اگر چہ خود کے ذہن کو وقت کی فلسفیانہ تربیت سے محروم قرار دیا ہے لیکن پھر بھی ہندو تصور وقت پر بحوالہ خامہ فرسائی کی ہے جس کی رو سے وشنو کے ایک خواب کے ساتھ ایک دنیا بیدار ہوتی ہے اور اپنی بیداری کے چکر کو ختم کرنے کے بعد خود بھی ختم ہو جاتی ہے اور دوسری دنیا بیدار ہوتی ہے۔ ایک برھما کے بعد دوسرا برھما آتا ہے، ایک آدم کے بعد دوسرا آدم پیدا ہوتا ہے۔ یہی وشنو کا خواب ہے، یہی مایا ہے، یہی وقت ہے اور تمام انسان اس کے دائرے میں اسیر ہیں۔ اپنے آخری تجزیہ میں یہ مادے کی حرکت ہے جو تخلیق، تخریب اور تخلیق نو کی شکل میں نگاہوں پر ظاہر ہوتی ہے۔ 74

سردار جعفری نے ہندو تصور وقت کے مذکورہ فلسفیانہ تصور کو غیر حقیقی اور خواب و خیال سے پُر بتایا ہے جسے اقبال نے قبول نہیں کیا تھا۔ بقول ان کے ''اس ابتدائی فلسفیانہ تصور میں دنیا کے مایا ہونے کا، غیر حقیقی اور خواب و خیال ہونے کا تصور بھی پنہاں ہے جو فلسفہ خودی کی نفی کرتا ہے۔ اس لئے یہ تصور اقبال کے لئے قابل قبول نہیں ہے''۔ 75

یہی وجہ ہے کہ سردار جعفری نے ایسے بہت سے حوالے دیئے ہیں جہاں اقبال نے منصور حلاج اور شنکر اچاریہ دونوں کو وحدۃ الوجودی قرار دیا ہے۔ چونکہ یہ ایسے تصورات ونظریات ہیں جو خودی کے راستے میں حائل نظر آتے ہیں۔ اس لئے اقبال، حافظ شیرازی پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ ہندو تصور وقت کے ساتھ مایا کا جو تصور ہے اس کی وضاحت سردار جعفری نے "پُران" کے حوالے سے کی ہے اور لکھا ہے:

"ایک طرف یہ خالص وحدانیت، خالص ادویت واد کی طرف لے جاتا ہے جو شنکر اچاریہ کے یہاں کوندم بھج کوندم کے نغمے میں ڈھل جاتا ہے اور اقبال کے یہاں "زماں ہے نہ مکاں لا الہ الا اللہ" بن جاتا ہے۔ لیکن دوسری سطح پر دنیا کو ہیچ اور بے معنی غیر حقیقی قرار دے کر انسانوں سے ان کی قوت عمل چھین لیتا ہے۔ 76

2۔ "اسلامی دنیا کے انحطاط کے بعد گذشتہ تین چار سو سال سے تصوف اور وحدۃ الوجود نے جس طرح امنگوں، آرزوؤں اور جستجوؤں کو چھین لیا تھا، اس کا بھی سردار جعفری نے ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں حافظ، بیدل، ذوق اور غالب کے وہ اشعار نقل کئے ہیں جن میں وقت کے غیر حقیقی ہونے کا ثبوت اور انسان کی بے بسی کا اظہار ملتا ہے جسے اقبال نے ناپسند کیا تھا"۔

3۔ "سردار جعفری نے اقبال کے تصور وقت کو ان کے چند اقتباسات اور اردو فارسی اشعار کے حوالوں سے واضح کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقبال کے یہاں "تصور وقت" کے تین عناصر ترکیبی ہیں۔ پہلی اسلامی جس کی بنیاد امام شافعی کے مقولے (وقت تلوار ہے) اور رسول کریمؐ کی دو حدیثوں (لی مع اللہ وقت، لاتسبو الدھر) پر ہے۔ دوسرا عنصر قدیم ایرانی ہے جسے زروانیت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ زروان دنیا کا اور دنیا کی ہر چیز کا خالق اور مالک ہے اور وہ خود زندگی اور موت ہے۔ تیسرا عنصر وہ ہے جس پر "برگساں" کے فلسفہ کا اثر ہے۔ برگساں کے مطابق حقیقت اپنی بنیادی فطرت میں تخلیقی ارتقاء ہے اور یہ ساری کیفیتیں اقبال کی شاعری میں نظر آتی ہیں جسے سردار جعفری نے جدلی مادیت سے قریب پایا ہے اور لکھا کہ:

"یہ انداز فکر جدلی مادیت سے بہت قریب ہے جو حرکت اور تغیر کا سائنٹفک نظریہ ہے۔ اس کے اعتبار سے خارجی حقیقت ہمارے وجود سے آزاد اپنا وجود رکھتی ہے اور ہمارے ادراک وشعور کے آئنہ میں منعکس ہوتی ہے۔ یہ حقیقت مادہ ہے جو حرکت کے بغیر وجود پذیر اور ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔ نہ مادہ کا وجود بغیر حرکت کے ممکن ہے اور نہ حرکت کا وجود مادے کے بغیر۔ زماں و مکاں متحرک مادے کے وجود کی شکلیں ہیں۔ کوئی دنیا میں مادے کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ کوئی مادے کی تخریب نہیں کر سکتا۔ وہ خود تخلیق کار ہے اور اپنی شکلیں بدلتا ہے۔ اسی طرح زماں و مکاں کی بھی تخلیق وتخریب ممکن نہیں ہے۔ مذہبی زبان میں اس کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ خدا نے مادے کو قوت تخلیق ودیعت فرمائی ہے۔ بیج میں درخت اور پھول بننے کی اور پھول میں پھل بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ یہ قوت تخلیق حرکت کی کی پابند ہے۔ اس لئے اس کی ایک شکل جسے وقت کہتے ہیں وہ بھی خلاق نظر آتا ہے۔ اسلام جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس مادے کو رد نہیں کرتا اور نہ اسے غیر حقیقی قرار دیتا ہے، صرف اس کی پرستش حرام ہے۔ زمین و آسمان حیوان وانسان، چاند، ستارے، درخت اور پہاڑ، دشت و دریا سب حقیقت ہیں جن کی تخلیق مادہ نے کی ہے اور مضمر طاقتیں ودیعت کی ہیں اور دنیا قرآن کے اعتبار سے ناتمام ہے"۔ 77

4۔ ''اقبال کے یہاں برگساں کا جو تصور وقت پایا جاتا ہے، اس کی نشاندہی کے لئے سردار جعفری نے پہلے برگساں کے تصور وقت کی دونوں قسموں ''پیمائشی وقت'' (Serial Time) جسے سکنڈ، گھنٹے، رات، دن، ہفتہ، مہینہ اور سال میں ناپا جاتا ہے اور دوران خالص (Pure Duration) کا ذکر کیا ہے جسے اقبال نے ''زمانے کی رَو'' کہا ہے۔ غرض سردار جعفری نے یہ بھی واضح کیا کہ اقبال نے کس طرح برگساں کے تصور وقت کو اپنے اشعار میں ڈھالا''۔

5۔ ''سردار جعفری نے اقبال کے تصور وقت کو قرآن وحدیث کی روشنی میں بھی دیکھنے کی سعی کی ہے اور دوران خالص (Pure Duration) کو ایک حدیث لاتسبو الدھر کی روشنی میں پیش کیا ہے جس کی تصدیق کے لئے اقبال کے اس اقتباس کو نقل کیا ہے جس میں انہوں نے برگساں سے اس حدیث کا جب ذکر کیا تو وہ اچھل پڑا تھا۔ سردار جعفری کا ماننا ہے کہ ''خالص وقت'' یا ''دوران'' ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم نہیں ہوسکتا کیونکہ مستقبل ایک لمحے میں حال بن جاتا ہے اور حال ایک لمحے میں ماضی میں تبدیل ہوجاتا ہے جس میں بے پناہ تسلسل ہے، وہ بے نیاز ہے اور مستقل آگے بڑھتا چلا جارہا ہے چنانچہ اقبال کے اس تصور وقت کے متعلق سردار جعفری نے لکھا ہے:

''اقبال کے یہاں وقت ایک جابر اور قاہر مگر خلاق طاقت ہے۔ ایک بے پناہ تسلسل، ایک بہتے ہوئے طاقتور دریا کی طرح ڈوبنے اور تیرنے والوں سے بے نیاز، آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ وہ کسی کے لئے رات کی شراب بچا کر نہیں رکھتا۔ تمام حادثات، وقت کے اس تسلسل اور بہاؤ سے پیدا ہوتے ہیں۔ موت اور زندگی کی ساری حقیقت یہی تسلسل ہے۔ یہ روح انسانی سے پیدا ہوتا ہے اور روح انسانی میں گم ہوجاتا ہے۔ اگر ایک جگہ اسے پیراہن یزداں کہا ہے تو دوسری جگہ اس کی تشریح یوں کی ہے کہ وقت کا سلسلہ ذات مطلق کی قبائے صفات بناتا ہے۔ یہ بے پناہ بہاؤ سب کو موت کی طرف بہائے لئے جارہا ہے کوئی اس پر قابو حاصل نہیں کرسکتا لیکن وہ ''مرد خدا'' جو عشق سے سرشار ہے''۔ 78

اقبال کی شاعری اور فلسفہ میں وقت اور انسان کے مابین رشتوں کی جو نوعیت ہے، اسے بھی سردار جعفری نے تلاش کیا ہے۔ **اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:**

''اقبال کی شاعری اور فلسفہ میں وقت اور انسان کا رشتہ بڑا معنی خیز اور دلچسپ ہے۔ اگر انسان عقل کے ساتھ عشق سے بھی سرشار ہے جس کے معنی تخلیق کے جذبے، کردار کی مستی اور تکمیل انسانیت کی امنگ سے سرشار ہونا تو وقت کارا کب ہے اور وقت اس کا مرکب ہے۔ بصورت دیگر وہ اگر صرف آب وگل کی تخلیق ہے اور عقل وعشق سے بے نیاز ہے تو وقت اس کا را کب اور وہ وقت کا مرکب۔ اور اگر صرف عقل رکھتا ہے اور عشق بیگانہ سے ہے تو وقت اس کے لئے عبرت کا تازیانہ ہے''۔ 79

سردار جعفری نے اقبال کے شعر وفکر میں تین ''خالق''، ''خدا'' (خالق کائنات)، ''وقت'' اور ''انسان'' کو بھی تلاش کیا ہے جس کی وضاحت کے لئے انہوں نے اقبال کے درج ذیل اشعار پیش کئے ہیں اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے یہاں وقت اور زندگی کس طرح یکجا نظر آتے ہیں۔

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم رواں ہے زندگی

زمانہ کہ زنجیر ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے
یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

درج بالا اشعار میں زندگی، وقت، خودی سب ایک ہوتے نظر آتے ہیں۔سردار جعفری نے اقبال کے اردو فارسی اشعار اور انگریزی اقتباسات سے یہ بھی ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ اقبال کی شاعری میں تیسرے خالق ''انسان'' کی بے حد اہمیت ہے اور لکھتے ہیں کہ ''تیسرا خالق انسان ہے جس کے ہنر میں ایک تازہ جہاں آباد ہے جو بخشے ہوئے فردوس کی خاطر میں نہیں لاتا۔لیکن اپنی جنت اپنے خون جگر سے تعمیر کرتا ہے۔(روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے) یہ انسان اقبال کی فکر کا مرکزی نقطہ ہے۔اقبال کا تصور وقت اس خلاق انسان کے لئے ایک چیلنج ہے۔مسجد قرطبہ میں انسان نے اس چیلنج کو قبول کیا ہے۔یہ وقت سے بڑا خالق ہے اس لئے کہ باشعور خالق ہے''۔ 80

5۔''ان مباحث کے بعد سردار جعفری نے اس مقالہ کا اختتام کچھ اس طرح کیا ہے کہ ''اس نامکمل کائنات کو وقت اور انسان دونوں مل کر تکمیل کی منزل کی طرف لے جا رہے ہیں۔یہ منزل کبھی نہیں آئے گی کیونکہ ناتمامی فطرت کا اٹل قانون ہے۔لیکن اس منزل کا تصور شوق کو ہمیشہ ضرور کرتا رہے گا اور انسان کو آداب خداوندی سکھاتا رہے گا''۔ 81

6۔اس طرح سردار جعفری نے اس مضمون میں اقبال کے ''تصور وقت'' کو پیش کرتے ہوئے اپنے نظریۂ ادب کی بھی جابجا وضاحت کی ہے جس میں انسانیت کی بقاء، مارکس کا نظریہ (جدلی مادیت)، رجائی نقطہ نظر اور عہد کا عکس سبھی کچھ نظر آتا ہے۔ 82

مظہر جمیل نے سردار جعفری کی تصنیف ''اقبال شناسی'' میں شامل تینوں مضامین پر تبصرہ کیا ہے۔اس سے پہلے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں شامل اقبال کی فکر و شعر پر تبصرہ نہ صرف مختصر ہے بلکہ اس میں تجزیاتی عنصر کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔یہ صورت حال غالباً اس لئے پیدا ہوئی کہ یہاں فکر اقبال کا تفصیلی مطالعہ مقصود نہ تھا بلکہ اقبال کے ان ترقی پسند نظریات کا جائزہ پیش نظر تھا جن کے اثرات نے اردو شاعری اور فکریات کو نئے امکانات سے روشناس کرایا تھا''۔ 83

2۔پہلے مقالے ''شاعر مشرق (تحریک آزادی کے پس منظر میں) گذشتہ تین صدیوں میں ہندوستانی معاشرے میں پیدا ہونے والی نفسیاتی کیفیت کا مدلل جائزہ لیا گیا ہے۔ان کے (اقبال) کے سامنے ہندوستان کی غلامی اور آزادی کے سوال کے ساتھ سب سے اہم مسئلہ ہندوستانی مسلمانوں کی نئی بیداری اور احیائے اسلام کی نئی صورت تھی، لیکن اہم بات یہ ہے کہ یہ بیداری تحریک آزادی کا حصہ تھی اور اقبال کا ذہن فرقہ پرستی سے بلند تھا اور انہوں نے کبھی ہندوؤں کے خلاف ایک حرف نہیں لکھا اور مسلمانوں کی روحانی نشاۃ ثانیہ کو ہندوستان کی آزادی سے الگ نہیں کیا۔اقبال کے ہاں اسلامی استعارے کے جواز میں سردار جعفری کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اقبال نے اسلامی استعاروں میں آفاقی حقیقتیں پیش کی ہیں جنہیں کسی ایک قوم یا گروہ تک

محدود نہیں کیا جاسکتا۔اقبال کی سامراج دشمنی دراصل ان کی حب الوطنی کا پرتو ہے۔۔۔۔۔

3۔اقبال شناسی کا دوسرا مضمون ''اقبال اور فرنگی'' دراصل اقبال کے تصور انقلاب سے بحث کرتا ہے۔وہ بتاتے ہیں کہ اقبال ہماری شاعری کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے انقلاب کی اصطلاح کو اس وسیع تر معاشی،سماجی،سیاسی تبدیلی کے معنی میں استعمال کیا ہے جو بین الاقوامی استحصالی نظام کے خلاف قوموں کی جدوجہد آزادی اور ظالمانہ طبقاتی جبر کے مدمقابل مجبور لوگوں کے جہاد سے معنون ہے۔۔۔بقول سردار جعفری،یہ لفظ اقبال کے ہاں پہلی بار 1917ء کے روسی انقلاب کے بعد آیا''۔۔۔سردار جعفری بتاتے ہیں کہ مغرب کی طرف اقبال دو رویوں کے حامل تھے۔ایک عقیدت اور دوسرا مخاصمت کا۔پہلے رویے کے تحت وہ حکیمان فرنگ کی دانائی،تحریک پذیری،عمل آفرینی اور تخلیقی تلاش وجستجو پر وارفتگی کا اظہار کرتے ہیں۔اس ضمن میں سردار جعفری نے اقبال کی نظموں سے ایسے اقتباسات پیش کئے ہیں جن میں مغربی دانشوروں،شاعروں،سائنس دانوں اور مفکروں کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے اور ان کے انقلاب آفریں تصورات کا خیر مقدم کیا ہے۔ان میں مارکس،لینن بھی شامل رہے ہیں اور کانٹ وہیگل بھی،نٹشے اور گوئٹے بھی اور ایمرسن وٹینی سن بھی۔۔۔۔اقبال کی تربیت میں اسلامی علوم اور روایات کے ساتھ ساتھ جرمن فکر وادب کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔سردار جعفری نے اقبال پر مغربی دنیا اور مفکرین کے اثرات کا جائزہ لینے میں ان کی نظموں کے ساتھ ساتھ بعض نثری تحریروں سے بھی استفادہ کیا ہے خاص طور پر پیام مشرق کے دیباچے سے۔۔۔

مغربی دنیا کی طرف اقبال کا دوسرا رویہ ناقدانہ ہے جس کے تحت وہ مغرب کے سرمایہ داری نظام کی چیرہ دستیوں کو برہنہ دیکھتے ہیں۔پیام مشرق جو 1923 میں شائع ہوئی تھی اقبال کے دونوں رویوں کو پیش کرتی ہے۔اقبال کا تنقیدی رویہ جہاں مغربی نظام معیشت وسیاست،اس سے پیدا ہونے والی تہذیب،سرمایہ داری اور شہنشاہیت کی خامیوں کی نشاندہی اور اشتراکی نظام کے زوال کی پیشین گوئی کرتا ہے وہیں مشرق کی آزادی کے ساتھ نئے نظام کی بشارت بھی دیتا ہے جہاں شتراکی انقلاب کا خیر مقدم کرتا ہے وہیں اشتراکی مادیت کی نکتہ چینی بھی کرتا ہے۔سردار جعفری کسی ذہنی تحفظ کے بغیر اقبال کے ان دونوں رویوں کو اس وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ فکر اقبال کا یہ اہم گوشہ بھی روشن ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس کتاب (اقبال شناسی) کا تیسرا مضمون ''اقبال کا تصور وقت'' اقبال کی شاعری میں وقت کے بہتے ہوئے دھارے کا نظری تجزیہ پیش کرتا ہے۔سردار جعفری نے اس تجزیہ میں ہندوستانی تصور وقت،مغربی تصور وقت اور اسلامی تصور وقت کی تکون کے حوالے سے اقبال کے تصور وقت کو سمجھانے کی کوشش کی ہے جو مطالعہ اقبال میں ایک نیا،اہم اور زیادہ موثر طریقہ کار ثابت ہوا ہے۔۔۔ان مضامین کے علاوہ ماہنامہ کتاب نما دہلی میں اقبال پر مختلف زاویوں سے چار اداریے (دیکھ تو کس منزل طوفان سے آتی ہے حیات) بھی خصوصی اہمیت رکھتے ہیں جس کی چوتھی قسط میں ''جاوید نامہ'' پر سیر حاصل تبصرہ موجود ہے۔اسی طرح ایک اور مقالہ ''چراغ لالہ'' کے عنوان سے بھی شائع ہوا ہے۔سردار جعفری کی تمام تحریریں تفہیم اقبال کے سلسلہ میں ایک نقطہ نظر فراہم کرتی ہیں جو اقبال کو بے پناہ صلاحیتوں کا حامل،وسیع النظر،تاریخی شعور وادراک کا مالک دانشور ثابت کرتی ہیں''۔84

ترقی پسند ادب کے بعد کے عرصہ میں اقبال پر تنقید کے سلسلہ میں سردار جعفری کے رویہ میں تبدیلی آئی۔اس تبدیلی کی

نشاندہی کرتے ہوئے ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

''پیغمبران سخن کی طرح سردار جعفری نے اقبال شناسی کے مضامین میں بھی اپنے پختہ کار اور تجزیاتی تنقیدی صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ وہی اقبال جو اشتراکیت سے متاثر، حب الوطنی کے جذبے سے سرشار اور حرکت و عمل کے فلسفے کے علمبردار ہونے کے باعث اپنی ابتدائی شاعری کے حوالے سے ان کے تعریف کے مستحق ٹھہرے تھے قدرے بعد کی شاعری میں مردکامل کے لئے شاہین کی علامت کے استعمال کے سبب ان کے معتوب ہوگئے تھے اور انہوں نے ترقی پسند ادب میں لکھا تھا کہ ''اقبال نے اپنے شاہین کو تیمور، ابدالی، نپولین اور مسولینی کی شکل میں دیکھا تھا اور اقبال کے نزدیک پوری انسانی تاریخ ایسی ہی خودی سے سرشار افراد کے اشاروں پر چلتی ہے اور فوق البشر کی تلاش میں ہے۔ یہ انفرادیت پرستی اور ہیرو پرستی خالص بورژوا تصور ہے جو اپنی آخری شکل میں فاشسٹ ڈکٹیٹر کا روپ دھار لیتا ہے اور یہ ڈکٹیٹر (شاہین) لہو گرم رکھنے کا بہانہ ڈھونڈنے کے لئے جاتا ہے تو اقبال کا انسان دوست دل تڑپ اٹھتا ہے''۔ اقبال شناسی کے مضامین میں جلال کو جمال اور عقل کو دل سے الگ کر کے دیکھنے کا انداز نہیں ملتا اور وہ اقبال کے مختلف ادوار کے کلام کو ایک ہی سلسلہ کی کڑی تصور کرتے ہیں۔ ان کو خودی کے استحکام کے سارے عناصر ہندوستان اور ایشیاء کی مسلم بیداری کے وسائل دکھائی دیتے ہیں اور یہ مسلم بیداری ان کے نزدیک دراصل عالم انسانیت کی بیداری کا حصہ ٹھہرتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

''اقبال صحیح معنوں میں عالمی شاعر تھے۔ چونکہ اقبال نے اپنی شاعری میں اسلامی فکری روایات اور استعارات کا استعمال کیا ہے اور قوم پرستی (نیشنل ازم) کو سیاسی سطح پر قبول نہیں کیا، اس لئے بعض لوگوں نے ان پر فرقہ پرستی کا الزام لگایا جو اس عظیم شاعر کی توہین ہے۔ اقبال کے یہاں حب الوطنی ایمان کا درجہ رکھتی ہے اور ان کی شاعری میں سامراج دشمنی کی لے شعلہ نوائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے''۔ 85

سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس نے کہا ہے کہ اقبال شناسی میں انہوں نے اقبال پر اپنی پہلی رائے کی بھرپور تلافی کر دی ہے اور اقبال کی نئے انداز میں بازیافت بھی کی ہے۔

''جب سردار جعفری کی کتاب ترقی پسند ادب شائع ہوئی تھی تو اس میں بھی اقبال کے تعلق سے منٹو کے تعلق سے اور ایسے ہی بعض دوسرے ادبی مسائل پر کسی قدر شدت پسندی کا اظہار ہوا تھا لیکن ۔۔۔ اس کے فوراً ہی بعد سردار جعفری نے اپنے اس رویہ کی بھرپور تلافی بھی کر دی اور اقبال کے سلسلہ میں مستقل نوعیت کا عظیم الشان کام کیا ہے۔ اقبال صدی کے سلسلہ میں انہوں نے جو کام کیا ہے وہ دراصل اقبال کی نئے انداز سے بازیافت کا کام تھا''۔ 86

پیغمبران سخن

پیغمبران سخن سردار جعفری کی مرتب کردہ تین کتابوں، کبیر بانی، دیوان میر اور دیوان غالب کے دیباچوں پر مشتمل ہے جو 1958 اور 1965 کے درمیان لکھے گئے تھے۔ بعد میں انہوں نے ان تینوں مضامین کو یکجا کر کے کتابی شکل میں ''پیغمبران سخن'' کے نام سے شائع کرا دیا۔ ہر دیباچہ بجائے خود ایک مکمل مقالہ ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1970 میں مکتبہ گفتگو سے شائع

ہوئی۔اس میں سب سے پہلا مقالہ کبیر پر ''حرف محبت'' کے عنوان سے ہے۔دوسرا میر تقی میرؔ پر ''صبا در بدر'' کے عنوان سے اور تیسرا اور آخری مقالہ مرزا غالبؔ پر ''تمنا کا دوسرا قدم'' کے عنوان سے ہے۔

اس کتاب کے دیباچے میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

''میں اپنے آپ کو نقادوں کی صف میں شمار نہیں کرتا اور میں نے پیشہ ور نقادوں کا سا رویہ بھی اختیار نہیں کیا ہے۔میرے لئے کبیر، میر اور غالب کی شاعرانہ دنیا کی بازیافت خود میری شعر گوئی کے لئے ضروری ہے۔میں جس نظریۂ جمال اور نظریۂ تاریخ پر یقین رکھتا ہوں اور جو میرے اندر گزشتہ تیس سال میں رچ بس چکا ہے میں نے اسی نظریے سے ان بزرگ شعرا کے کلام پر نظر ڈالی ہے۔یہ کلام ابدی قدروں کا حامل ہے لیکن اپنے عہد سے بے نیاز نہیں ہے۔وقت کی وہ روانی جو ماضی، حال اور مستقبل کو ایک بہتے ہوئے دریا کی شکل میں پیش کرتی ہے اس کی موجوں میں شعر و فن بھی شامل ہیں۔ان مضامین میں اس مشکل سوال کا جواب مل جائے گا کہ صدیاں گذر جانے اور حالات تبدیل ہو جانے اور زبان کے انداز بدل جانے کے بعد بھی ان بزرگ شعراء کا کلام ہمارے ذوق کی تسکین کا باعث کیسے بن سکتا ہے۔عظیم ادب کی جڑیں اس عہد کی زمین میں پیوست ہوتی ہیں لیکن پھول اور پھل عہد کی حدوں کو توڑ کر نکل جاتے ہیں۔

سردار جعفری نے کبیر (پندرھویں صدی)، میر (اٹھارویں صدی) اور غالب (انیسویں صدی) کی بازیافت اپنے خاص نقطۂ نظر سے کی ہے۔ان شعراء کی شاعری کو انہوں نے ان کے عہد اور حالات کے پیش نظر دیکھا اور اس کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی پہلوؤں کی نشاندہی کی اور شاعری میں سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی کو حق بجانب بتلایا ہے۔

علی سردار جعفری کی کتاب ''پیغمبران سخن'' میں حرف محبت کے عنوان کے تحت کبیر پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔اس میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔انسانی مساوات، تصوف، بھکتی کا ذکر کیا گیا ہے۔رومی، شنکر اچاریہ، کبیر، رامانند، ڈاکٹر تاراچند اور اقبال کے حوالے دیئے گئے ہیں اور آخر میں سردار جعفری نے لکھا ہے ''یہ کبیر کی، رومی کی غرض تمام سنتوں اور صوفیوں کی تعلیمات کی نئی تفسیر ہے جو ایک نئی انسانیت کی بشارت لئے ہوئے ہے۔

صبا در بدر عنوان کے تحت میر پر لکھا گیا ہے۔سردار جعفری نے بتایا کہ میر کا مقام شاعری ہی نہیں بلکہ زبان کے ارتقاء کی تاریخ میں بھی بہت اہم ہے۔ان کی شاعری اس عہد کی ترجمان ہے۔ان کا دیوان ان کے اپنے نہیں بلکہ سارے زمانے کی درد و غم کا مجموعہ ہے۔انہوں نے دنیا کے مال و دولت سے زیادہ اخلاقی قدروں کو قیمتی سمجھا۔میر نے اپنی غزل کو اپنے عہد کا آئینہ بنا دیا۔سردار جعفری نے میر کی شاعری کی عظمت کو تسلیم کیا اور کہا کہ زمانہ کے بدل جانے کے بعد بھی دو سو برس پرانی زبان میں ہمارے جذبات اور احساسات کا ساتھ دے رہی ہے۔

تمنا کا دوسرا قدم کے عنوان کے تحت سردار جعفری نے غالب کو موضوع بنایا ہے۔سردار جعفری نے لکھا ہے کہ غالب اردو کا محبوب ترین شاعر ہے۔وہ انتہائی مشکل حالات میں بھی جی کھول کر ہنسنا جانتا ہے۔غالب کے غم دل آویز ہیں اور ان میں بھرپور نشاط کی کیفیت ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کے پاس نہیں۔وہ بلاؤں سے دست و گریباں ہو کر سامان طرب حاصل کرتا ہے۔غالب کے پاس انسان کائنات کا محور ہے۔غالب شوق اور طلب کی راہ میں ایک لمحے کے لئے بھی آسودہ نہیں ہونا

چاہتا۔منزل سے کہیں زیادہ لذت منزل کی جستجو میں ہے کیونکہ منزل آسودگی ہے اور آسودگی روح و دل کی موت۔

سردار جعفری کی کتاب ''پیغمبران سخن'' پر تبصرہ کرتے ہوئے شافع قدوائی نے سردار جعفری کے تنقیدی موقف میں تبدیلی اور ان کی وسیع النظری پر روشنی ڈالی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

1۔''علی سردار جعفری کی تنقیدی بصیرت کا اصل ثبوت 1970 میں شائع ہونے والی ان کی کتاب پیغمبران سخن ہے جو اصلاً ان کی مرتبہ تین کتابوں کبیر بانی، دیوان میر اور دیوان غالب کے دیباچوں پر مشتمل ہے۔مصنف کے مطابق یہ دیباچے 1958 اور 1965 کے درمیان لکھے گئے تھے۔سردار جعفری نے دیباچہ نگاری کے روایتی تصور سے انحراف کرتے ہوئے زیر مطالعہ شعراء کی مدلل مدح سرائی نہیں کی بلکہ زیر بحث شاعروں کے موضوعاتی شعور اور فنی حسن و قبح پر بھی دلجمعی کے ساتھ گفتگو کی ہے۔یہ دیباچے ایک نئی تنقیدی فضاء کا احساس کراتے ہیں اور ان میں ادب کے افادی اور سماجی کردار اور موضوع پر بیجا اصرار نہیں ملتا بلکہ شاعری کے مطالعے کے دوران موضوعاتی تشریح میں نظری اور فکری سرچشموں، روایتی اور تہذیبی ماخذوں اور فنی، لسانی اور اسلوبیاتی خصائص پر تفصیلی بحث ملتی ہے۔اس نوع کے مباحث سے ترقی پسند ادب کے صفحات تہی ہیں''۔

2۔پیغمبران سخن کے مطالعہ سے صاف طور پر منکشف ہوتا ہے کہ سردار جعفری نے اپنے تنقیدی نقطہ نظر میں خاصی لچک پیدا کرلی ہے۔ترقی پسند ادب میں اقبال اور اصغر کے تصوف کو بے وقت کی راگنی قرار دیا گیا تھا کہ اس میں عوام کی بھلائی کا کوئی تصور موجود نہیں اور یہ بھی باور کرلیا گیا تھا کہ درویشی اور قلندری کی فی زمانہ کوئی وقعت نہیں ہے۔تاہم پیغمبران سخن کے دیباچہ میں سردار جعفری اپنے تنقیدی موقف میں واضح تبدیلی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:''جدید عہد کی سیاسی، انقلابی تحریکوں کو مزید تقویت حاصل کرنے کے لئے قرون وسطی کی انقلابی فکر سے رشتہ جوڑنا چاہئے۔اس منزل میں صوفیوں اور بھگتوں کی روایتوں کے ساتھ ساتھ کبیر، میر اور غالب ہمارے لئے اہم ہیں''۔

3۔ادب کے سماجی کردار کی اشاعت و ترویج کو تنقید کا اولین فریضہ نیز دوسرے تمام تنقیدی نقطہ ہائے نظر کو رجعت پسندانہ قرار دینے والے سردار جعفری اب اعتراف کرتے ہیں کہ تنقید بھی ہزار شیوہ فن ہے اور ہر لکھنے والا ایک نئے نقطہ نگاہ سے پرانے سے پرانے شاعر کی طرف توجہ کرسکتا ہے۔یہ وسیع النظری ایک نئے تنقیدی محاورہ کی جستجو کی غماز ہے''۔ 88

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے سردار جعفری کے کبیر پر تنقیدی مطالعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ سردار نے کبیر کا مطالعہ ایک پیغام انسانیت کا مطالعہ ہے جو سردار نے اپنی تقویت کے لئے بھی لیا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ آج بھی کبیر کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

''کبیر داس کا مطالعہ محض ایک شاعری کا مطالعہ نہیں ہے۔ایک پیغام انسانیت، ایک مشترکہ تہذیب کا مطالعہ ہے۔اپنی تہذیبی آمیزش کی روح کی تلاش ہے۔دیگر تہذیبوں کے اثرات کی جستجو ہے۔پیغمبران سخن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

''کبیر داس کی عظمت ہندو بھگتی اور مسلم تصوف کے امتزاج کا نتیجہ ہے اور یہ امتزاج نہایت خوبصورت ہے۔

2۔''ان کا خیال ہے کہ عظیم ادب کی جڑیں اس عہد کی زمین میں پیوست ہوتی ہیں لیکن پھل اور پھول عہد کی حدوں کو توڑ

کرنکل جاتے ہیں۔وہ پھل پھول کومحسوس کرنے کے بعد ان کی جڑوں کو بھی تلاش کرتے ہیں جہاں سے شاعری کے چشمے پھوٹتے ہیں۔چنانچہ کبیر پر بات کرتے وقت وہ جس طرح بھگتی،تصوف اور خود کبیر کی خاندانی زندگی، جولاہوں اور کوریوں کی ذات پات،ان کا پھیلاؤ اس طرح پیش کرتے چلے جاتے ہیں جس طرف ان کا علم ہی نہیں بلکہ انسانوں کے تئیں ان کی محبت و قربت کا صاف پتہ چلتا ہے۔ہندوستان کی سیاسی وسماجی صورت حال اور اس کے بطن سے کبیر کا جنم، رامانند کی شاگردی، فاقہ مستی، انسان دوستی نے کبیر کے تصوف کو جس بلند مقام پر پہنچادیا تھا وہ سردار جعفری کے مطابق کئی بھگتوں،صوفیوں،شاعروں کی ایک آواز بن کر ابھرتا ہے۔وہ اس آواز کو کہاں کہاں سے ملاتے ہیں۔

ملاحظہ کیجئے:

''بعض مقامات پر منصور کی اناالحق کی گونج کے علاوہ کبیر کی تعلیمات پر رومی کے تصورات کا بھی عکس دکھائی دیتا ہے جسے انہوں نے ہندو بھگتی کے انداز سے پیش کیا ہے۔وہی جاہ وجلال، وہی بے تابی اور بے قراری جو رومی کی خصوصیت ہے کبیر کی شاعری کا جزو اعظم ہے۔ہندو بھگتی کبیر کو مقام فنا کی سیر کراتی ہے جہاں عجز وانکسار،خشوع وخضوع ہے اور مسلم تصور مقام بقا پر پہنچاتا ہے جہاں قوت،عظمت،جلال و جمال، بے باکی اور بلند آہنگی کے ڈنکے بج رہے ہیں۔۔۔گرونانک اور ٹیگور میں تو اس کے اثرات ملتے ہیں ہی۔وہ میر، غالب اور اقبال کی شاعری میں بھی ان صداؤں کو سنتے ہیں اور ان کا تجزیہ بھی اسی انداز سے کرتے ہیں۔اقبال کے بارے میں تو وہ بطور خاص کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ کبیر، رومی غرض یہ کہ تمام سنتوں،صوفیوں کی تعلیمات کی نئی تفسیر ہے جو ایک نئی انسانیت کی بشارت لئے ہوئے ہے۔وہ کبیر کا مطالعہ محض اپنے نقطہ نظر کی تسکین کے لئے نہیں تقویت کے لئے بھی کرتے ہیں اور اس لئے بھی کرتے ہیں کہ ہمیں آج بھی کبیر کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔اس روشنی کی ضرورت ہے جو اس صوفی سنت کے دل سے پیدا ہوئی۔کبیر کا تجزیہ ان کے دل ودماغ کی نکلی ہوئی آواز ہے جہاں فکر پر جذبہ غالب ہے لیکن جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں جذبہ کم،فکر زیادہ کام کرنے لگتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب وہ میر، غالب کا تجزیہ کرتے ہیں تو صوفی اور شاعر کے فرق کے پیش نظر ان کی نگاہیں باریک اور دوربین ہوتی جاتی ہیں لیکن زاویہ نظر وہی ہے جو کبیر سے متعلق تھا''۔ 89

ابوالکلام قاسمی نے سردار جعفری کے کبیر کے مطالعہ میں انسان دوستی کی تلاش کو اجاگر کیا۔سردار جعفری نے کبیر کا موازنہ علمی اور تحقیقی بنیادوں پر کیا ہے۔

پیغمبران سخن دراصل کبیر،میر اور غالب کے انتخابات کے تنقیدی مقدمات پر مشتمل ہے جن میں بقول ابوالکلام قاسمی ان تینوں شاعروں کو ہندوستانی سماج کی مخصوص صورتحال اور ادبی روایت کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس کتاب میں کبیر کو بھگتی تحریک کا نمائندہ قرار دینے اور انسان دوستی یا ہمہ گیر عوامی اپیل کے باعث اسلامی تصوف سے قریب دکھایا گیا ہے۔کبیر کی شاعری کے اس تجزیہ میں بھگتی،ویدانت اور متصوفانہ فکر کے یکساں سرچشموں کا سراغ لگاتے ہوئے انہوں نے کبیر کا موازنہ جلال الدین رومی اور دوسرے صوفی شعراء کے افکار سے علمی اور تحقیقی بنیادوں پر کیا ہے''۔ 90

ڈاکٹر قمر رئیس نے سردار جعفری کے مطالعہ کبیر میں انسانی مساوات،انسانی وحدت،انسانی ہمدردی کی تلاش کو اجاگر کیا۔

''سردار جعفری نے کبیر اور میر کی شاعری میں بھگتی اور تصوف کے مسلک کا مطالعہ تاریخی حوالوں سے کر کے انسانی مساوات کے تصور پر زور دیا ہے۔ذات پات رنگ و نسل اور سماجی اونچ نیچ کی تفریق کے مقابلہ میں کبیر نے انسانی وحدت، انسانی دردمندی اور عالمگیر محبت کی تبلیغ کی جس کے اثرات ہندوستانی سماج اور اس سے زیادہ ہندوستانی فکر کے ارتقاء میں نمایاں رہے۔سردار جعفری کہتے ہیں ''ہمیں آج بھی کبیر کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔اس روشنی کی ضرورت ہے جو اس سنت صوفی کے دل سے پیدا ہوئی تھی''۔ 91

شافع قدوائی نے کبیر پر سردار جعفری کی تنقید کی ستائش کرتے ہوئے کبیر کے کلام کا رومی سے موازنہ کو قابل قدر تنقیدی کارنامہ قرار دیا۔کبیر کے کلام کا رومی سے موازنہ بھی سردار جعفری کا قابل قدر تنقیدی کارنامہ ہے کہ کبیر اور رومی کے تقابلی مطالعے کی کوئی روایت نہیں ملی۔اقتباس ملاحظہ کریں:

''کبیر کی تعلیمات پر رومی کے تصورات کا بھی عکس دکھائی دیتا ہے جسے انہوں نے ہندو بھگتی کے انداز سے پیش کیا ہے وہی جاہ و جلال، وہی بیتابی، وہی بیقراری جو رومی کی غزلوں کی خصوصیت ہے، کبیر کی شاعری کا جزو اعظم ہے۔ہندو بھگتی کبیر کو مقام فنا کی سیر کراتی ہے جہاں عجز و انکسار، خشوع و خضوع ہے اور مسلم تصوف مقام بقا پر پہنچاتا ہے جہاں قوت و عظمت، جلال و عظمت، بے باکی اور بلند آہنگی کے ڈنکے بج رہے ہیں''۔ 92

عمر رضا نے کبیر پر سردار جعفری کے تنقیدی مطالعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں کبیر کی شاعری میں انسانیت، یکجہتی، ہندو مسلم اتحاد، مشترکہ تہذیب کی نشاندہی کی گئی ہے۔کبیر کے ہاں ترک دنیا کے تصور کی خوبصورت وضاحت کی گئی ہے۔حقوق اللہ اور بالخصوص حقوق العباد کے اسلامی تصور کو اجاگر کرتے ہوئے ان حقوق کی ادائیگی کی ترغیب بھی ملتی ہے۔

1۔''پیغمبران سخن کے پہلے مقالہ بعنوان ''حرف محبت'' میں سردار جعفری نے کبیر کی شاعری کے بالخصوص پریم، انسانیت، یکجہتی اور کثرت میں وحدت جیسے تصورات کو واضح کرنے کی سعی کی ہے۔علاوہ ازیں کبیر کے مذہبی تصورات، ہندو اور مسلمانوں کے درمیان یگانگت، نظریہ طبقاتی اور ذاتی تقسیم وغیرہ پر مختصراً لیکن جامع روشنی ڈالی ہے۔سردار جعفری نے رومی، شنکر اچاریہ، اقبال، ٹیگور اور تاراچند کے حوالے سے کبیر کے مختلف تصورات کی وضاحت کی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کبیر کی تعلیمات میں ہندو مسلم اتحاد، انسانیت، مساوات (ذات اور مذہب سے اوپر اٹھ کر) اور ہندوستان کی جو ملی جلی تہذیب ہے، اس کی اہمیت سے قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا''۔۔۔

2۔''کبیر کے یہاں ترک دنیا کا جو تصور ملتا ہے اس سے بھی بحث کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ کبیر کے یہاں ترک دنیا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی صرف اپنی ذات میں گم ہو جائے اور اپنی نجات کے لئے مراقبے میں کھو جائے۔وہ خود شادی شدہ آدمی تھے اور صاحب اولاد تھے، کرگھے پر خود کپڑا بنتے تھے اور پھیری لگا کر اسے بیچتے تھے اور اس کی آمدنی سے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔ان کی مادی اور جسمانی محنت ان کے روحانی نغموں کی تخلیق میں حائل نہیں ہوتی تھی بلکہ شاید اس میں مدد دیتی تھی''۔ 93

3۔''کبیر کے یہاں موجود اس اسلامی تصور کا بھی ذکر کیا گیا ہے جس کی رو سے انسان کے دو حقوق، حقوق اللہ اور حقوق

العباد کی بات کی جاتی ہے۔اول الذکر کی عدم توجہی یا عدم پابندی کو خدا معاف کرسکتا ہے لیکن آخر الذکر کا تعلق سماجی ذمہ داریوں اور بندوں کے حقوق سے ہے اس لئے جب تک عزیز و اقارب، پڑوسی، ہم وطن اور اہل دنیا کا حق ادا نہیں کر دیا جاتا، خدا معاف نہیں کرسکتا۔۔۔"

4۔"کبیر کی تعلیمات میں جو ہمیں دوہوں اور پدوں کی شکل میں ملتی ہیں مختلف صوفی شعراء کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے مثلاً بابا فرید، جلال الدین رومی اور شیخ سعدی وغیرہ۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں اردو اور فارسی کے سینکڑوں الفاظ ملتے ہیں۔۔۔"

5۔"سردار جعفری نے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ آج جب کہ ہر طرف شکست وریخت، فرقہ وارانہ نفاق اور مذہبی بیگانگی پیدا ہو رہی ہے، ایسے میں کبیر کی تعلیمات سے سبق لے کر ایک اچھے اور بہتر معاشرے کی تشکیل کی جاسکتی ہے۔

بقول ان کے:

"ہمیں آج بھی کبیر کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔اس روشنی کی ضرورت ہے جو اس سنت صوفی کے دل سے پیدا ہوئی تھی۔آج دنیا آزاد ہو رہی ہے۔سائنس کی بے پناہ ترقی نے انسان کا اقتدار بڑھایا ہے۔صنعتوں نے اس کے دست و بازو کی طاقت میں اضافہ کر دیا ہے۔انسان ستاروں پر کمندیں پھینک رہا ہے۔پھر بھی حقیر ہے، مصیبت زدہ ہے، دردمند ہے۔وہ رنگوں میں بٹا ہوا ہے۔قوموں میں تقسیم ہے۔اس کے درمیان مذہب کی دیواریں کھڑی ہوئی ہیں۔فرقہ وارانہ نفرتیں ہیں۔طبقاتی کشمکش کی تلواریں کھنچی ہوئی ہیں۔بادشاہوں اور حکمرانوں کی جگہ بیوروکریسی لے رہا ہے۔دلوں کے اندر اندھیرے ہیں۔چھوٹی چھوٹی خودغرضیاں اور رعونتیں ہیں جو انسان کو انسان کا دشمن بنا رہی ہیں۔جب وہ حکومت، شہنشاہیت اور اقتدار سے آزاد ہوتا ہے تو خود اپنی بدی کا غلام بن جاتا ہے۔اس لئے اس کو ایک نئے یقین، نئے ایمان اور نئی محبت کی ضرورت ہے جو اتنی ہی پرانی ہے جتنی کبیر کی آواز اور اس کی صدائے بازگشت اس عہد کی آواز بن کر سنائی دیتی ہے۔

(علی سردار جعفری، پیغمبران سخن، صفحہ 55-54)

6۔"اس طرح سردار جعفری نے مذکورہ مقالہ میں کبیر کی گنگا جمنی روایات اور ہندو مسلم اتحاد کے فروغ کی وکالت کی ہے۔مساوات کا درس، مذہب سے بالاتر انسانیت کی بازیافت اور بالخصوص "حرف محبت" (ڈھائی اکشر پریم کے) کا خلاصہ بیان کیا ہے جس کا براہ راست اور بالواسطہ فارسی روایات اور مسلم صوفیا سے رشتہ جوڑ کر سردار جعفری نے ایک نئے تناظر میں کبیر کی اہمیت اجاگر کی۔بالخصوص اس کے ذریعہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں کا ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد، یگانگت اور بھائی چارا پیدا کرنے کی سعی کی ہے"۔ 94

سردار جعفری نے میر کی شاعری کو تاریخی حالات و حادثات کے پس منظر میں بھی دیکھا ہے۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی کی وضاحت ملاحظہ کیجئے:

"میر کی شاعری کو وہ (سردار جعفری) تاریخی حالات و حادثات کے پس منظر میں ایک زخم خوردہ شاعر کی آواز قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب جب انسان کے دماغ پر ضربیں لگی ہیں، اس نے زخم کھائے ہیں، میر کے دیوان کو کلیجے سے لگایا ہے۔

آخر کوئی تو بات ہے کہ 1947 کے حادثات کے بعد لہولہان ہندوستان پاکستان نے سب سے زیادہ کلیات میر میں اپنے زخموں کا مرہم تلاش کیا۔غالب، اقبال، جوش وغیرہ کا دامن چھوڑ کر میرؔ کے دامن میں پناہ لی۔انسان اور انسانیت کے حوالے سے میرؔ کو یاد کرنا اور نہایت مدلل، منطقی انداز میں غم ذات کو غم کائنات بنا کر پیش کرنا سردار جعفری کا نظریہ تنقید ہے اور ایک وسیع انداز ترقی پسندی بھی۔میر کی شاعری پر بات کرتے کرتے جب وہ میر کی آپ بیتی پر آتے ہیں تو ایک بار پھر تاریخ و تہذیب کے گل کھلنے لگتے ہیں اور ایک نئے میر کی دریافت ہونے لگتی ہے جہاں سے میر کی انسانیت اور مساوات کے دروازے کھلتے ہیں جو اس سے قبل ذرا مشکل سے ہی نظر آتے ہیں''۔ 95

دیباچہ، دیوان میر میں سردار جعفری نے میرؔ کی شاعری کی تمام جہتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''میرؔ کی شاعری کے تمام بکھرے ہوئے جلوے ایک صد رنگ گلستان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔اس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی، بلبل بھی اور صیاد بھی، نشیمن بھی ہے اور بجلی بھی، زندہ رہنے کی امنگ بھی ہے اور مر جانے کا حوصلہ بھی اور یہی وجہ ہے کہ یہ شاعری آج بھی عظیم ہے اور زمانہ کے بدل جانے کے بعد بھی دو سو برس پرانی زبان میں ہمارے جذبات اور احساسات کا ساتھ دے رہی ہے''۔

عمر رضا نے میر تقی میر پر سردار جعفری کے تنقیدی مطالعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے میرؔ کے کلام میں حوصلہ مندی عصری حسیت، انسان دوستی، معاشی حالات، سماجی برائیوں کے خلاف احتجاج کی نشاندہی کی ستائش کی ہے:

1۔سردار جعفری نے میرؔ کے کلام میں غم کو رجائیت اور حوصلہ مندی سے تعبیر کیا ہے۔

2۔سردار جعفری نے میرؔ کی شاعری میں سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

3۔سردار جعفری نے میرؔ کی عشقیہ شاعری میں تصوف کو تلاشنے کی سعی کی ہے۔

4۔سردار جعفری لکھتے ہیں:

انہوں نے (میر) نے اپنے دیوان کو درد و غم کا مجموعہ بتایا ہے اور یہ درد و غم صرف ذاتی نہیں ہے کیونکہ جہاں سارا عالم خاک ہو چکا وہاں صرف اپنے آپ پر رونا بے سود ہے۔اس لئے میرؔ کے یہاں دل اور دہلی کی خرابی (نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی وجہ سے) کا ذکر ایک ساتھ آتا ہے اور عاشق اور آدم ہم معنی الفاظ ہیں۔(سردار جعفری پیغمبران سخن 122)

عمر رضا لکھتے ہیں:

محولہ بالا اقتباس میں سردار جعفری کی اجتماعیت پسندی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو ترقی پسندی کی شناخت ہے۔چنانچہ انہوں نے میر کی غزلوں کے ایسے متعدد اشعار نقل کئے ہیں جن میں میرؔ نے براہ راست سماجی، معاشی اور سیاسی مضامین کو خوبصورتی سے ڈھالا ہے۔

علاوہ ازیں ایسے اشعار بھی نقل کئے ہیں جن میں میرؔ نے اپنے عہد کے مظالم اور انسانی شخصیت کی شکست و ریخت کو محبوب کے پردے میں بیان کیا ہے۔یہی محبوب ظالم اور سفاک بادشاہوں، حکمرانوں اور فاتحوں کی ذات میں تبدیل ہوتا نظر آتا ہے۔ان باتوں کی وضاحت کے لئے سردار جعفری نے میرؔ کے ڈھیر سارے اشعار نقل کئے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ محبوب

کے اس تصور کے پیچھے حالات زمانہ کا ایک سماجی شعور ہے اور ان بظاہر سادہ شعروں کی تہہ میں دبا ہوا ایک احتجاج ہے۔

5۔ ''سردار جعفری کو میرؔ کی شاعری میں ایک ایسا محبوب بھی نظر آتا ہے جو میر کا ذاتی محبوب ہے''۔۔۔

6۔ ''سردار جعفری نے میرؔ کی شاعری میں انسان دوستی، سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کی عکاسی اور موجودہ عہد کی مختلف خرابیوں کے خلاف ان کے یہاں جس طرح کا صدائے احتجاج پایا جاتا ہے اس کی طرف توجہ مرکوز کر کے اپنے نظریہ شعر کے جواز کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ دیگر بات ہے کہ انہوں نے وقت اور حالات کے مطابق کبھی براہ راست اور کبھی بالواسطہ انداز بیان اختیار کیا ہے''۔ 96

میرؔ کے کلام پر سردار جعفری کی تنقید پر روشنی ڈالتے ہوئے شافع قدوائی نے کھڑی بولی کے نکھرے روپ موضوع اور اسلوب کی وسعت اور بالخصوص میرؔ اور اقبال کے کلام میں مماثلت کی نشاندہی کی تعریف کی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

1۔ ''سردار جعفری کے نزدیک میرؔ کی عظمت کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ ان کا کلام موضوع اور اسلوب ہر دو لحاظ سے تمام رنگوں کو محیط ہے اور لسانی اعتبار سے میر کا مہتم بالشان کارنامہ یہ ہے کہ کھڑی بولی جس پر جدید ہندی اور اردو زبان کی بنیاد ہے اتنے نکھرے ہوئے روپ میں میرؔ کے ہاں نظر آتی ہے کہ اس کے بعد ہر کسی کا روپ میرؔ کی دین معلوم ہوتا ہے۔ اسلوب اور انداز کے اعتبار سے بھی میرؔ کی حیثیت ایک ایسے شاعرانہ سرچشمے کی سی ہے جس سے تمام ندیاں پھوٹتی ہیں۔ وہاں غالب کے رنگ کے ساتھ ساتھ خارجیت کا وہ انداز بھی ملتا ہے جسے لکھنو سے منسوب کیا جاتا ہے''۔

2۔ ''میرؔ اور اقبال کے کلام میں مماثلت کی نشاندہی کی اولین کوشش کا سہرا بھی سردار جعفری کے سر ہے:

''لطف یہ ہے کہ جس کو آج اقبال کی غزل کا نیا اسلوب سمجھا جاتا ہے اور جس کی روانی میں فکر کی عظمت کی وجہ سے ایک بھاری پن آ گیا ہے اور گمبھیر کیفیت پیدا ہو گئی ہے اس کے نشانات بھی میرؔ کے یہاں موجود ہیں اور بعض مقامات پر علامتوں ہی کی نہیں بلکہ خیالات کی حیرت انگیز یکسانیت ہے۔ حالانکہ فکری اور جذباتی اعتبار سے میرؔ اور اقبال کے درمیان دو صدیوں کا فاصلہ حائل ہے''۔ 97

بقول شافع قدوائی ''کیا ہی اچھا ہوتا اگر سردار جعفری میرؔ اور اقبال کے کلام کے متعین حوالوں سے اس نکتہ کو مزید Develop کرتے تو ان کا یہ Thesis اردو تنقید میں سنگ میل ثابت ہوتا''۔

3۔ سردار جعفری نے میر کی غزل کا مابہ الامتیاز عنصر Conversational Style قرار دیا ہے۔ فارسی الفاظ کے استعمال میں بھی میرؔ ہندوستانی تلفظ کو ترجیح دیتے تھے۔ سردار جعفری نے اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے متعین مثالیں بھی پیش کیں۔ ''فارسی الفاظ کے استعمال میں بھی میرؔ نے ہندوستانی لب ولہجہ کو فارسی لب ولہجہ پر ترجیح دی ہے مثلاً وہ خیال اور پیار کی ''ی'' کو ظاہر نہیں کرتے۔ میرؔ کی غزلوں کا ترنم بھی عوامی لب ولہجہ سے زیادہ قریب ہے۔ ان کی غزلوں میں فارسی غزل کی نفاست سے زیادہ ہندی شاعری کی ارضی کیفیات ہیں۔ تشبیہوں اور لفظی تصویروں کے معاملہ میں بھی وہ مروجہ فارسی خزانہ پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنے گرد و پیش سے تصویریں حاصل کرتے ہیں۔ 98

دیوان غالب کے دیباچہ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب علی نے لکھا ہے کہ یہ کلام غالب کی نئی تعبیر و توجیہہ پیش کرتا ہے۔

تاراچن رستوگی کے قول کے مطابق ''یہ اہم تنقیدی ہوش وخرد کی آئنہ داری کرتا ہے۔دیباچے کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں سردار نے غالب کو ایک آفاقی شاعر قرار دیا:

''غالب کی عظمت صرف اس میں نہیں کہ اپنے عہد کے باطنی اضطراب کو سمیٹ لیا بلکہ اس میں ہے کہ اس نے نیا اضطراب پیدا کیا۔اس کی شاعری اپنے عہد کے شکنجوں کو توڑ دیتی ہے اور ماضی اور مستقبل کی وسعتوں میں پھیل جاتی ہے۔اس نے اپنے ہر تجربے کو جو ایک انتہائی لطیف جمالیاتی ذوق رکھنے والے ذہن کی کارفرمائی تھی انسانی نفسیات کی آگ میں تپا کر پگھلایا ہے۔کلیئے کی کسوٹی پر کسا ہے اور پھر شعر کی شکل میں ڈھالا ہے۔تب اس کے یہاں ایک عالمگیر اور آفاقی شاعر کا لہجہ پیدا ہوا ہے اور وہ زندگی کے ہر شعبہ کا شاعر بن گیا ہے''۔

ڈاکٹر صاحب علی لکھتے ہیں:

''ہمارے ذہنوں میں بہت سی الجھنیں ہوتی ہیں اور بے شمار مسائل ہوتے ہیں مگر ان سب کا پرتو غالب کے کلام میں ملتا ہے۔اس طرح غالب کے اشعار ہمارے دل و دماغ کو تازگی اور آسودگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔اسی باعث غالب کے بہت سے اشعار جغرافیائی حد بندیوں سے بلند ہو کر ضرب المثل کی صورت اختیار کر گئے ہیں''۔ 99

مرزا غالب کی شاعری میں اس دور کا عہد،غم میں نشاط کی کیفیت،انسانی عظمت،منزل کی جستجو،حرکت وعمل کی نشاندہی اور سردار جعفری کا اس نتیجہ پر پہنچنا کہ غالب کی شاعری بھی اس عہد کے سیاسی،معاشی اور اخلاقی حالات سے متاثر تھی ان سب باتوں کا ذکر عمر رضا نے کیا ہے:

1۔''پیغمبران سخن میں غالب کی شاعری پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔علاوہ ازیں انیسویں صدی کے اس عہد کا بھی ذکر ہے جس میں مغل تہذیب دم توڑ رہی تھی اور نئی صنعتی تہذیب کے نقوش ابھر رہے تھے۔سردار جعفری کا ماننا ہے کہ ان سب نے مل کر غالب کی شخصیت اور شاعری پر گہرے اثرات مرتب کئے تھے۔یہی جہہ ہے کہ اس مضمون میں انہوں نے غالب کی شاعری کو غالب کے عہد اور مزاج اور شخصیت کے مطابق جانچا اور پرکھا ہے''۔۔۔۔غالب کے یہاں غم میں بھی نشاط کی کیفیت پائی جاتی ہے''۔۔۔

2۔''سردار جعفری نے غالب کی کائنات میں انسان کی حیثیت اور جگہ کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور نتیجہ اخذ کیا ہے کہ''غالب کی نظروں میں ایک انسان کی عظمت اتنی زیادہ ہے کہ وہ اسے کائنات کا محور سمجھتا ہے اور دنیا کی تخلیق کا باعث قرار دیتا ہے''۔ 100

3۔''شوق تو غالب کا محبوب لفظ ہے۔شوق وطلب کی راہ میں وہ ایک لمحے کے لئے بھی آسودہ ہونا پسند نہیں کرتے بلکہ منزل کی جستجو میں لذت محسوس کرتے ہیں۔غالب کی شاعری میں حرکت وعمل کے تصورات بھی در آئے ہیں جس کا اظہار انہوں نے موج،تلاطم،طوفان،شعلہ،سیماب،برق اور پروانہ جیسے الفاظ سے کیا ہے اور ان کی شاعری میں اس طرح کے بے شمار الفاظ ملتے ہیں۔اگر چہ غالب کی ان تمام خصوصیتوں کو سردار جعفری نے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن غالب کی شاعری کو ان کے عہد،گرد وپیش میں ہونے والے حالات وواقعات اور دیگر امور سے جس طرح انہوں نے جوڑ کر دیکھنے کی سعی کی ہے وہ

قابل غور ہے''۔۔۔

4۔''سردار جعفری نے غالب کی اس شاعری کا بطور خاص جائزہ لینے کی کوشش کی ہے جس میں غالب کا پورا عہد جھلکتا ہے۔سردار جعفری نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ غالب کی شاعری بھی اپنے عہد کے سیاسی، معاشی اور اخلاقی حالات سے متاثر ہے۔ اس میں ان کے عہد کا خمار اور نشہ ہے، جاتی ہوئی رات کا کرب اور آتی ہوئی سحر کا نشاط بھی ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں اپنے عہد کے ظاہری اور باطنی اضطراب کو کچھ اس ڈھنگ سے پیش کیا ہے کہ ان کی شاعری عہد کے شکنجوں کو توڑتی اور ماضی و مستقبل کی وسعتوں میں پھیلتی نظر آتی ہے۔انتہائی نشاط ہو یا انتہائی مایوسی، تشکیک کا عالم ہو یا پھر تصور کی کرشمہ سازی، ہر کیفیت کو غالب نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ظاہر ہے اس مضمون میں بھی سردار جعفری کا ترقی پسند نظریہ ادب پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے جس میں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت ملتی ہے''۔ 101

پیغمبران سخن میں سردار جعفری نے غالب کے سلسلہ میں لکھا ہے:

''غالب کی متحرک اور رقصاں امیجری تصویر گری کی معراج ہے۔جب وہ اپنی اچھوتی تشبیہوں اور نادر استعاروں کا جادو جگاتا ہے تو ایک ایک لفظ حرکت کرنے لگتا ہے۔ٹھہرے ہوئے نقوش سیال ہو جاتے ہیں اور خیال ایک پیکر نور بن کر سامنے آجاتا ہے''۔

اس اقتباس پر ابوالکلام قاسمی نے اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری کے پہلے اور دوسرے دور کے تنقیدی رویہ میں تبدیلی کی نشاندہی کی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''اس رائے میں جہاں ایک طرف غالب کی رقصاں امیجری کو نشان زد کیا گیا ہے وہیں استعارہ سازی کو بھی اس کا لازمہ بتایا گیا ہے۔یہ وہی استعارہ سازی ہے جس کی بدولت شاعری میں پیدا ہونے والے دھندلکے اور ابہام کو سردار جعفری اپنی ابتدائی تنقید میں سب سے زیادہ ہدف تنقید بنا چکے ہیں''۔ 102

سردار جعفری نے غالب کے ہاں جن چیزوں کی تلاش کی ان میں کائنات اور فرد، تصوف، ان کے دل آویز غم جسے نشاط غم کہا گیا، شوق، آرزو، حرکت و عمل، انسانی عظمت، انسان دوستی، کائنات کو سماج کی فلاح و بہبود کی نظر سے دیکھنا شامل ہیں۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے غالب کے ہاں سردار جعفری کی ان دریافتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''غالب جیسے رنگا رنگ، متضاد اور مختلف جہات شاعر کے تجزیہ میں ہی وہ (سردار جعفری) سب سے پہلے کائنات اور فرد سے متعلق غالب کا سراغ لگاتے ہیں اور پھر تصور کی طرف چلے جاتے ہیں۔وہ غالب کو ہیگل وغیرہ کے قریب پاتے ہیں۔ ویدانت، ایرانی و تاری پیکن ازم کی آمیزش تلاش کرتے ہوئے غالب کی شاعری میں اقبال کے فلسفہ خودی کے ابتدائی نقوش تلاش کر لیتے ہیں۔سردار کا کمال یہ ہے کہ وہ نہایت فکری و استدلالی انداز میں غالب کے رنج و غم میں تجدید طرب کی بنیادیں تلاش کر لیتے ہیں اور تفہیم غالب و تفسیر غالب کی ایک نئی امیج پیش کرتے ہیں۔وہ غالب کی دلآویزی پر کھل کر باتیں کرتے ہیں اور اس میں امید و نشاط کی کیفیتیں محسوس کرنے کے بعد لکھتے ہیں''غالب کے غم اتنے دل آویز ہیں ان میں جو بھرپور نشاط کی

کیفیت ہے وہ اردو کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملے گی ۔۔۔غالب کی شاعری میں غم ونشاط کو الگ الگ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔وہ دراصل نشاطِ غم کا شاعر ہے یعنی وہ بلاؤں سے دست وگریباں ہوکر سامان طرب حاصل کرتا ہے"۔تجسس وتفحص کی راہ سے گذرتے ہوئے وہ (سردار جعفری) غالب کے ذہن میں بسے ہوئے انسان کے تصور کو تلاش کر لیتے ہیں۔وہ غالب کی شاعری میں انسانی آرزوؤں، جذبہ وشوق سب کچھ دیکھ لیتے ہیں جہاں غالب کی نظر میں یہ پوری کائنات انسانی تمناؤں کا صرف ایک قدم بن کر رہ جاتا ہے۔سردار جعفری نے اقبال کی طرح غالب کے شوق کو بھی جس طرح تلاش اور پیش کیا ہے اس سے بھی غالب کی نئی جہتیں کھلتی ہیں۔ان کا خیال ہے کہ شوق اور آرزو کی لذت ہی راہگذروں کو لذت سے آشنا کرتی ہے اور اسی چیز نے غالب کی شاعری کو حرکت کے تصور سے سرشار کر دیا ہے جس کا اظہار موج ،تلاطم،طوفان،شعلہ، سیماب، برق اور پروانہ کے الفاظ کی بہتات سے ہوتا ہے۔یہی ساری اشیاء مل جل کر غالب کے جمالیاتی ذوق کی تعمیر کرتی ہیں اور ان کے معشوق کو بھی برق وشرر کی طرح پیش کرتی ہیں اور طرح طرح کی امیجری بھی پیش کرتی ہیں۔مجموعی طور پر سردار جعفری غالب کی شاعری میں ایک نئے انسان اور ایک نئی دنیا تلاش کرتے نظر آتے ہیں ؎

گھر میں کیا تھا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

اور اس حسرت تعمیر کے حوالہ سے سردار جعفری نے غالب کے عہد کو چھوتے ہوئے تاریخ وتہذیب کی تبدیلی ،قدامت وجدیدیت کے تصادمات پر جو فکر انگیز بحثیں کی ہیں وہ ان کی تجزیاتی فکر اور ترقی پسندانہ نقطہ نظر کا ایک مخصوص حصہ ہیں اور نہایت منطقی وپرکشش انداز واسلوب۔۔۔۔۔سردار جعفری کبیر،میرؔ اور غالبؔ کو عام روش، عام ڈگر پر کھڑے ہوکر دیکھ سکتے تھے لیکن شاعری،فنون لطیفہ،ادب، آرٹ غرض یہ کہ ساری کائنات کو انسان اور انسانی سماج کی فلاح وبہبود کی نظر سے،تہذیب وتمدن، انسانی بقا ایک مخصوص زاویہ نظر سے دیکھنا سردار جعفری کا اپنا ایک مخصوص ومنفرد اور وسیع نقطہ نظر ہے"۔103

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے غالب پر سردار جعفری کی تنقید پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سردار جعفری نے حافظ کے بعد کا مقام (بالخصوص غزل میں) بتلایا ہے اور انہیں شیکسپیئر کا ہم پلہ قرار دیا ہے اور یہ کہ سردار جعفری نے غالب کے سماجی حالات اور مسائل،سماج کی خوشیوں غموں کے حوالے سے غالب کے کلام کی جہات کا تعین کیا ہے:

1۔سردار جعفری نے غالب کو اپنے ہم عصروں پر فوقیت دیتے ہوئے غالب کی غزل کے آہنگ کو میرؔ کے آہنگ سے اونچا قرار دیا ہے لیکن یہی نہیں وہ تو غالب کی غزل کے اس قدر ستائش گر ہیں کہ اردو شاعری ہی میں نہیں، فارسی شاعری میں بھی غالب کو امتیازی حیثیت کا مالک قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک غالب کا درجہ حافظ کے بعد ہے بالخصوص غزل میں۔۔۔۔

"اتنی حسین غزلیں حافظ کے بعد صرف غالب نے کہی ہیں اور آج تک کوئی اور شاعر اس کیفیت ونشاط ،لطف وسرور کو الفاظ میں اتنی شدت اور حسن کا اسیر نہیں کر سکا"۔ 104

2۔۔۔۔سردار جعفری نے غالب کو شیکسپیئر کا ہم پلہ قرار دیا ہے کہ ان کے کلام میں اتنی وسعت اور تہہ داری ہوتی ہے کہ ان کا ایک ایک مصرعہ ہزار مواقع پر ہزار معنی پیدا کر سکتا ہے۔۔۔

3۔سردار جعفری، غالب سے اگر چہ ایک تعلق خاطر محسوس کرتے ہیں لیکن ان کے ہاں غالب پرستی نہیں۔ وہ نہایت معروضی انداز میں اور تنقید کے وزن ووقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے غالب کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ لیتے ہیں۔

4۔سردار جعفری اس نکتہ پر زور دیتے ہیں کہ غالب کے ہاں خوشی اور غم کے جذبات کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں۔ گویا غالب نے غم کو نشاط اور نشاط کو غم میں تحلیل کر دیا۔

''غالب کے غم اتنے دلآویز ہیں کہ ان میں جو بھرپور نشاط کی کیفیت ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملے گی۔۔۔غالب کی شاعری میں غم ونشاط کو الگ الگ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ 105

5۔وہ (سردار جعفری) غالب کے سماجی حالات، ان کی ضرورتوں، ان کے مسائل اور مصائب، ان کی خوشیوں اور مسرتوں اور غموں اور دکھوں کو اہمیت دیتے ہیں اور انہی کے حوالے سے غالب کے کلام کی جہات کا تعین کرتے ہیں۔106

غزل سے متعلق سردار جعفری لکھتے ہیں:

''غزل غنائی اور داخلی شاعری کی معراج ہے۔اس لئے اس کے اشعار میں ذاتی جذبے اور سماجی اضطراب کے درمیان حد کھینچنا مشکل ہے''۔ 107

سردار جعفری کے کبیر، غالب، میر اور اقبال کی شاعری پر کئے گئے مطالعوں کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر شارب ردولوی نے بتایا کہ سردار جعفری نے اپنی تنقیدوں میں تخلیقی جمالیات، لسانی اقدار اور تہذیب اور انسانی دوستی کو ملحوظ رکھا ہے۔

پروفیسر شارب ردولوی نے ایک بہت اہم بات بھی بتلادی ہے کہ یہ مطالعہ تفہیم وتعبیر شعر کے معیار کا بھی تعین کرتے ہیں:

''سردار جعفری کے ان مطالعوں میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے ان میں کسی طرح کی نظریہ سازی سے کام نہیں لیا۔انہوں نے سارے کام میں تخلیقی جمالیات، لسانی اقدار اور تہذیب کو سامنے رکھا ہے۔اس لئے یہ مطالعے صرف کبیر، میر، غالب اور اقبال کی ہی تفہیم میں مدد نہیں کرتے بلکہ بنیادی طور پر تفہیم وتعبیر شعر کے معیار کا تعین کرتے ہیں''۔108

ایک دوسرے مضمون میں شارب ردولوی نے سردار جعفری کے کبیر، میرابائی، میر اور غالب اور اقبال پر کئے گئے مطالعوں کی ستائش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سردار جعفری نے شاعری کے علاوہ اردو تنقید میں بھی اپنے لئے ایک منفرد مقام بنایا ہے۔''ترقی پسند ادب'' کی اشاعت کے بعد اس کے بعض حصوں پر شدید اعتراضات ہوئے اور بہت دنوں تک بلکہ آج بھی جب کسی کو ان کے خلاف لکھنا ہوتا ہے تو ترقی پسند ادب کے حوالے سے ہی گفتگو کرتا ہے لیکن کبیر، میرابائی، میر اور غالب کے انتخاب اور ان کے مقدمات نے ہر شخص کو ان کی تنقیدی بصیرت، کلاسیکی آگہی اور ادبی دروں بینی کا قائل کر دیا ہے۔دوسرے اس کام نے کلاسیکی شعر وادب کے بارے میں ترقی پسند ناقدین کے رویے کو بھی واضح کیا اور اس بدگمانی کو دور کیا کہ ترقی پسند قدیم شاعری، غزل اور تصوف کو رجعت پسندی اور زندگی سے فرار قرار دیتے ہیں۔سردار جعفری نے ان شاعروں کا جس طرح تجزیہ کیا، اسے اردو میں ایک اچھے سماجیاتی مطالعے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔سردار جعفری نے جن شعراء کا انتخاب کیا، ان کا اگر مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ ان سب میں اور سردار جعفری کے نظریات میں ایک قدر مشترک ہے۔اس لئے کہ کبیر ہوں، میرا ہوں یا میر اور غالب، ان

سب کے یہاں ایک وسیع انسان دوستی کا تصور، محبت اور زندگی سے پیار اور برائیوں اور زاہد و ناصح، شیخ و برہمن کی پر تصنع مذہبیت سے بیزاری قدر اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ غالب کہتے تھے کہ جی چاہتا ہے کہ ایک شطرنجی، سوت کی ڈوری اور لوٹا لے کر ایسی جگہ نکل جاؤں جہاں کوئی بھوکا ننگا نہ دکھائی دے اور سردار جعفری اسی کے مداوے کے لئے ''ہر شام سیہ'' کو ''صبح نو'' میں بدلنے کی کوشش کرتے رہے۔ کبیر، میرا اور غالب کے بعد انہوں نے اقبال شناسی کا جو کام کیا وہ بھی تاریخ ساز کام ہے۔ یہ کام انہوں نے اس وقت کیا جب اقبال کا نام برصغیر کی سیاست میں ہندوستان کے لئے ''ناپسندیدہ'' قرار پا چکا تھا۔ سردار جعفری نے اپنے مضامین کے ذریعہ ان بدگمانیوں کو دور کیا اور ترقی پسند نقطہ نظر سے فکر اقبال اور کلام اقبال کا تجزیہ کر کے اقبال شناسی میں نئی جہتوں کا اضافہ کیا۔ اسی لئے اردو تنقید ہو یا شاعری اپنی فکری بصیرت اور اپنے شعری اسلوب کی وجہ سے ادبی تاریخ میں ہمیشہ انہیں ایک منفرد مقام حاصل رہے گا۔ 109

علی سردار جعفری نے جہاں ماضی کے ادبی ورثے کی قدر کی وہیں روح عصر کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے سردار جعفری کی تصنیف پیغمبران سخن اور ان کے شعری مجموعے ''پتھر کی دیوار'' کے حرف اول سے اس بات کو پیش کیا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''ادیب کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ماحول، وراثت اور سرشت یہ تینوں عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک ہی نظریہ کے حامی شاعر بھی ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ سردار جعفری نے ماضی کے ادبی ورثے کو نہ صرف یہ کہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے بلکہ کبیر، میرا، غالب اور میر کی سطح پر اس کی بازیافت کی کوشش بھی کی ہے لیکن آج اور کل کی شعری حقیقتوں کا تذکرہ ''پتھر کی دیوار'' کے حرف اول میں انہوں نے ایک طرح کے ہیجانی انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہر شاعر کی شاعری وقتی ہوتی ہے ممکن ہے کہ کوئی اور اسے نہ مانے لیکن میں اپنی جگہ یہی سمجھتا ہوں اگر ہم اگلے وقتوں کا راگ الاپیں گے تو بے سرے ہو جائیں گے۔ آنے والے زمانے کا راگ جو بھی ہوگا وہ آنے والی نسلیں گائیں گی ہم تو آج ہی کا راگ چھیڑ سکتے ہیں''۔

پھر آگے چل کر دوسرے ہی سانس میں وہ یہ بھی کہتے ہیں:

''آج کی حقیقت کی کوکھ سے کل کی حقیقت پیدا ہو رہی ہے۔ کل کے عہد کی رگوں میں آج کے عہد کے خون کے کچھ نہ کچھ قطرے ضرور ہوں گے۔ اس کے اعتبار اور تناسب سے آج کے شاعر کے نغموں میں کل کی کچھ دیر پا قدریں پائی جائیں گی''۔

لیکن گھوم پھر کر ان کا سارا زور پھر روح عصر پر ہی ہوتا ہے اور ہنگامی ادب ان کے نزدیک روح عصر قرار پاتا ہے:

''اس تبدیل ہوتی ہوئی کائنات میں جہاں ہر چیز وجود میں آ کر عدم میں کھو جاتی ہے ابدی چیز کیا ہو سکتی ہے۔ اس لئے میں شاعری میں آج کی حقیقت یا روح عصر کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں''۔ 110

(گجرات اردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر، صفحہ 94,95)

ادب میں تسلسل کا عمل، نیا تخلیقی عمل اور ماضی

ادب میں تسلسل کا عمل، نیا تخلیقی عمل اور ماضی میں تعلق کو علی سردار جعفری نے پریم چند کی مثال سے واضح کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

''آج جو نقاد پریم چند کی عصری معنویت سے انکار کر رہے ہیں وہ ادب میں تسلسل کے عمل سے بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ ادب اور تہذیب میں نیا تخلیقی عمل ماضی کی معنویت کا ضامن ہوتا ہے''۔ 111

خالد علوی لکھتے ہیں:

''سردار جعفری نے ترقی پسند نقادوں کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلاتے ہوئے قدیم ادبی سرمائے سے انحراف نہ کرتے ہوئے ماضی کے پتھروں سے ان سرچشموں کو ڈھونڈ نکالنے کی بات کہی جن سے صدیوں تک ہمارے کشت ادب کی آبیاری ہوئی''۔112

پروفیسر نظیر صدیقی نے سردار جعفری کی تنقیدی تصانیف ''ترقی پسند ادب'' اور ''پیغمبران سخن'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سردار جعفری کے دل و دماغ پر اشتراکیت بحیثیت ایک سیاسی جماعت کے اس حد تک حاوی ہوگئی کہ وہ اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں مجروح سلطان پوری کی اس قسم کی شاعری کو سراہے بغیر نہ رہ سکے جس میں مجروح، لینن کے پیغام کی جئے ہو، اسٹالن کے نام کی جئے ہو، یہ بھی ہٹلر کا ہے چیلا، مار لے ساتھی جانے نہ پائے، قسم کے شعر کہنے لگے تھے۔ میں نے (نظیر صدیقی) اپنے کسی مضمون میں مجروح کے ہاں صحیح قسم کی شاعرانہ صلاحیت کی تعریف کرتے ہوئے اشتراکی نعرہ بازی والی شاعری کی مذمت بھی کی تھی۔ 1963ء میں جب میرے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ''تاثرات و تعصّبات'' چھپا تو نہ جانے کس طرح اس کی ایک جلد بمبئی ترقی پسند حلقے میں پہنچ گئی اور مجروح کی نظر سے گذری۔ مجروح نے میری کتاب پڑھ کر مجھے ایک نیازمندانہ خط لکھا اور اپنی اس شاعری پر جسے میں رد کر چکا تھا، بڑی شرمندگی کا اظہار کیا اور اس کی ذمہ داری سردار جعفری کی غلط حوصلہ افزائی پر رکھی''۔۔۔۔

نثر میں ان کی کتاب کبیر، میر اور غالب مدتوں زندہ رہنے والی کتاب ہے۔'' 113

پیغمبران سخن میں شامل مقدمات پر مختلف ادیبوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ مظہر امام نے انہیں عالمانہ مقدمات قرار دیا اور سردار جعفری کی کلاسیکی روایات، تصوف وغیرہ پر ان کی گہری نظر اور شعر فہمی کی غیر معمولی صلاحیت کی ستائش کی:

''سردار جعفری نے کبیر (کبیر بانی)، میرا بائی (پریم وانی) اور میر کے انتخابات اسی طرح دونوں رسم خط میں شائع کئے۔ ان سب پر انہوں نے بڑے دلکش انداز میں عالمانہ مقدمے لکھے جو کلاسیکی روایت، تصوف اور مابعد الطبیعات پر ان کی گہری نظر اور شعر فہمی کی غیر معمولی صلاحیت پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔ یہ چاروں دیباچے بعد میں ''پیغمبران سخن'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ یہ انتخابات ہندی اور اردو قاری کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں معاون

ہوئے"۔ 114

پروفیسر کوپی چند نارنگ نے ان مقدمات میں سردار جعفری کی تنقید کی ستائش کی:

"سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے زبردست مبلغوں میں ہیں۔انہوں نے مضامین اور تحریروں کے ذریعے ترقی پسند نقطہ نظر کو عام کیا اور ادب کو ان کے ذریعہ پرکھنے کی کوشش کی۔ان کی بعض تحریریں تحریک میں زبردست اعتراض اور بحث کا موضوع بنیں۔قدیم ادب، کلاسیکی ادبی قدروں اور ترقی پسندی کے مفہوم کے بارے میں ان کے رویے پر شدید اعتراضات ہوئے ہیں جو وقتی جوش اور انقلاب کی جذباتی تاویل کا نتیجہ تھا لیکن ان کی تنقید کی اہمیت ان کے مضامین یا ترقی پسند تحریک کی تاریخ نہیں بلکہ کبیر بانی، میر اور دیوان غالب میں دیباچے کی شکل میں شامل ان کے مضامین اور ان کے بعد کے دوسرے مضامین سے ہے جو یقیناً اردو تنقید میں کلاسیکی ادب کے تجزیے کے ترقی پسند معیار کو پیش کرتے ہیں"۔ 115

سرمایہ سخن (جلد اول)

سردار جعفری کی کتاب "سرمایہ سخن" جلد اول جولائی 2001 میں مکتبہ جامعہ نے شائع کی۔اس کے مشمولات پیش گفتار دیباچہ (پہلا حصہ دسمبر 1969 کا تحریر کردہ اور دوسرا حصہ مئی 1996 کے بعد کا تحری کردہ اور ان کے علاوہ تیسرا حصہ بھی موجود ہے)، ذوق جمال لحن داؤدی "مقبول استعاروں کا خزانہ" ہیں۔

اس کے پیش گفتار میں سید شاہد مہدی نے لکھا ہے:

"اس کتاب کو مرتب کرنے کا خیال انہیں اس وقت آیا جب وہ مئی جون 1968ء میں علاج کے سلسلہ میں ایک ہسپتال میں داخل ہوئے۔کچھ دنوں بعد وہ گھر لوٹ آئے لیکن ڈاکٹروں نے دو تین مہینے آرام کی سخت ہدایت کی۔اس وقفہ کا استعمال انہوں نے "سرمایہ سخن" کے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کیا۔اپنی یادداشت کے سہارے ان تمام اشعار کو رفتہ رفتہ کاغذ پر منتقل کرنے لگے جو ذہن کے نہاں خانوں میں کہیں نہ کہیں موجود تھے۔اس اشعار میں محسوسات کی ایک دنیا آباد تھی۔گنجینۂ معنی کا طلسم ذہن و دل کو استعجاب اور غور فکر میں مبتلا کرنے کے لئے کافی تھا۔اسی دوران سردار جعفری کو اردو اشعار کی ایک لغت تیار کرنے کا خیال آیا تا کہ مستند اشعار کی لذت کو مخصوص سیاق و سباق میں سمجھنے کا موقع ملے۔اتفاق سے انہیں دو سال کے لئے جواہر لال نہرو فیلوشپ بھی مل گئی۔لہٰذا پہلی جنوری 1969ء کو اس لغت کا پہلا لفظ لکھا گیا۔بدقسمتی سے زندگی نے آخری لفظ لکھنے کا موقع نہیں دیا اور یہ کام ادھورا ہی رہ گیا۔سرمایہ سخن کی پہلی جلد مکمل کرنے کے بعد وہ دوسری جلد کی تیاری میں مصروف تھے اور تقریباً ڈیڑھ سو صفحے انہوں نے لکھ بھی لئے تھے لیکن افسوس کہ زندگی نے وفا نہیں کی اور ہم مکمل طور پر ایک عمدہ کام سے محروم رہ گئے"۔ 116

سرمایہ سخن پر تبصرہ کرتے ہوئے عمر رضا نے لکھا ہے:

1۔سرمایہ سخن ایک عمدہ اور بہت ہی کارآمد کتاب ہے جس میں کلاسیکی اور جدید شاعری کی فہم پیدا کرنے اور اس سے محظوظ ہونے کی ایک بامعنی کوشش کی گئی ہے دراصل یہ شاعری کی ایک ایسی لغت ہے جو لغت نویسی اور تذکرہ نگاری سے مختلف ہے۔اس کے ذریعہ سردار جعفری نے اردو شاعری کے اس ملکہ کو اجاگر کیا ہے جس میں ایک لفظ کو نا کوں معنی عطا کرنے کا ایسا

ہنر ہے جس کی کشش وقت گذرنے کے ساتھ مزید نکھرتی چلی جاتی ہے۔ 117

2۔دیباچے کے دوسرے حصہ میں جو کہ مئی 1996ء کے بعد تحریر کردہ ہے سردار جعفری نے سرمایۂ سخن کی اہمیت افادیت پر روشنی ڈالی ہے جس کے لئے پہلے تو اردو زبان کے شاعرانہ الفاظ، تراکیب اور امیجری یا پیکر تراشی کے خزانوں کا ذکر کیا ہے جو قدیم اور جدید شعرا کے تخئیل نے تراشا ہے۔اس کی تعداد کے متعلق سردار جعفری کا کہنا ہے کہ چار سے پانچ لاکھ تک جاسکتی ہے۔بقول ان کے اردو زبان کے پاس ایک خزانہ ہے جو پوری طرح دریافت نہیں کیا گیا ہے۔یہ ان جواہر پاروں سے بھرا پڑا ہے جنہیں شاعرانہ الفاظ اور تراکیب کہتے ہیں۔اردو شاعری کی امیجری (یہ الفاظ اساتذہ استعمال نہیں کرتے تھے) یا پیکر تراشی کی یہ نادر مثالیں ہیں۔ان کی تعداد کا کوئی صحیح اندازہ نہیں ہے جہاں تک میرا علم ہے اردو شاعری کی کوئی الگ لغت نہیں ہے۔ سرمایۂ سخن ایک مختصر لغت ہے۔ایک بڑے کام کی چھوٹی سی ابتداء۔اس میں تقریباً بیس ہزار الفاظ اور ترکیبیں چند شعراء کے منتخب کلام سے جمع کی گئی ہیں لیکن اگر پوری اردو شاعری سے انتخاب کیا جائے تو ان کی تعداد چار پانچ لاکھ تک پہنچ سکتی ہے۔ سردار جعفری نے قدیم اور جدید دونوں شاعری کے اشعار کا حوالہ دیا ہے اور شاعری میں علامات، تلمیحات، استعارات اور دیگر شعری وفنی لوازمات کی اہمیت واضح کی ہے جس سے ان کے شعری ذوق کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔۔۔۔ 118

سردار جعفری نے لکھا ہے:

''اس کتاب میں لغت نویسی کے آداب کی پوری پابندی نہیں کی گئی ہے کیونکہ یہ کسی فرہنگ نویس کی نہیں بلکہ ایک شاعر کی لکھی ہوئی لغت ہے جو اپنے ذوق سخن کے باہر نہیں نکل سکتا۔سرمایۂ سخن میں الفاظ اور تراکیب کو حرف تہجی کی ترتیب سے لکھا گیا ہے۔سیدھے سادھے معنی کے ساتھ اشعار سے مثالیں دی گئی ہیں اور حسب ضرورت ان کا مفہوم بیان کیا گیا ہے تاکہ قاری لطف اندوز ہوسکے۔پہلی منزل شعرفہمی ہے۔لطف اندوزی آگے کی منزل ہے۔جس طرح محبوب کے حسن کو بیان نہیں کیا جاسکتا اسی طرح شعرفہمی اور لطف اندوزی کو بھی بیان کرنا مشکل ہے۔شعر کی تقطیع کی جاسکتی ہے اور عروض کے رموز ونکات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔رعایت لفظی کو سمجھا جاسکتا ہے۔تشبیہ، استعارے اور کنایہ کے فرق کو ظاہر کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے بعد شعر کے معنی گذر کر حسن معنی تک پہنچنا ایک عمل ہے جس کے لئے ذہنی تربیت ضروری ہے۔اس تربیت کا بس ایک ہی طریقہ ہے۔ اساتذہ کا اگر ہزاروں نہیں تو سینکڑوں اشعار کا ورد۔ 119

سردار جعفری کی شعری وفکری اظہار میں ہوئی تبدیلی پر اشارہ کرتے ہوئے عمر رضا رقمطراز ہیں:

''سردار جعفری نے مختلف قدیم وجدید شعرا کے اشعار میں مستعمل تشبیہات، تراکیب، پیکر تراشی اور دیگر شعری خصوصیات پر جو خامہ فرسائی کی ہے، یقیناً قابل غور ہے جس سے سردار جعفری کی شعری وفکری اظہار میں تبدیلی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کیونکہ وہ شخص جو کبھی صرف موضوع اور مواد کے پیچھے بھاگا کرتا تھا، اب وہ شعر کے فنی، لفظی، صناعی اور دیگر شعری خصوصیات پر بے حد دلنشین اور خوبصورت انداز میں گفتگو کرتا نظر آتا ہے۔

سرمایۂ سخن کے دیباچے کے آخری جملے بھی غور طلب ہیں جو سردار جعفری کی شعری جمالیات پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں:

''اردو شاعری اور خاص طور سے غزل کے استعاراتی نظام کو مغرب کی یلغار کے زیر اثر گل وبلبل کی شاعری کہہ کر حقیر قرار

دینے کا رویہ تقریباً سو سال سے جاری ہے۔ یہ الفاظ کلیشے بھی ہیں اور اہم تخلیقی سہارے بھی۔ یہ تخئیل کو مہمیز بھی کرتے ہیں اور فکر کے پیروں میں زنجیریں بھی ڈال دیتے ہیں۔ غالب اور میر کے ہاتھ میں گنجینۂ معنی ہیں اور کمتر شاعروں کے ہاتھ میں کھوکھلے الفاظ۔ ان کی تعداد ایک ہزار کے اندر ہوگی لیکن تلازمات کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ اگر انگریزی زبان کے چھبیس حروف میں پورا شیکسپیئر لکھا جا سکتا ہے تو ایک ہزار مقررہ استعاروں میں ایک پوری کائنات کو سمیٹا جا سکتا ہے لیکن انسانی ذہن و فکر اس پر اکتفا کرنے پر تیار نہیں ہے۔ اس کا نعرہ "ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب"۔ اس استعاراتی نظام سے باہر نکل کر ایک اور استعاراتی دنیا کی تخلیق کی دعوت دیتا ہے۔ یہ ہماری نئی شاعری کی پیکر تراشی کا نظام ہے۔ اس لغت میں دونوں کی گنجائش نکالی گئی ہے۔ چونکہ کلاسیکی خزانہ زیادہ بڑا ہے اس لئے اس کے الفاظ زیادہ ہیں۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ جدید ذہن اور مزاج آہستہ آہستہ اس سے نا آشنا ہوتا جا رہا ہے۔ سرمایۂ سخن اس سرمایہ کی حفاظت کی ایک چھوٹی سی کوشش ہے"۔ 120

سردار جعفری نے "مقبول استعاروں کا خزانہ" کے تحت میر، سودا، مصحفی، غالب، مرزا ثاقب لکھنوی، آتش، ناسخ، حالی، اقبال، جگر، حسرت، مجاز، مجروح، جانثار اختر اور خود اپنے متعدد اشعار میں پائے جانے والے تقریباً دو سو سے زائد استعاروں کو پہلے تو یکجا کیا ہے، اس کے بعد ہر ایک شعری استعمال کی وضاحت کے لئے اشعار بھی پیش کئے ہیں جس سے استعاروں کی اہمیت و افادیت اور ان سے لطف اندوز ہونے کے عمل سے بخوبی واقفیت ہوتی ہے۔ گل، گلستاں، گلزار، گل چیں، قمری، دشت، بیاباں، جرس، دریا، ساحل، گرداب، ناخدا، صبا، شراب، میکدہ، پیر مغاں، فانوس، چراغ، شعلہ، پیراہن، آرسی، خورشید، ستارے، قوس قزح، شفق، جنت، کوثر اور تسنیم وغیرہ۔

سرمایۂ سخن کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے عمر رضا لکھتے ہیں:

سرمایۂ سخن سردار جعفری کی فنکارانہ شخصیت کے لسانی، تجرباتی اور معنی خیز ذہن کا عملی ثبوت پیش کرتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کتاب کے اصل سرمایہ ضمیمہ سے قبل سردار جعفری کی جو مختصر مختصر تحریریں بالترتیب بعنوان دیباچہ، ذوق جمال، لحن داؤدی، مقبول استعاروں کا خزانہ اور استفادہ شامل کتاب ہیں۔ اس سے سردار جعفری کے شعری و فکری اظہار میں ہوئی تبدیلیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ 1960 سے 1980 کے دوران جبکہ 'جدیدیت' کی لہر نے ادبی دنیا کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا، اس زمانہ میں اگرچہ وہ فکری اور نظریاتی اعتبار سے قدرے تذبذب کا شکار ہوئے جس میں انہوں نے بہت سے ادبی و فکری سمجھوتے بھی کئے لیکن اسّی کی دہائی میں انہوں نے ایک ایسا نظریہ ادب ضرور قائم کر لیا تھا جس میں اعتدال و توازن کو اہمیت حاصل ہوئی۔ اس نئے نظریہ شعر و ادب میں سردار جعفری کا وہ بنیادی ادبی نظریہ جس کی اساس مارکسزم ہے، قطعی متزلزل نہیں ہوا۔ البتہ اس کی شدت اور انتہا پسندی یا پھر یہ کہہ لیں کہ ادعائیت پر ضرور حرف آیا۔ لہٰذا اب سردار جعفری کے ادبی نقطہ نظر میں اعتدال، توازن، نرم لب و لہجہ اور جلال و جمال میں ایک خاص قسم کا توازن پایا جانے لگا تھا جس کی توسیع 1980ء کے بعد کی شعری و نثری تخلیقات میں بھی نظر آتی ہے۔ بالخصوص "سرمایۂ سخن" میں شامل ذوق جمال، اور لحن داؤدی کے زیر عنوان تحریروں سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس میں مارکسزم، اجتماعیت اور خارجیت کے ساتھ ساتھ انفرادیت اور داخلیت کو بھی اہمیت حاصل ہے"۔ 121

سردار جعفری کا تنقیدی مضمون ''ذوق جمال'' افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991 میں شائع ہوا۔ سردار جعفری نے لکھا ہے کہ آرٹ اور ادب کا استعمال انسان نے ہمیشہ حقیقت کو بدلنے کے لئے کیا ہے۔ یہ ادب کا سماجی کردار ہے اور جب کبھی ادب سے اس کا یہ سماجی کردار چھیننے کی کوشش کی گئی، اس نے اپنا حسن اور زور کھودیا۔ سردار جعفری نے بتایا کہ ادب حقیقت کو بدلتا ضرور ہے لیکن خارجی فطرت اور ماحول پر براہ راست اثر انداز نہیں ہوتا، جذبات و احساسات سے نئی نئی تصویریں بناتا ہے، پہلے انسانوں کے جذبات پر اثر انداز ہوتا ہے اور انسان میں داخلی تبدیلی پیدا کرتا ہے اور پھر انسان کے ذریعہ سے ماحول اور سماج کو تبدیل کرتا ہے۔ وہ انسان کو بہتر انسان بناتا ہے۔ اسے طاقت اور ہمت عطا کرتا ہے۔ اس طرح ادب کا براہ راست تعلق انسان کے جذبات سے ہے۔ سردار جعفری کے مطابق ادب کا سب سے بڑا کام انسان کے جذبات کو منظم کر کے نئے سانچے میں ڈھالنا ہے۔

ذوق جمال اور اس کے سماجی اور تہذیبی ماحول پر بحث کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

1۔ ''شعور کی تبدیلی اور ہمارے احساس حسن اور ذوق جمال پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور جمالیاتی قدریں بدل جاتی ہیں۔ دراصل احساس حسن اور ذوق جمال شعور کی ایک قسم ہے جو زباں مکاں کی قیود سے آزاد نہیں ہے۔ سماجی کشمکش اور زندگی کی جدوجہد کے ساتھ اس کا تاریخی ارتقاء ہوا ہے۔ کوئی انسان ماں کے پیٹ سے کوئی مخصوص ذوق لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے اعصاب میں محسوس کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو خود صدیوں کے ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ یہ صلاحیت ترقی کر کے ذوق اس وقت بنتی ہے جب وہ تاریخی حالات کے دائرے میں زندگی اور سماج کے حقائق سے دوچار ہوتی ہے۔۔۔۔''

2۔ ''ذوق جمال کا فرق تہذیب تمدن کی مختلف سطحوں پر نظر آتا ہے جو سماجی ماحول کے ساتھ بدلتی ہیں۔ ہم موٹے طریقہ سے انسانی تہذیب کے چار دور قرار دے سکتے ہیں جو ذرائع پیداوار، طریق پیداوار اور سماجی تنظیم کے چار دور ہیں اور ہر دور اپنے ساتھ اپنا مخصوص نظام سیاست، اخلاقیات، آرٹ اور ادب لے کر آیا ہے۔ ابتدائی قبائلی دور کے بعد جب انسان طبقوں میں تقسیم نہیں تھا، غلام داری کا دور آیا جس میں انسانیت آقاؤں اور غلاموں میں بٹ گئی۔ (ہندوستان میں اس کی شکل یونانی شکل سے مختلف تھی)۔ پھر جاگیرداری کا دور آیا اور انسانیت جاگیردار اور کسان میں تقسیم ہوگئی۔ (اس کی بھی شکل ہندوستان میں یوروپ سے کسی قدر مختلف تھی)۔ تیسرا دور سرمایہ داری کا ہے جس میں سرمایہ دار اور مزدور متضاد طبقے ہیں۔ اب انسانیت اور سماج اپنی تہذیب کے چوتھے دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ جب طبقات کی تقسیم ختم ہو رہی ہے اور ایک متحدہ منظم انسانیت پیدا ہو رہی ہے۔ ہر دور کا اپنا اپنا ذوق جمال ہے۔ یہاں ایک غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے جسے دور کر دینا ضروری ہے۔ ایک دور اور دوسرے دور کے ذوق جمال میں فرق ضرور ہوتا ہے لیکن دونوں کے درمیان لوہے کی دیوار نہیں کھڑی ہوتی۔ ہر دور کا ذوق جمال پچھلے دور کی بہترین قدروں کا حامل ہوتا ہے اور ان میں نئے اضافے کرتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یکساں سماجی اور تہذیبی ماحول کے تمام انسانوں کا ذوق جمال یکساں ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ کسی ایک سماجی اور تہذیبی ماحول کے انسانوں کا ذوق جمال مجموعی اعتبار سے یکساں کہا جا سکتا ہے لیکن اس میں بھی ہر شخص کے احساس اور ذوق کی انفرادی خصوصیات الگ الگ ہوں گی۔

تہذیب وتمدن کی ایک سطح پر بھی ایسے دو آدمی نہیں ملیں گے جن کے جمالیاتی احساسات یکساں ہوں۔سماجی مخلوق کی حیثیت سے ہر فرد ماحول کے مختلف عناصر (Factors) کا ڈھالا ہوا ہے جو برابر ایک دوسرے کو کاٹتے رہتے ہیں اور آپس میں خلط ملط ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح وہ ہر انسان کے احساس کو مختلف شکلوں میں ڈھالتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کا اپنا انفرادی ذوق ہوتا ہے"۔ 122

سردار جعفری کا لکھا "لحن داؤدی" سہ ماہی گفتگو شمارہ 3 (1967) اداریے پر مشتمل ہے۔

اس کا جائزہ لیتے ہوئے عمر رضا قمطراز ہیں:

"اس طرح یہ فکر بھی ستر کی دہائی کی ہے۔اس کے ذریعہ انہوں نے اپنے مخصوص شعری وادبی نقطہ نگاہ کی مزید وضاحت کی ہے جس میں انتہا پسندی یا ادعائیت کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ ستر کی دہائی میں سردار جعفری نے جلال اور جمال میں جس طرح کا توازن برقرار رکھنے کی سعی کی تھی، یہ مضمون اسی کی توسیع کرتا نظر آتا ہے۔اگر چہ بنیادی نظریہ وہی ہے جو انہوں نے "ترقی پسند ادب" میں پیش کیا تھا لیکن یہاں اس کی شکل قدرے بدلی ہوئی ہے۔اس میں سردار جعفری نے شاعری کو بنیادی طور پر گانے، سننے اور سنانے کی چیز سے تعبیر کیا ہے اور شروع ہی میں شاعری کو "لحن داؤدی" کہا ہے۔اس کے لئے انہوں نے زمانہ قبل از تاریخ سے لے کر دور جدید تک کا حوالہ دیا ہے۔مثلاً زمانہ قبل از تاریخ کے دھندلکوں میں انسان نے شعر لکھنے کے بجائے بولنا اور گانا شروع کیا۔قدیم ترین الحانی صحیفوں وید، مہابھارت، ژنداوستھا اور انجیل وغیرہ کی زبان یا تو شاعری ہے یا شاعری کا درجہ رکھتی ہے اور صحیفے بھی بولے یا گائے جاتے تھے۔علاوہ ازیں ہومر کی نظم ساز پر گائے جانے، فردوسی کے شاہنامے کو محفلوں میں سنانے، کالی داس کی شکنتلا، شیکسپیئر کے ڈرامے رومیو جولیٹ، اوتھیلو، میک بتھ، ہیملٹ، مرچنٹ آف وینس کو اسٹیج کے ذریعہ جس طرح پیش کیا گیا، اس کا بھی ذکر کیا ہے۔رومی اور عطار کے کلام، حافظ اور سعدی کی غزلوں کے بارے میں بھی انہوں نے لکھا ہے کہ "انہوں نے دلوں میں پہلے گھر کیا، کاغذ پر بعد میں منتقل کی گئیں۔(سرمایہ سخن صفحہ 66)۔علاوہ ازیں سردار جعفری نے ہندی اور اردو کی روایت سے بھی مثالیں دی ہیں۔مثلاً ہندی میں کبیر، میرابائی، سورداس اور تلسی داس کی شاعری پہلے کروڑوں انسانوں تک صرف سننے سنانے سے پہنچی۔اردو کے بیشتر شعرا صاحب دیوان بننے سے قبل مشاعروں میں سند حاصل کرتے تھے۔مثلاً میر، غالب، انیس اور دبیر، داغ، امیر مینائی، اقبال، حفیظ جالندھری، جگر مرادآبادی اور فراق گورکھپوری وغیرہ۔دراصل ان تمام باتوں کو پیش کر کے سردار جعفری یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شاعری کا رشتہ جب تک عام انسانوں اور زندگی سے نہیں ہوگا تب تک وہ معیاری یا قابل قبول نہیں ہوگی۔اس ضمن میں انہوں نے سہل ممتنع کو عظیم شاعری سے تعبیر کیا ہے۔مشاعروں کی مخالفت کرنے والوں انحطاطی قرار دیا ہے جس سے نئے شاعروں کو کافی نقصان پہنچتا ہے۔اب سردار جعفری ایسی شاعری کی بات کرتے ہیں جس میں اعتدال ہو، توازن ہو اور اس کا لب ولہجہ شیریں، نرم اور مدھم ہو جو بلاشبہ روایت اور جدت کی ہم آہنگی اور انفرادیت واجتماعیت کی ملی جلی کیفیت سے عبارت ہو"۔ 123

جذبات اور شعور کے تعلق کے بارے میں سردار جعفری لکھتے ہیں:

1۔"جذبات کو دل سے منسوب کیا جاتا ہے اور شعور کو دماغ سے۔۔۔"

2۔ ''شعور کے بغیر جذبہ محض جبلت رہ جاتا ہے اور انسانیت حیوانیت بن جاتی ہے۔۔۔۔''

3۔ ''شبلی نے اپنی شاندار تصنیف ''شعرالعجم'' میں ایک بڑا اچھا اور مفید نکتہ پیدا کیا ہے کہ شعر کا لفظ شعور سے بنا ہے۔ غرض ادب میں شعور کی اہمیت کسی طرح جذبات سے کم نہیں ہے۔اس لئے ادب جذبات ہی کی نہیں انسانی شعور کی بھی تنظیم کرتا ہے اور اسے بدلتا ہے''۔

4۔ ''جذبے کے شعور کے بغیر گہرائی پیدا ہو ہی نہیں سکتی اور جذبے کی گہرائی کے بغیر ادب، ادب نہیں رہ سکتا۔جذبہ خود شعور کی شدت سے پیدا ہوتا ہے۔تخئیل بھی شعور کا محتاج ہے۔جذبے کی شدت اور گہرائی میں شعور کی شدت اور گہرائی جھلکتی ہے لیکن کبھی کبھی جذبہ غلط بھی ہوتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی رچا ہوا اور شدید کیوں نہ معلوم ہو۔اس کی یہ شدت، جو جھوٹی شدت ہوتی ہے دراصل ہیجان ہے جو شعور کی خامی کا نتیجہ ہے۔آرٹ اور ادب میں شعور کی یہ خامی جذبے کی ''گہرائی'' اور ''شدت'' کے نام پر معاف نہیں کی جاسکتی۔دراصل جذبے اور ہیجان میں فرق کرنا ضروری ہے۔شعور وہ کسوٹی ہے جس پر سچے جذبے اور جھوٹے جذبے کو پرکھا اور ہیجان کو پہچانا جاسکتا ہے۔۔۔۔''

5۔ ''شعور کو تاریخ اور ماحول سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔اس کا تاریخی ارتقاء ہوا ہے اور وہ تغیر کی بہت سی منزلوں سے گذرا ہے اور گذر رہا ہے۔ہر چیز کی طرح انسانی سماج کے ساتھ ساتھ شعور بھی بدلتا ہے اور جذبات بھی۔انسانی فطرت ازلی اور ابدی نہیں ہے۔شعور اور جذبات بھی ازلی اور ابدی نہیں ہیں۔تغیر اور تبدیلی ناگزیر ہے۔یہ ارتقاء کا عمل ہے جس نے غاروں میں بسنے والے درندے کو انسان بنایا ہے۔اس لئے شعور کی تبدیلی انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔اگر شعور ناپختہ ہے تو اسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے''۔ 124

سرمایہ سخن پر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی کا تبصرہ آج کل اکتوبر 2001ء میں شائع ہوا ہے۔

اس کا اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''سردار جعفری نے شاعری کو انسانی فطرت اور انسانی تہذیب کا جزو لاینفک قرار دیتے ہوئے اس کی تاریخ اور تفصیل پیش کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ الہامی کیفیت ہے جس سے شاعر دوچار ہوتا ہے۔انہوں نے اردو شاعری خصوصاً اردو غزل کی خصوصیات کو اجاگر کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے اردو زبان اور اردو شاعری میں جو خصوصیت پائی جاتی ہے وہ دنیا کی دیگر زبانوں میں عنقا ہے۔اس طرح جو لوگ اردو زبان کو ہندوستانی شیلی میں لکھنے کی بات کرتے ہیں ان کا حتمی جواب بھی دے دیا ہے ایسا کرنے سے اردو زبان کی اپنی خصوصیت مجروح ہو جائے گی اور اس کی شناخت بھی باقی نہیں رہے گی۔ضمیمہ میں انہوں نے میر، غالب سے لے کر اقبال اور تمام دوسرے مشہور شعرا کے اشعار کی جمالیاتی تشریح پیش کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ ذوق جمال اس شاعری کو سمجھنے اور لطف اندوز ہونے کا واحد ذریعہ ہے۔اپنی نوعیت کی یہ پہلی کوشش ہے جس میں ذوق جمال کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ 125

محمد اجمل خان نے سردار جعفری کی کتاب سرمایہ سخن کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اس کی اہمیت پر اظہار خیال کیا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

1۔''اس کے ذریعہ ان کے (سردار جعفری) مطالعہ ان کی زبان کے بارے میں معلومات، تجزیہ کرنے کا انداز، ایک ٹھہرے ہوئے اور سلجھے ہوئے ذہن کی عکاسی اور مدلل انداز بیان پر روشنی پڑتی ہے۔۔۔۔1960 سے 1980 کے درمیان وہ ادب کے نئے رجحانات سے متاثر ہوئے تھے جس کے تحت انہوں نے کئی ادبی اور فکری تبدیلیاں کیں لیکن اسّی کی دہائی میں انہوں نے ایک ایسا ادبی نظریہ مستحکم کرلیا تھا جو معتدل اور متوازن تھا۔ان کے بنیادی نظریات جو ترقی پسند رجحانات یا مارکسزم پر مبنی تھے، بدستور ویسے ہی رہے لیکن ان کی شدت اور انتہا پسندی سے سردار جعفری نے اپنے آپ کو الگ کرلیا تھا اور مارکسزم کے حامی ہونے کے باوجود انہوں نے کلاسیکی شاعری کی طرف رجوع کیا۔ایک ترقی پسند ادیب اور نقاد ہونے کے باوجود سرمایہ سخن میں سردار جعفری نے کہیں اپنے مارکسی نظریہ کو آڑے نہیں آنے دیا۔اس کتاب میں وہ ایک ماہر زبان کے طور پر دکھائی دیتے ہیں جنہیں شعری الفاظ کی نزاکتوں اور ان کی باریکیوں کا بخوبی علم ہے۔اس کے علاوہ تخلیقی زبان کا وہ ایک خاص تصور بھی رکھتے ہیں کہ کوئی بھی لفظ جب شاعری میں اپنی جگہ بناتا ہے تو وہ مروجہ معنی کے برخلاف ایک تازہ معنی کا انکشاف کرتا ہے''۔126

2۔''اس سے (سرمایہ سخن) شعرفہمی میں یقیناً مدد ملے گی۔اس میں وہ ایک ماہر لسانیات کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے شعری اصطلاحوں اور محاوروں کے معنی دیئے ہیں اس کے بعد ایک ہی اصطلاح کی کئی شعراء کے اشعار کے ذریعے مثالیں دی ہیں کہ مختلف شعراء نے ان ہی الفاظ کو کس کس طرح برتا ہے اور اس سے معنی کی کون کون سی جہتیں نمایاں ہوئی ہیں کیونکہ ہر شاعر کا رنگ، اسلوب، نقطہ نظر اور چیزوں کو سمجھنے کا ایک الگ نظریہ ہوتا ہے جو اس کے اشعار سے مترشح ہوتا ہے۔اس لئے ایک ہی لفظ مختلف شعراء کے معنی کے مختلف جواز نمایاں کرتا ہے''۔ 127

پروفیسر محمد حسن نے سردار جعفری دوروزہ قومی سمینار شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی منعقدہ 25/ 26/نومبر 2000 میں اپنے خطبہ صدارت میں سردار جعفری کی کتاب سرمایہ سخن کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

''انہوں (سردار جعفری) نے ان الفاظ کی لغت تیار کرنا شروع کی جو اردو شاعری میں بہت مقبول اور مروج رہے ہیں لیکن ہر دور میں ان میں معنوی اور تلمیحی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں مثلاً رقیب کا لفظ رائج تو ہوا تھا محبوب کے ساتھ مگر اس کا استعمال مختلف مرحلوں سے گذرا، حد یہ ہے کہ فیض کے ہاں بالکل ہی مختلف معنوں میں برتا گیا۔یہی حال محتسب کا ہوا، یہی تبدیلی شراب شیشہ و پیمانہ کے معنوں میں ہوئی۔سردار جعفری اس کام کو پورا نہ کرسکے لیکن جتنا کچھ انہوں نے لکھا واقعی بصیرت افروز ہے''۔ 128

مرتبہ دواوین

علی سردار جعفری نے غالب، میر، کبیر اور میرابائی کے دواوین مرتب کئے۔ان دواوین کے بارے میں ڈاکٹر صاحب علی نے ایک مضمون ''علی سردار جعفری کے مرتبہ کلاسیکی دواوین'' لکھا۔اس کے کچھ اقتباسات پیش کئے جارہے ہیں جن سے سردار جعفری کی تنقید پر روشنی پڑتی ہے۔

ملاحظہ کیجئے:

1۔''دیوان غالبؔ جولائی 1958 میں شائع ہوا۔یہ دیوان بیک وقت دو زبانوں اردو دیوناگری رسم الخط میں چھپا

ہے۔کتاب کا ایک صفحہ اردو زبان میں ہے تو دوسرا دیوناگری میں۔اردو اور ہندی بولنے پڑھنے اور لکھنے والوں کے درمیان یگانگت، ہم آہنگی پیدا کرنے اور مرزا غالب کو غیر اردوداں سے تعارف کرانے کے مقصد سے سردار جعفری نے ''دیوان غالب'' مرتب کیا۔ بقول سردار جعفری ''خدا کرے اس دیوان کی اشاعت سے ہندی والوں اور اردو والوں کے دلوں میں محبت کے نئے پھول کھلیں اور ہمارے وطن اور ہماری زبان ان کی خوشبو سے مہک اٹھے''۔

2۔''علی سردار جعفری کے مزاج کی تعمیر و تشکیل میں کلاسیکی تہذیب و روایت اور معیار کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔اس لئے ان کے دل میں کلاسیکی شعر و ادب کے لئے ایک وقعت اور اہمیت موجزن تھی۔چنانچہ انہوں نے اہم کلاسیکی شعرا کے کلام کا مطالعہ بڑی کاوشوں اور دقت نظر سے کیا اور کلام میں کلاسیکی تہذیب و روایت اور تصوف کے وہ تمام عناصر ڈھونڈھ نکالنے میں کامیابی حاصل کی، جس سے شاعر کا کلام آفاقیت اور عالمگیریت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اور لوگوں کے ذوق کی تسکین کا باعث بنتا ہے''۔

3۔''سردار جعفری کا دوسرا منتخبہ کلاسیکی کام ''دیوان میرؔ'' ہے۔علی سردار جعفری نے اسے اردو اور دیوناگری رسم الخط میں ایک ساتھ شائع کیا تا کہ اردو اور ہندی والے اردو کے اس عظیم شاعر سے بخوبی واقف ہو سکیں۔دیوان میر کو ہندوستانی بک ٹرسٹ نے پہلی بار 1960ء میں شائع کیا۔علی سردار جعفری کا رقم کیا ہوا عالمانہ اور مبسوط دیباچہ 57 صفحات پر مشتمل ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے تحقیقی و تنقیدی ہے۔شاعری کے عنوان کے لئے (21) صفحات مختص کئے گئے ہیں۔ان صفحات میں علی سردار جعفری نے اپنے منتخبہ کلام ''دیوان میر'' کے حوالے سے میر کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔میر کا یہ کمال کم توجہ کا مستحق نہیں ہے کہ انہوں نے فنی نزاکتوں اور جذبہ خلوص سے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور ابتر معاشی حالات کو غزل جیسی طبع نازک صنف میں کہیں براہ راست اور کہیں غیر براہ راست انداز میں پرو دیا ہے۔جہاں راست انداز بیاں اختیار نہیں کیا ہے وہاں اپنے عہد کے مظالم اور انسانی شخصیت کی شکست و ریخت کو محبوب کے پردے میں بیان کیا ہے اور ایسے موقعوں پر میر نے محبوب کو بہت سخت و سست کہا ہے۔سردار جعفری کا یہ مرتبہ دیوان، میر کے کلام کا صرف انتخاب ہی نہیں ہے بلکہ ان کی زندگی اور شخصیت، ان کے عہد کے حالات و ماحول اور فن کا آئینہ بھی ہے''۔

4۔''سردار جعفری نے کبیر کی (128) نظموں (پدوں) کا انتخاب ''کبیر بانی'' کے نام سے کیا اور 1965ء میں شائع کروایا۔یہ کتاب بیک وقت اردو اور دیوناگری رسم الخط میں چھاپی گئی ہے یعنی ایک صفحہ اردو میں ہے تو دوسرا دیوناگری میں۔۔۔۔پہلا حصہ 64 صفحات پر مشتمل ایک طویل اور جامع دیباچہ ہے۔۔۔دوسرا کبیر کی (128) نظموں (پدوں) وغیرہ کا انتخاب اور ان کی مختصر تشریح ہے اور یہ سو صفحات پر محیط ہے۔حواشی کے ضمن میں (121) الفاظ کی شرح قدرے تفصیل سے ہے۔گیتا، مہابھارت اور مقدس بید کے علاوہ فارسی اور اردو کے شعرا مثلاً رومی، سعدی، میر، غالب اور سودا وغیرہ کے اشعار سے لفظوں کی تشریح میں مدد لی گئی ہے۔کبیر کی شخصیت اور ان کے افکار کو سمجھنے کے لئے یہ ایک منفرد اور جامع کتاب ہے''۔

5۔''پریم وانی'' میرابائی کی 152 نظموں (بھجنوں) کا انتخاب ہے جسے علی سردار جعفری نے ترتیب دیا ہے۔پریم وانی

کوہندوستانی بک ٹرسٹ ممبئی نے بڑے سلیقے سے 1970ء میں شائع کیا۔ پریم وانی بھی بیک وقت اردو اور دیوناگری رسم الخط میں چھپی ہے۔ ایک صفحہ اردو میں ہے تو دوسرا دیوناگری میں۔۔۔علی سردار جعفری نے (335) صفحاتی کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ (12) صفحات پر مشتمل مبسوط دیباچہ ہے جسے ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری نے بڑی کاوش سے تحریر کیا ہے۔۔۔(146) گیتوں کا اردو ترجمہ، میراں کے گیت کے عنوان سے جسے کرشن چودھری نے بڑی خوبی سے کیا ہے جسے ادارہ انیس اردو الہ آباد نے پہلی بار 1959 میں شائع کیا ہے۔ علی سردار جعفری نے برگزیدہ شعرا کے کلام کا انتخاب اردو اور ہندی میں ایک ساتھ شائع کر کے محبت اور یگانگت کی فضاء عام کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش سے جہاں ایک طرف ادبی لین دین کی روایت کو تقویت ملی وہیں دوسری طرف منافرت اور مغائرت کے زہر کو بیکار کرنے کا حوصلہ بھی ملا۔ اس کام کے انجام پانے سے مذکورہ شعرا کی مقبولیت میں تو چار چاند لگے ہی، سردار جعفری کی تنقید، تحقیق اور تدوین بھی چمک اٹھی''۔۔۔129

(ڈاکٹر صاحب علی، علی سردار جعفری کے مرتبہ کلاسیکی دواوین مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)

مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 468, 464, 463, 460, 456, 453)

تنقیدی مضامین

سردار جعفری کی تنقید کے سلسلہ میں ان کی تنقیدی تصانیف کے ساتھ ساتھ ان کے تنقیدی مضامین کا مطالعہ بھی بہت ضروری ہے۔

ذیل میں دستیاب تنقیدی مضامین کا جائزہ پیش خدمت ہے:

سردار جعفری کا مضمون ''جدید اردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات'' جولائی 1936 میں شائع ہوا۔

سردار جعفری ایف اے پاس کر کے بی اے سال اول کے طالب علم تھے۔ اس زمانہ میں علی گڑھ میں ترقی پسند مصنفین کا پہلا جلسہ خواجہ منظور حسین کے مکان پر منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں سردار جعفری نے شرکت کی اور ''جدید اردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات'' کے عنوان سے اپنا پہلا تنقیدی مضمون پڑھا۔ یہ مضمون علی گڑھ میگزین کے تیسرے شمارے (جولائی 1936) میں شائع ہوا۔

اس مضمون کے بارے میں عمر رضا لکھتے ہیں:

''اس مضمون پر اختر حسین رائے پوری کے مضمون ''ادب اور زندگی'' کی گہری چھاپ ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں انہوں نے ماضی کے ورثے کو جاگیردارانہ تمدن کا عطیہ قرار دینے کے باوجود روایت، قافیہ اور بحر کو ایشیائی شاعری کا حسن قرار دیا ہے اور بلینک ورس (آزاد نظم) کی مخالفت کی۔

بقول سردار جعفری:

''روایت، قافیہ اور بحر کی یک رنگی ایشیائی شاعری میں ایک ایسی چیز ہے جس سے اس کا حسن دوبالا ہو گیا ہے لیکن بعض نوجوان اسے بے جا قیود کا نام دے کر مغرب کی تقلید میں بلینک ورس کی طرف راغب ہو گئے ہیں اور ایسی چیزیں پیش کر رہے

ہیں جو اردو ادب کے دامن پر بدنما دھبہ ہیں"۔ 130

عمر رضا لکھتے ہیں:

"ہندوستان کی جنگ آزادی اگر چہ عروج پر تھی لیکن ترقی پسند تحریک نے اس میں نئی روح پھونک دی تھی۔خاص طور پر اپریل 1936 کی کانفرنس میں پریم چند نے جو صدارتی خطبہ دیا تھا، اس نے نوجوان ادیبوں کو بے حد متاثر کیا اور وہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ ہندوستان کے سیاسی وسماجی مسائل پر روشنی ڈالنے لگے تھے۔۔۔۔(مضمون)۔جدید اردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات میں انہوں نے مغرب کی تقلید میں آزاد نظم کا تجربہ کرنے والوں پر نکتہ چینی کی ہے"۔ 131

عمر رضا نے علی سردار جعفری کے دو انگریزی مضامین کے بارے میں لکھا ہے:

"دو انگریزی مضامین یکے بعد دیگرے The Importance of India in European Politics (یوروپی سیاست میں ہندوستان کی اہمیت دسمبر 1937) اور Life Sketch of Lenaine (لینن کا خاکہ حیات مارچ 1938) بھی شائع ہوئے۔اول الذکر انگریزی مضمون میں اگر چہ سردار جعفری نے ایسے وقت میں جبکہ ہندوستانی عوام برطانوی اقتدار کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے، ہندوستانیوں کے جذبات کو نظر انداز کر کے کسی بھی قسم کے یوروپی فیصلے کو یوروپی سیاست کے لئے خطرناک قرار دیا ہے لیکن خاص طور پر انہوں نے سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشاکش کو واضح کرنے کی سعی کی ہے اور یہ امید جتائی ہے کہ بہت جلد سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ ہو جائے گا اور محنت کشوں کی حکومت قائم ہوگی کیونکہ بقول سردار جعفری "سرمایہ دارانہ نظام اپنی عمر سے زیادہ جی چکا ہے"۔ ثانی الذکر میں لینن (1870 تا 21 جنوری 1924) کا مختصر سوانحی خاکہ بیان کیا گیا ہے جس میں ان کے سیاسی اور انقلابی کارناموں کی نشاندہی کرتے ہوئے لینن کو کارل مارکس کے خوابوں کو ٹھوس حقائق میں تبدیل کرنے والا ثابت کیا گیا ہے"۔ 132

سردار جعفری نے 1938 میں لکھے مضمون "نوجوانوں کے ادبی رجحانات" میں پرانے اور نئے مصنفین کے ادبی رجحانات کا تقابل کیا ہے۔نئے مصنفین کے ادب میں عصری حسیت کو محسوس کرتے ہوئے سردار جعفری نے نئے مصنفین کو کئی منزل آگے بتایا ہے۔

1۔"نوجوان بجائے اس ادب کے جو اعلیٰ طبقہ کی زندگی پیش کرتا ہے ایک ایسے ادب کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں جس کی تعمیر ادبی طبقہ کی مصیبتوں پر، درمیانی طبقہ کی معاشرتی کمزوریوں پر اور اعلیٰ طبقہ کی سیاہ کاریوں پر ہوئی ہے"۔۔

2۔"دن بھر کی تھکا دینے والی محنت کے بعد گھر لوٹتے ہوئے مزدوروں کو ہنستے ہوئے سب نے دیکھا ہے لیکن اس پر بہت کم لوگوں نے غور کیا ہے کہ ان کے قہقہوں میں، جن میں ہزاروں غمگین آہیں دبی ہوئی ہیں، ایک ادبی شاہکار کا مواد موجود ہے۔کھیتوں میں کام کرنے والی دیہاتی عورتوں کے گیت محض سامعہ نوازی ہی نہیں کر سکتے بلکہ وہ ہمارے ادبی ذوق کی بھی پیاس بجھا سکتے ہیں لیکن ان کے سمجھنے کی کوشش کون کرتا ہے"۔۔۔۔

3۔"اس لحاظ سے اردو کے نئے مصنفین پرانے مصنفین سے کئی منزل آگے ہیں۔ان کی پیشانیوں پر زمانے کی بڑھتی ہوئی مشکلات نے غور وفکر کی گہری شکنیں ڈال دی ہیں اور یہ ارادی اور غیر ارادی طور پر ایک نیا رنگ اختیار کر رہے ہیں۔

جوادب یہ لوگ پیش کر رہے ہیں وہ نتیجہ ہے اس ہیجانی کیفیت کا جوان کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے''۔۔۔

4۔''واقعہ یہ ہے کہ اس وقت سوسائٹی کی حالت بالکل اس پھوڑے کی سی ہے جو اندر ہی اندر پک رہا ہو۔جب کوئی اسے نشتر سے چھونا چاہتا ہے تو سوسائٹی چیخنے لگتی ہے، ورنہ اسے اپنا جزو بدن بنائے پھرتی ہے''۔۔

5۔اردو مصنّفین کا بیدار مغز گروہ رومان سے گریز کر کے معاشرتی مسائل کی طرف آ گیا ہے، چنانچہ پریم چند ساری عمر یہی لکھتے رہے''۔ 133

مارچ 1938ء کے عربک کالج میگزین میں سردار جعفری کا ایک تنقیدی مضمون بعنوان ''نوجوانوں کے ادبی رجحانات'' شائع ہوا۔

اس مضمون کے بارے میں عمر رضا بتاتے ہیں:

''نوجوانوں کے ادبی رجحانات''میں سردار جعفری نے موجودہ ادبی رجحانات پر جو کہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا نتیجہ تھیں، خامہ فرسائی کی ہے۔اس مضمون میں پریم چند کے اس صدارتی خطبہ کا واضح اثر ہے جسے انہوں نے اپریل 1936 کے ترقی پسند مصنّفین کانفرنس میں پیش کیا تھا۔اشتراکیت سے معمور اس تنقیدی مضمون میں سردار جعفری نے دنیا کی تمام ترقیوں کے باوجود انسانیت کی کمی پر اظہار افسوس کیا ہے۔البتہ اب وہ اس بات پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ نوجوان ادیب (ترقی پسند ادیب) اب اپنے ادب میں نہ صرف یہ کہ حریر و دیبا کے بجائے چیتھڑوں، محلوں کے بجائے جھونپڑوں کا اور بربط و رباب کے بجائے بانسریوں کا ذکر کرنے لگے ہیں بلکہ تشبیہات و استعارات بھی اسی کے مطابق استعمال کر رہے ہیں۔دراصل اس زمانہ میں جس طرح کے ادب کی وکالت ترقی پسند مصنفین کر رہے تھے، اسی کی وہ تائید کرتے نظر آتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''دعوتوں سے دسترخوان کے بچے ہوئے ٹکڑے لے جانے والوں کو سڑکوں پر برہنہ پھرنے والے بچوں کے افسردہ چہروں کو بے خانماں فقیروں کے تبسم زیر لب کو، گھروں کے اندر معمولی معمولی چیزیں چرانے والے نوکروں کو، صرف دیکھئے ہی مت بلکہ اوروں کو بھی دکھایئے اور اس طرح کہ ان باتوں کی اصلی وجہ معلوم ہو سکے''۔ 134

عمر رضا مزید لکھتے ہیں:

''سردار جعفری نے اس مضمون میں جوش اور مجاز کی نظموں اور قاضی عبدالغفار کے لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری کا حوالہ دے کر انہیں اچھا ادیب کہا ہے کیونکہ اس میں انہیں اشتراکیت کی حقیقت نگاری کی دبی ہوئی چنگاریاں نظر آتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس مضمون کے اخیر میں لکھا ہے کہ:

''وہ زمانہ ختم ہو چکا جب پیٹ بھرنے کے لئے آسانیاں تھیں اور سوچنے کے لئے وقت بھی۔تخیلات پر ادب کی پوری عمارت کھڑی ہوئی تھی۔اب کہ پیٹ بھرنے کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا نصیب نہیں، تن ڈھکنے کے لئے ایک چیتھڑا نہیں جڑتا، دن رات کے دھندوں سے اتنی فرصت کہاں کہ پرواز تخئیل دکھائیں اور ''داستان امیر حمزہ''اور ''طلسم ہوش ربا''لکھیں۔مجبوراً روزمرہ کے واقعات سے اپنے ادب کی تعمیر کر رہے ہیں اور صحیح معنوں میں ادب ہے بھی یہی کہ یہ ہماری زندگی کا ترجمان ہے''۔ 135

''اسی طرح اس مضمون میں اشترا کی حقیقت نگاری پر زور دیا گیا ہے اور کسی بھی ادب کو اسی پیمانے پر جانچنے اور پرکھنے کی بات کہی گئی ہے''۔ 136

پریم چند پر تنقید کرتے ہوئے سردار جعفری لکھتے ہیں:

''ان (پریم چند) کے ناولوں اور کہانیوں کا بنیادی نقطہ کوئی سماجی یا معاشی مسئلہ ہوتا ہے لیکن اس کا حل سماجی اور معاشی نہیں ہوتا بلکہ انفرادی ہوتا ہے۔ وہ انقلاب کے بجائے انفرادی اور روحانی سدھار کی طرف چلے جاتے ہیں اور ایک ایسا آدرش وادی طریقہ پیش کرتے ہیں جو ممکن العمل نہیں ہے''۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی پریم چند کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ایک طرح سے Committed قسم کے ترقی پسند تخلیق کار تھے اور شعر و ادب سے متعلق بڑا سماجی، انقلابی نظریہ رکھتے تھے اور اپنے میدان کے شہسوار تھے۔۔۔ مثلاً پریم چند جن کی سماجی حقیقت نگاری اور اس میں معمولی انسان بالخصوص کسان کی پیشکش اس قدر لاجواب ہے کہ بعض وقت معمولی سے کردار لافانی بن کر ابھرتے ہیں۔ یہ وہ معمولی کردار ہیں جو ظلم و تشدد کے باوجود آگے بڑھ رہے ہیں۔ انسانیت کی شمع روشن کر رہے ہیں۔ ایک نئی دنیا کی تصویر پیش کر رہے ہیں۔۔۔۔ پریم چند کسانوں کے مسائل سے تو واقف ہیں، مزدوروں سے نسبتاً دور ہیں۔ دیہات سے واقف ہیں تو شہر سے دور ہیں۔ اس لئے متحدہ تصور پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور اکثر یک رُخے انداز میں آدرشوں کی باتیں کرتے ہیں مثالیت و تصوریت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سردار جعفری، پریم چند کی حقیقت نگاری کے معترف ہیں جس کے ذریعہ وہ زندگی کی از سر نو تعمیر کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت ان خوابوں کا دیکھنا ہی ایک بڑا کارنامہ تھا۔ وہ پریم چند کے اس لئے بھی قائل ہیں کہ ان کی تحریریں ظلم اور بے انصافی سے نفرت اور آزادی کا بے پناہ جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ وہ ہمارے دل میں انسان کی عظمت اور وقار کو بڑھاتی ہیں''۔ 137

علی سردار جعفری نے پریم چند کی عالمگیر شہرت کی وجہ یہ بتائی کہ ان کے افسانوں اور ناولوں میں تاریخ کی باگ ڈور سنبھالنے کی صلاحیت رکھنے والے محنت کش عوام، جن کے ہاتھوں میں مٹی کی سوندھی مہک تھی، نظر آئے تھے۔ وہ رقمطراز ہیں:

''اگر ہاتھوں کو علامت بنا کر بات کی جائے تو یہ دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پریم چند سے پہلے سارے ہاتھ دست حنائی تھے، جو عاشق کے دل خون کرنا جانتے تھے، یا عاشق کے دست جنوں تھے، جو اپنا گریبان چاک کرنے کا فن جانتے تھے۔ ان سے الگ قاتلوں کے خون آلودہ ہاتھ تھے یا دعا یا بد دعا کے لئے بلند ہونے والے مظلوموں کے ہاتھ یا بھیک مانگنے والے ہاتھ، مگر وہ محنت کش ہاتھ جن کو اقبال نے ''دست دولت آفریں'' کہا اور ''کارکشا و کارساز'' قرار دیا جن میں عطر و حنا کی خوشبو کے بجائے مٹی کی سوندھی مہک تھی، جو کدال اور ہل کو چھونے کی وجہ سے سخت ہو گئے تھے، لیکن جن میں تاریخ کی باگ ڈور سنبھالنے کی صلاحیت تھی، پریم چند کے افسانوں اور ناولوں میں نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند اپنے عالم فاضل ہم عصروں کو پیچھے چھوڑ کر عالمگیر شہرت کے مالک بن گئے''۔ ۱۳۸

پریم چند کی سماجی حقیقت نگاری کے بارے میں سردار جعفری کا یہ حوالہ ''انہوں (پریم چند) نے فرد کو سماج اور سماجی مسائل سے الگ نہیں کیا اور یہ ان کی حقیقت نگاری کا سب سے اہم پہلو ہے۔ انہوں نے حقیقت کو بکھرے ہوئے مظاہر کی بے ترتیبی

میں نہیں دیکھا بلکہ ان رشتوں کی شکل میں دیکھا جو ایک مظہر کو دوسرے مظہر سے جوڑتے ہیں اور ایک مکمل تصویر بناتے ہیں''۔(ترقی پسند ادب صفحہ 125) کا حوالہ دیتے ہوئے شافع قدوائی نے اس میں سردار جعفری کی بتائی ہوئی ایک نئی بات اجاگر کی ہے اور ان کے وژن کی ستائش کی ہے۔

شافع قدوائی لکھتے ہیں:

''پریم چند کی سماجی حقیقت نگاری کے ضمن میں سردار جعفری نے محض سوسائٹی کو، جس سے عموماً ایک مربوط اور ہم آہنگ وجود مراد ہوتا ہے، موضوع گفتگو نہیں بنایا بلکہ یہ باور کرایا ہے کہ ناول نگار نے سماجی تشکیل، انسانی رشتوں اور ان کے باہمی ربط اور اثرات کی پیچیدگیوں کو اپنے لافانی کرداروں کے حوالے سے پیش کیا۔ سماج کی طے شدہ اور متعین تعریف سے صرف نظر کرتے ہوئے کرداروں کے مطالعے میں سماج کے بجائے Social Formation یعنی سماجی تشکیل کا ذکر یقیناً نئی بات ہے۔ یہ تحریر 1951ء کی ہے۔ اس کے خاصے عرصے بعد ساختیاتی فکر نے سوسائٹی کے بجائے سماجی تشکیل پر اصرار کرنا شروع کیا''۔ 139

علی سردار جعفری نے 1944ء میں انگریزی میں مجروح سلطان پوری پر ایک مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون کلکتہ کے سنڈے ٹیلی گراف میں شائع ہوا تھا۔ یوسف ناظم نے اس مضمون کے بارے میں لکھا ہے:

''ان (سردار جعفری) کی اجازت سے میں نے اس کا ترجمہ کتاب نما کے لئے کیا تھا۔ مضمون کا عنوان تھا مجروح، رزم اور بزم کا ساتھی ۔۔۔۔ مجروح اس وقت غزل کے سب سے زیادہ شائستہ، تربیت یافتہ اور مقبول شاعر ہیں ۔۔۔ جعفری صاحب مجروح کی نغمہ نگاری کی بھی دل کھول کر داد دیتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ''خود مجروح کے معاملے میں ان کی فلمی نغمہ نگاری ان کی شاعرانہ مہارت اور خلاقی کا حصہ ہے۔ یہ گیت نگاری مجروح کی فن کارانہ شخصیت کا دوسرا روپ ہے اور اس کا ان کی غزلیہ شاعری سے موازنہ نہیں کرنا چاہئے لیکن اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ اپنی غیر معمولی شعری صلاحیتوں کو روبہ عمل لائے بغیر مجروح ایسے خوبصورت نغمے فلم کو نہیں دے سکتے تھے اور وہ بھی 50 سال کی لمبی مدت تک ۔۔۔

مجروح کی غزلیہ شاعری کے نمونے درج کرتے ہوئے جعفری صاحب نے لکھا ہے:

''نئی غزل کو مجروح کا یہ تحفہ ان کی دوسری غزلوں میں یہی تیور لئے ہوئے ہے لیکن روایت سے مربوط اور منسلک۔ اس کے نقوش بلکہ جڑیں میر تقی میر کے یہاں ملتی ہیں جیسا کہ انہوں نے کہا ہے ۔

نہ بیٹھ اب امیروں کی صحبت میں میر
ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم

میر کے یہاں قرون وسطیٰ کے احتجاج کا لہجہ ہے۔ مجروح کا شعور دور جدید کے طبقاتی شعور سے ہم آہنگ ہے۔ 140

منٹو کی وفات کے بعد سردار جعفری نے منٹو پر ''بدزبان'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو افکار کراچی منٹو نمبر 1945ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں منٹو کی شخصیت، اس زمانے کے عالمی حالات، سماجی کیفیت اور منٹو کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

منٹو کی بدزبانی پر سردار جعفری نے لکھا ہے:

''وہ ایسا بدزبان تھا جس پر خوش زبانوں اور پاکیزہ بیانوں کو رشک آسکتا تھا۔ بدزبان بہت ہوئے ہیں۔۔۔لیکن منٹو کو جو سلیقہ آتا تھا وہ کسی کو نصیب نہیں۔اس نے کانٹوں سے پھول کھلائے تھے۔اس نے بدزبانی کو ادب اور فن کا درجہ دے دیا تھا۔یہ بدزبانی خال خال اردو اساتذہ کے یہاں بھی مل جاتی ہے اور بعض ادیبوں کا طرہ امتیاز ہے لیکن منٹو نے اسے اس بلند سطح پر پہنچا دیا تھا جہاں سے اس نے اردو ادب کے بعض ایسے لافانی انسانوں کی تخلیق کی جن کا جواب کبھی نہیں پیدا ہو سکے گا''۔ 141

منٹو پر کن ادیبوں کا اثر رہا ہے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا:

''منٹو نے اپنی ادبی زندگی کی ابتداء روسی اور فرانسیسی ادیبوں کے ترجموں سے کی جن کا اسلوب اور انداز فکر اس کی ابتدائی تحریروں میں نمایاں ہے۔منٹو کی اس وقت کی ذہنی تشکیل میں جب آج سے بیس برس پہلے میں اس سے پہلی بار علی گڑھ میں ملا تھا، سب سے زیادہ اہم انقلاب روس، جلیاں والا باغ، بھگت سنگھ، کروپاٹکن، وکٹر ہیوگو، گورکی اور رومونا ف کی ایک کتاب Without Cherry Blossom تھی اور گورکی کا اثر اس کے ابتدائی آوارہ گرد کرداروں کی حد تک تھا۔(شاید کچھ چیزیں اور رہی ہوں جس کا مجھے علم نہیں)۔۔۔بعد کے بیس سالوں میں نئے نئے اثرات آتے گئے۔حالات کی پرچھائیاں پڑتی رہیں۔گورکی، انقلاب روس، وکٹر ہیوگو اور جلیاں والا باغ دبتے گئے، بھگت سنگھ، کروپاٹکن اور رومونوف ابھرنے لگے جن میں 1940 کے بعد سومرسٹ نام بھی شامل ہو گیا ہے۔ 142

منٹو نے سماج کی جو تصویر کشی کی اس کے بارے میں سردار جعفری نے بتایا:

''آپ منٹو سے ادبی اور نظریاتی اختلاف کتنا ہی رکھیں، اس کے خلوص، دیانتداری، انسانیت دوستی، حب الوطنی اور سامراج دشمنی کا اعتراف کرنا پڑے گا۔اس کے بعد یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہ جاتی کہ منٹو اپنے سماج کے چیتھڑے اڑا سکتا تھا، اس کی دھجیاں بکھیر سکتا تھا۔۔۔اسے دکھیاروں سے زیادہ مسخ شدہ روحوں سے دلچسپی تھی، صحت مندوں سے زیادہ مریضوں اور بیماروں کے دل ٹٹولنے میں مزا آتا تھا۔آورہ گردوں سے زیادہ اس کے ہیرو غنڈے اور لفنگے ہوتے تھے اور ان سب کو اٹھا کر وہ سماج کے سر پر انڈیل دیتا تھا اور پھر تلخ ہنسی ہنستا تھا اور اگر کہیں اسے زہد و تقویٰ کا لبادہ نظر آجاتا تھا تو اسے یقین ہو جاتا تھا کہ اس کا پہننے والا جھوٹا ہے اور وہ اس لبادے کو پاش پاش کر کے اس آدمی کو ننگا کر دیتا تھا۔منٹو کے ہاتھ میں یہ سماج سڑی ہوئی پیاز کی گانٹھ کی طرح تھا جس کے چھلکے وہ بڑی نزاکت اور چابک دستی سے اتارتا جاتا تھا اور یہ کہہ کہہ کر ہنستا جاتا تھا کہ دیکھو تمہارا سماج پیاز کے بدبودار چھلکوں کے ڈھیر سے زیادہ کچھ نہیں۔یہ گانٹھ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔اس کے کچھ چھینٹے ابھی تک باقی ہیں اور سخت اور ٹھوس چیز ہونے کا دھوکا دے رہے ہیں۔منٹو کی عظمت اس میں ہے کہ اس نے اس سماج کے سامنے اس کی ننگی تصویر لا کر کھڑی کر دی۔اس نے چکلوں سے، بازاروں سے، شراب خانوں سے، گھروں کی چار دیواری اور دفتروں سے سماج کے تمام نہاں خانوں سے انسانی لاشوں کو باہر نکالا اور منظر عام پر کھڑے ہو کر کہا ''دیکھو یہ وہ جانور ہیں جو کبھی انسان تھے''لیکن منٹو کی ٹریجڈی اس میں تھی کہ وہ ان شکلوں کو نہ دیکھ سکا، جنہیں منظر عام پر لا کر وہ یہ کہہ سکتا ''دیکھو یہ وہ انسان ہیں جو کبھی جانور تھے''۔وہ حقیقت کو اس کی مکمل اور اصلی شکل میں نہیں دیکھ سکا۔صرف ایک مسخ شدہ پہلو کو دیکھ کر احتجاج کر کے رہ گیا۔143

منٹو کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری لکھتے ہیں:

''فنی اعتبار سے منٹو اپنا جواب آپ تھا۔اس کی زبان میں جو سادگی اور پرکاری تھی، جو اثر تھا، کردار نگاری میں جو تیکھا پن اور نوک پلک تک کا احساس تھا، پلاٹ میں جو گٹھاؤ تھا اور کہانی میں جو کہانی پن تھا اور اسٹائل میں بلا کے طنز کی تلخی کے ساتھ جو شاعرانہ مٹھاس تھی وہ کسی کے پاس نہیں۔وہ دو جملوں میں کردار بنا کر کھڑے کر دیتا تھا اور جس طرح چاہتا تھا کہانی کہتا تھا۔۔۔فن کار تھا اس لئے مر کے بھی زندہ ہے۔آپ آخر میں پوچھیں گے وہ بدزبان کیوں تھا؟ اس لئے کہ اس سماج نے اس سے بدزبانی کی تھی اور اس جیسے لاکھوں کروڑوں انسانوں سے بدزبانی کی تھی۔اس کی بدزبانی سے نقصان کم پہنچا ہے فائدہ زیادہ ہوا ہے۔منٹو کی بدزبانی ہمارے ادب کی عزیز متاع ہے جسے ہم زندہ رکھیں گے اور جو ہمیں زندہ رکھے گی''۔144

شاہرہ (دہلی) کے دوسرے شمارے فروری 1949 میں سردار جعفری کا 49 صفحات پر مشتمل ایک طویل مضمون بعنوان ''ترقی پسندی کے بعض بنیادی مسائل'' شائع ہوا جس میں ترقی پسند ادب کے خدوخال کی وضاحت اور ترقی پسندی پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ترقی پسند ادیبوں کی ان تخلیقات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس میں ابہام کے عناصر تھے۔اس مضمون میں سردار جعفری نے جن تنقیدی نظریات کو پیش کیا تھا اس کے خاص خاص نکات عبدالشکور نے یوں بیان کئے ہیں:

1۔''کسی بھی زمانہ کی شاعری پر اس وقت کی زندگی، سماج اور ادب کے دھاروں سے واقف ہوئے بغیر تنقید نہیں کی جاسکتی''۔

2۔''جو شاعر زمانہ حال کے جذبات واحساسات کی ترجمانی نہیں کرسکتا اس کے الفاظ کتنے ہی حسین کیوں نہ ہوں اس کی شاعری میں اثر کا پیدا ہونا محال ہے''۔

3۔''محبت سماجی زندگی سے وابستہ ہے اور اس کو سماجی زندگی سے الگ کر کے عشق کا کوئی مطلق اور مجرد تصور قائم نہیں کیا جاسکتا''۔

4۔''شاعر کا فرض ہے کہ وہ سماجی زندگی کو سنوارنے میں پوری کوشش کرے''۔

5۔''ہمیں پرانی امیجری اور ڈکشن کو ترک نہ کر دینا چاہئے۔اصل میں ہمارا کام یہ ہے کہ ہم احتیاط اور سلیقہ سے پرانی امیجری اور ڈکشن کو استعمال کریں اور اس میں حسب ضرورت اضافے کرتے جائیں''۔

6۔''خارجی حقائق اور انسانی شعور کو نظر انداز کر کے ادب اور آرٹ کا کوئی نظریہ، کوئی کسوٹی نہیں بنائی جاسکتی۔ادب کو زندگی اور نمو کی ترجمانی کرنی چاہئے''۔

7۔''سماج، زندگی اور کائنات کے حقائق کو جذبات اور تخئیل کے سانچے میں ڈھال دینے کا نام آرٹ ہے۔ادب کا خام مواد زندگی اور کائنات کے حقائق ہیں۔اچھا آرٹ وہ ہے جس میں شعور کی گہرائی، جذبات کی شدت اور تخئیل کی بلندی ہو، وہ شعور جو سماجی حقائق کا صحیح ادراک نہ کرسکتا ہو سچے جذبات پیدا نہیں کرسکتا''۔

8۔''ہر شاعر کا انداز بیاں انفرادی ہونا چاہئے۔یہ انفرادیت آرٹ کے لئے بہت اہم ہے۔فن کار حقیقت کے رنگوں کے مختلف امتزاج سے حقیقت کو نئی شکلیں دیتا ہے''۔۔۔

عبدالشکور نے ترقی پسند نقاد کے بارے میں لکھا ہے:

---''ترقی پسند نقاد الہام یا القا (Inspiration) کے منکر ہیں۔ان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ کسی روحانی یا ماورائی قوت پر ایمان لائیں، وہ سماجی اور تہذیبی نشو ونما اور طبقاتی جدوجہد ہی کو ادب اور تنقیدی نظریات کا سرچشمہ مانتے ہیں۔ شاعر کی روحانیت اور تصوف کی ان کے نظام میں کوئی جگہ نہیں۔۔۔اگر کسی دور کے ادب کا جائزہ لینا ہو تو یہ جائزہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ ہم پہلے اس دور کے سماجی پس منظر کا غور وتامل سے مطالعہ کریں اور اس کی روشنی میں اس دور کے ادب کو دیکھیں اور سمجھیں''۔ 145

فیض کی نظم پر سردار جعفری نے جو تنقید کی تھی اس کے بارے میں ای اے حیدری نے لکھا ہے:

''ترقی پسند شعرا میں براہ راست پیرائے کے علمبردار علی سردار جعفری ہیں۔

انہوں نے فیض کی نظم ''یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر'' کو ترقی پسند شاعری کے زمرے سے خارج کردیا۔ان کا کہنا تھا کہ یہ نظم ترقی پسند نظم نہیں ہے اس لئے کہ رمزیاتی واستعاراتی انداز ترقی پسندی نہیں ہے۔ترقی پسندی اظہار کے براہ راست پیرایہ کی متقاضی ہے جب کہ خود علی سردار جعفری کے یہاں دونوں اسالیب پائے جاتے ہیں۔سردار جعفری کے یہاں بالواسطہ پیرائے والے اشعار خال خال نظر آتے ہیں''۔ 146

فیض نے اپنی غزلیہ اور غیر غزلیہ دونوں قسم کی شاعری میں پرانی علامتوں کا استعمال کیا ہے۔ان کے یہاں جو پرانی علامتیں استعمال ہوئیں ان میں گل وبلبل، گلشن، بہار، خزاں، آشیاں، قفس، صیاد، نشیمن، ساقی، میخانہ، جام، میخوار، سبو، شمع اور پروانہ وغیرہ بہت زیادہ مستعمل ہیں۔فیض کی اسی پرانے طرز کی علامتی شاعری کی بناء پر انہیں سردار جعفری نے ترقی پسند شعرا کی نہج سے الگ قرار دیا۔جب ان کی یہ نظم ''یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر'' منظر عام پر آئی تو سردار نے کہا کہ یہ ترقی پسند شاعری نہیں ہے''۔ 147

فیض کی نظم ''صبح آزادی'' پر سردار جعفری کی تنقید ملاحظہ کیجئے:

''فیض نے صبح آزادی میں استعاروں کے کچھ ایسے پردے ڈال دیئے ہیں جن کے پیچھے پتہ نہیں چلتا کہ کون بیٹھا ہے۔ اس کا پہلا شعر ہے یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر، وہ انتظار تھا جس کا وہ یہ سحر تو نہیں۔اور آخری مصرعہ ہے۔چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی۔لیکن یہ بات تو مسلم لیگی لیڈر بھی کہہ سکتے ہیں۔اس نظم میں داغ داغ اجالا ہے، شب گزیدہ ہے، حسینان نور کا دامن ہے، فضا کا دشت ہے، تاروں کی آخری منزل ہے، پکارتی ہوئی باہیں اور بلاتے ہوئے بدن ہیں۔یہ سب کچھ ہے لیکن نہیں ہے تو عوامی انقلاب اور عوامی آزادی، غلامی کا دور اور اس کا مداوا۔ایسی نظم ایک غیر ترقی پسند شاعر بھی کہہ سکتا ہے۔ اگر ہمیں فیض کی ترقی پسندی کا علم نہ ہو تو ہم اس نظم کا کوئی مفہوم نہیں نکال سکتے۔یہ شاعری کی سماجی مقصدیت سے انکار اور ہیئت پرستی کا نتیجہ ہے''۔ (ترقی پسند شاعری کے بنیادی عناصر۔شاہراہ)

فیض کی نظم صبح آزادی پر سردار جعفری کی مذکورہ بالا تنقید پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے ابوالکلام قاسمی رقمطراز ہیں:

''عوامی ادب اور عوامی انقلاب کا یہ مطالبہ فیض ہی کیا خود جعفری کی متعدد نظموں میں مثلاً میرا سفر، تخلیق کا کرب اور شاعر

وغیرہ کے لئے درست نہیں معلوم ہوتا۔فیض کی فنی ہنرمندی، ڈکشن کہ تہہ داری اور استعاراتی جہات نے جس طرح اردو کے جدید نظم کو شعرا میں ان کو ممتاز اور سربرآوردہ بنادیا ہے، اس کی وجہ سوائے اس کے اور نہیں کہ انہوں نے سردار جعفری کی ہدایات اور ان جیسے انتہاپسند ادیبوں کی ضابطہ بندی کو ہمیشہ نا قابل اعتناء تصور کیا۔اگر سردار جعفری کو فیض کے یہاں غلامی کے احساس اور اس کے مداوا ہی کی تلاش تھی تو انہیں راشد کی نظم انتقام یا سماجی اور انسانی معاملات و مسائل سے گہرا سروکار رکھنے والی دوسری نظموں کو مسترد کرنے کے بجائے ترقی پسندی کا نمونہ قرار دینا چاہئے۔ 148

ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض کی نظم یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر کے پس منظر پر اجمالی نظر ڈالی اور اس میں بات کے صاف اور واضح ہونے کو اجاگر کیا۔

وہ لکھتے ہیں:

''اس ملک (پاکستان) میں جمہوریت اور جمہوری اقدار کے بول بالا کے لئے فیض احمد فیض اور حمید نظامی نے شانہ بہ شانہ انتہائی نامساعد ابتدائی حالات میں صحافتی محاذ پر علم بلند کیا۔حکومت وقت غیر جمہوری حرکات پر انگلی اٹھانے والے کو غدار وطن قرار دے کر اس کی گردن مار دینے کی کھلی دھمکیاں دینے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی تھی۔یہ عام رواج ہو چکا تھا۔مگر فیض اور نظامی جمہوریت کی خیر اور ملک کی سلامتی کی خاطر اس محاذ پر بے خوف و خطر ڈٹے رہے۔

فیض پکار اٹھا:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں۔۔۔۔

اس نظم پر خاصا واویلا ہوا۔بائیں اور دائیں بازو کے دھڑوں نے فیض کو آڑے ہاتھوں لیا۔کئی ترقی پسندوں (علی سردار جعفری) نے کہا یہ تو کوئی بھی کہہ سکتا ہے۔دوسری جانب اندھیرے کے پجاریوں اور ابن الوقت بددیانت سیاسی لٹیروں اور ان کے گماشتوں نے فیض کے خلاف مسموم پروپگنڈے کی یلغار کردی کہ اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے فیض نے پاکستان کی تخلیق کو سرے سے قبول ہی نہیں کیا۔نظم میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں تھا۔بات صاف اور واضح تھی۔لٹے پٹے لوگ، لاتعداد لاوارث بھٹکتے ہوئے مہاجر عوام اور دانشور حیران تھے کہ کیا سے کیا ہو گیا ہے۔انہوں نے تو پاکستان کے قیام کی خاطر جان کی بازی لگادی تھی۔یہی لوگ فیض کی نظم کے گرد ہالہ بن گئے۔یہ ان کے دل کی آواز تھی۔وہ پاکستان کی بقاء کے لئے کمربستہ ہونا شروع ہو گئے۔فیض کی یہ نظم مجبور و مظلوم عوام کے دکھی دلوں میں گھر کر چکی تھی۔وہ فیض کے گرویدہ ہو گئے۔فیض نے کہا''آزادی محض ایک سراب ثابت ہوئی اور اس لئے اس سے حاصل ہونے والی خوشی بہت عارضی تھی۔وہ لوگ جو آزاد پاکستان میں سیاسی اور سماجی انصاف کے خواب دیکھا کرتے تھے اور اپنی تحریروں میں انہی رجحانات کا اظہار کرتے تھے بتدریج طور پر اکثریت کو متاثر کرتے تھے۔آزادی کے بعد وہ سب باطل ثابت ہوا اور جھوٹ نکلا''۔ 149

سردار جعفری کی تاویل کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

''سردار جعفری نے اس نظم کی یہ جو تاویل کی ہے اس کا سبب اس کے سوائے اور کچھ نہیں کہ مارکس کے زیر اثر ترقی پسندوں کے نزدیک اشارتی انداز بیان کی کوئی اہمیت نہیں کہ اس سے عوام سے آسانی کے ساتھ ربط پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ تفہیم دشوار ہو جاتی ہے اور ابلاغ کا مقصد و تکمیل نہیں پاتا ورنہ کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ فیض کی یہ نظم اپنے اشاریتی انداز حسن کے اعتبار سے لاجواب ہے اور یہی فیض جنہوں نے کئی خوبصورت اور کامیاب اشاریتی نظمیں کہیں ہیں اور اشارے استعمال کئے ہیں ----

----چنانچہ تشبیہ و استعارہ (اور ظاہر ہے اسی ذیل میں اشارہ بھی آتا ہے) کو عجز کا اظہار قرار دیتے ہیں''۔ 150

فیض کے الفاظ یہ کہنے کی بجائے کہ فلاں چیز ایسی ہے وہ یہ کہتا ہے فلاں چیز فلاں چیز جیسی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ قدرت کلام کے مظاہر نہیں، عجز کا اظہار ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لکھنے والا اپنے مضمون کی تمام تفصیلات کو چند الفاظ کے جامہ میں سمیٹ نہیں سکا یا ان کے اظہار کے لئے اسے الفاظ نہیں ملے۔ مجبوراً اسے راہ راست کی بجائے تشبیہ استعارے کی پگڈنڈی یا شارٹ کٹ اختیار کرنا پڑا۔ پہلا راستہ طویل بھی تھا دشوار بھی۔ دوسرا مختصر بھی ہے سہل بھی۔ اس عمل میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ تشبیہ یا استعارہ منزل نہیں راستہ ہے اور راستہ کی اہمیت محض منزل کی وجہ سے ہوتی ہے''۔ 151

ڈاکٹر سلیمان اطہر نے وضاحت کو جاری رکھتے ہوئے لکھا ہے:

''1947ء میں تقسیم ہند اور تشکیل پاکستان کے بعد پاکستان میں ایسا دور کم آیا کہ اظہار رائے کی آزادی ہو۔ آزادئ وطن کے جو خواب برصغیر کے عوام نے یہاں کے شاعروں اور ادیبوں نے دیکھے تھے، وہ بکھر بکھر سے گئے، بے منزل سے ہو گئے۔ ہندو پاکستان میں شاعروں نے کہیں تو دوٹوک اور کہیں کم یا زیادہ اشاریتی انداز میں اپنے ردعمل کا اظہار کیا:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

سردار جعفری نے اس نظم کے بارے میں خواہ کیسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہو لیکن فیض کی نظم ''صبح آزادی'' (اگست 1947) کا یہ پہلا شعر اس عنوان پر ہمارے فنکاروں کے جذبات و احساسات کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ فیض نے اس نظم میں ''داغ داغ اجالا اور شب گزیدہ سحر'' کے علاوہ ''فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل'' ''شب سست موج کا ساحل''، ''بے صبر خواب گاہوں''، ''چارہ گراں''، ''نگار صبا'' اور ''گرانی شب'' جیسے دل آویز اشارات کے ذریعہ آزادی کے بعد کے حالات اور ان حالات سے عوام کا بے بہرہ ہونا، دانشوروں کی سعی مسلسل اور لاحاصل، کرب، ذہنی انتشار اور تہی دستی کی فنکارانہ مرقع کشی کی ہے---فیض کی لفظیات کا سرمایہ اور ترکیبوں وغیرہ کی کثرت ہماری کلاسیکی شاعری سے ماخوذ ہے لیکن ان کا اشاریتی مفہوم روایتی معنوں سے قطعی مختلف اور بہت دور ہوتا ہے۔ کلاسیکی شاعری سے استوار رشتے کے باعث فیض نے جتنی خوبصورت غزلیں کہیں ہیں، بہت کم ترقی پسند شاعروں کے ہاں یہ بات پائی جاتی ہے اور پھر یہ بھی کہ غزل کی اشاریتی روح ان کی منظومات میں بھی کارفرما ہے۔ قاتل، مقتول، دل فگار، داغ داغ اجالا، شب گزیدہ سحر، محتسب، پیر مغاں، اہل ستم، چارہ گر، بت، شام، سحر، قفس، بہار، خزاں، صیاد، گلشن، وصل اور ہجر جیسے الفاظ کو جو ایک طرح غزل کے الفاظ بن گئے، فیض نے

اپنی منظومات میں بھی بطور اشارات کے بار بار استعمال کیا ہے اور پھر اس ہنرمندی کے ساتھ کہ یہ عصری معاشرے اور سیاست کے پس منظر میں اجنبی محسوس نہیں ہوتے"۔ 152

سردار جعفری نے عوامی ادب کے لئے رمزیت اور علامت کے گہرے پن کی مخالفت کی ہے۔انہوں نے دہلی میں منعقدہ ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس میں کہا:

"اگر ادب کو عوام تک لے جانا ہے تو اس کی سطح دوسری ہوگی۔اس میں رمزی اور علامتی اظہار کا رنگ گہرا نہیں ہوسکتا۔ ترقی پسندوں نے ایسی شاعری کے کامیاب تجربے کئے ہیں۔انقلابی شاعروں میں پبلو نرودا، مایاکوفسکی اور نذرالاسلام کی شاعری بھی بڑی حد تک راست اظہار کی شاعری ہے جسے عوام سمجھتے آئے ہیں"۔ 153

سردار جعفری نے فیض کی نظم "صبح آزادی" کے متعلق کہا کہ "فیض نے اپنی پندرہ اگست کی نظم میں استعاروں کے کچھ ایسے پردے ڈال دیئے ہیں جن کے پیچھے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون بیٹھا ہے"۔عقیل احمد صدیقی کے مطابق اس سے سردار جعفری یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ طریق اظہار واضح اور براہ راست ہو نہ یہ کہ استعاروں اور پیکروں میں چھپا ہوا۔یہی اصل عوامی ادب کی روح ہے۔ 154

سردار جعفری نے فیض کی نظم صبح آزادی کے ان اشعار

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

پر اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہی بات تو مسلم لیگ اور مہاسبھا والے بھی کہہ سکتے ہیں۔فیض کو چاہئے تھا کہ ان کا مقصود جس سحر سے ہے اس کی طرف واضح اشارہ کرتے۔

علی سردار جعفری کی اس تنقید پر اپنی رائے دیتے ہوئے نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

"فیض کی شاعری پر محمد اسحاق اور سردار جعفری کے جو اعتراضات نقل کئے گئے ہیں اس میں تغزل کا لفظ کہیں بھی استعمال نہیں کیا گیا لیکن غور کیجئے تو پتہ چلے گا کہ دونوں کے اعتراضات خصوصاً سردار جعفری کے اعتراض کا ہدف فیض کا وہی تغزل ہے جو ان کی شاعری کے محاسن کا سرچشمہ ہے۔فیض کے ترقی پسندی یا ترقی زدہ احباب اور نقاد چاہتے ہیں کہ فیض ایک شاعر کی حیثیت سے شاعری نہ کریں بلکہ اشتراکی جماعت کے رکن کی حیثیت سے شعر کہیں۔سحر اور انقلاب کے الفاظ استعمال کریں تو ان کے ساتھ سرخ کی صفت ضرور استعمال کریں۔مزدوروں اور مظلوموں پر نظمیں لکھیں تو اس انداز میں لکھیں۔

دیکھو دور افق کی صنو سے جھانک رہا ہے سرخ سویرا
جاگو اے مزدور کسانو اٹھو اے مظلوم انسانو

ظاہر ہے کہ یہ وضاحت، یہ صراحت، یہ خطابت تغزل کے منافی ہے۔فیض نے تغزل کا سہارا لے کر اپنے آپ کو اس

انجام سے بچالیا ہے جس سے خود سردار جعفری کی شاعری دوچار ہے۔آج ترقی پسند شاعری کے بیشتر حصے کی طرح سردار جعفری کی شاعری کو بھی بڑی حد تک صحافت پر محمول کیا جارہا ہے"۔ 155

غزل کو فیض، مجروح، مجاز اور جذبی نے کیا دیا اس تعلق سے سردار جعفری لکھتے ہیں:

"غزل کو عصر حاضر میں لانے کا کام فیض اور مجروح نے انجام دیا ہے۔۔۔غزل کو نیا رنگ و آہنگ دینے میں فیض کے ساتھ مجروح کا بھی بڑا ہاتھ Contribution ہے۔اس میں مجاز اور جذبی بھی شامل ہیں گو ان کا حصہ فیض اور مجروح سے کم ہے"۔ 156

فیض کی شاعری سے متعلق ایک انٹرویو میں سردار جعفری نے بتایا:

1۔"فیض شروع سے ہی لطیف لہجہ کے شاعر رہے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کے لطیف لہجہ میں مزید چاشنی، مزید لطافت، حسن اور نغمگی پیدا ہوتی گئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے انتساب جیسی نظم بھی کہی۔کلرکوں، پوسٹ مینوں اور گاڑی بانوں جیسے الفاظ میں۔اور پھر فیض کی آخری دور کی نظمیں جو انہوں نے فلسطینی نعرے پر لکھی ہیں کہ "حقا کہ ہم جیتیں گے" یہ لہجہ یہ ڈکشن فیض کے ہاں پہلے نہیں تھا لیکن آخر آخر میں ان کے ہاں بھی یہ بلند بانگ احتجاجی لہجہ آیا۔

فیض کی ایک غزل نما نظم ہے کہ:

"جب مزدور، کسان جاگیں گے تو ایک کھیت نہیں، ایک دیس نہیں ہم ساری دنیا مانگیں گے ہم ہر پرچم پر اک لال ستارہ مانگیں گے"۔بات دراصل یہ ہے کہ ترقی پسند شاعری میں دونوں چیزیں شامل ہیں۔اگر کوئی بلند آہنگی کو بہانہ بنا کر فیض کی پوری شاعری میں معترض ہو تو کیا آپ اسے ادبی دیانت کہیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔فیض کا جو لطیف تر لہجہ تھا وہ وقت کے ساتھ بہتر سے بہتر ہوتا گیا، فیض تو آخر وقت تک ارتقاء پذیر رہے ہیں اور ان کا خلاقانہ ذہن آخر وقت تک کچھ نہ کچھ دیتا ہی رہا ہے۔ان کی نغمگی جو رومانی نظموں میں تھی وہ بعد کی رجزیہ نظموں میں زیادہ اعلی سطح پر نظر آتی ہے۔لہٰذا شاعری کو لطیف لہجے اور بلند آہنگ میں تقسیم کر دینا، ہے ہی غلط بات۔لہجہ اور آہنگ تو موضوع سے بنتا ہے"۔۔۔۔

2۔ہمارے ہاں دو لہجے ملتے ہیں۔ایک لہجے کو آپ غنائی یا بزمیہ اور دوسرے کو رزمیہ یعنی رزم کا لہجہ (کہہ سکتے ہیں)۔ترقی پسند شاعری میں دونوں لہجے ساتھ ساتھ سفر کرتے ملیں گے۔فیض کے ہاں غنائی لہجہ میں جو نہایت خوبصورت اور موثر ہے اور اس کا بڑا اثر اپنے عہد کی شاعری پر پڑ رہا ہے میرے ہاں بھی اس کا اثر ہے۔مخدوم کے ہاں بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارے ہاں جو رزمیہ لہجہ ہے اس کا اثر بھی فیض کے ہاں موجود ہے۔مجاز کے مصرعے ؎

ہاں ہم نے کمندیں پھینکی ہیں۔۔۔

یہ لہجہ رزمیہ لہجہ ہے اور فیض کے ہاں آیا ہے۔انہوں نے کہا ہے کہ ؎

جب تاج اچھالے جائیں گے
جب تخت گرائے جائیں گے

تو اس طرح ہم عصر شعرا ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہی رہتے ہیں۔فیض نے تو اس معاملہ میں ہمیشہ ہی بڑی فیاضی

اور کشادہ دلی سے کام لیا ہے۔فیض نے وضاحت کے ساتھ نام لے لے کر بتایا کہ میں نے اس سے اثر لیا، اس سے اثر لیا اور جب میں لکھنو گیا تو مجاز، سردار، جاں نثار اختر سے اثر لیا تو اس معاملہ میں فیض نسبتاً بہت فیاض اور کشادہ دل انسان تھے اور ہمیں یعنی ترقی پسند شعراء کو تو کشادہ دل ہونا ہی چاہئے۔میں نے فیض سے اثر قبول کیا ہے۔فیض شروع ہی سے بڑے دھیمے اور ملائم لہجے کے آدمی تھے۔یہ دھیما پن ان کا مزاج تھا، غنائیت ان کی شخصیت میں شامل تھی۔میرا اپنا مزاج بالکل الگ رہا ہے۔لہٰذا لہجوں کا فرق مزاج اور افتادِ طبع کے فرق سے ظہور میں آیا ہے۔ہمارا مقبول ترین اور نمائندہ شاعر تو فیض ہے نا؟ اس سے زیادہ مقبولیت تو اس عہد میں کسی اور شاعر کو ملی ہی نہیں۔ہم سب فیض کے ہم عصر ہیں، لیکن فیض کی مقبولیت کو خود اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے ہیں اور ان کی مقبولیت کو اپنی مقبولیت جانتے ہیں کہ وہ ہمارے ہی قبیلے کے آدمی تھے اور انہیں جو مقبولیت ملی ہے میں تو ایسا سمجھتا ہوں گویا وہ مقبولیت خود مجھے ملی ہے اور یہی ایک امتیازی فرق ترقی پسندوں اور غیر ترقی پسندوں میں ہے۔فیض کے ہاں رزمیہ لہجہ کس بلند آہنگی کے ساتھ آیا ہے بلکہ آخر آخر میں تو انقلابی نعرہ کی گونج ان کے ہاں سنائی دیتی ہے تو کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ترقی پسند شاعری کو کسی ایک آہنگ یا لہجے سے مخصوص کر دینا یقیناً درست نہ ہوگا"۔ 157

سردار جعفری کی فراق پر تنقید کے سلسلہ میں پروفیسر محمد حسن نے لکھا:

"ان (فراق) کا ایک مضمون شاہراہ میں چھپا تھا جس میں شاعر اور دانشوروں کی آزاد روی کے ضمن میں امرد پرستی کا بھی جواز پیش کیا گیا تھا اور اس سلسلہ میں دورِ قدیم کے یونانی فلسفیوں سے لے کر آسکر وائلڈ تک کا ذکر تھا کہ جنسی عمل کی ضابطہ بندی کے اعتبار سے بھی یہ ادیب اور دانشور گویا ان بندشوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔"یہ ترقی پسندی نہیں ہے" کے عنوان سے اس کے جواب میں بھی سردار جعفری نے سخت مضمون لکھا۔یہ تینوں مضامین (معین احسن جذبی، فیض کی نظم یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر اور فراق کے مضمون کے جواب میں یہ ترقی پسندی نہیں ہے) کی اشاعت سے سردار جعفری کی حیثیت ادبی محتسب کی ہوگئی گو اس وقت تک ترقی پسند ادیب اپنا پیر مغاں جوش ہی کو تسلیم کرتے تھے مگر عملاً یہ منصب سردار نے اختیار کرلیا تھا"۔ 158

سردار جعفری کی جذبی پر تنقید کے سلسلہ میں پروفیسر محمد حسن نے لکھا:

"سردار جعفری نے ۔۔۔شاہراہ دہلی (پہلا شمارہ جنوری 1949) میں معین احسن جذبی کے نام ایک طویل خط چھپوایا جس میں ان کی نظموں کے ابہام پر اعتراض کیا گیا تھا۔بقول ان کے جذبی کی نظم "نیا سورج" میں جو ارمان کیا گیا تھا وہ ارمان تو کوئی رجعت پسند بھی سیاسی آزادی کے حصول پر کرسکتا ہے کہ آخر اس آزادی سے حاصل ہی کیا ہوا؟ جو دبے کچلے تھے وہ تو آج بھی اسی طرح دبے کچلے ہوئے ہیں اور پھر اس پر بحث کی کہ شاعری کو زیادہ براہ راست اور برملا ہونا چاہئے"۔ 159

پروفیسر وارث کرمانی لکھا ہے:

"سردار جعفری کے معتوب شاعروں میں معین احسن جذبی کی مثال بہت نمایاں ہے جن کی قنوطیت زدہ غزلوں پر سردار نے انہیں خط لکھ کر سخت تنبیہ کی تھی اور ترقی پسندانہ نظمیں لکھنے کی ہدایت کی تھی لیکن جذبی نے سرتابی کی اور اپنی روش پر قائم رہے۔جذبی کی بعض تخلیقات سردار جعفری کی آمریت کے خلاف ایک کراہتی ہوئی آواز بن گئی مثال کے طور پر ان کی نظم "اپنے

نقاد سے" پیش کی جا سکتی ہے"۔ 160

سردار جعفری کا ایک مضمون "ادب میں تنگ نظری" شاہراہ دہلی کے فروری، مارچ 1952 کے شمارے میں شائع ہوا۔

مضمون شروع ہونے سے پہلے قوسین میں ادارہ شاہراہ نے لکھا ہے:

" یہ مختصر مگر اہم مضمون ادارہ شاہراہ کے نام سردار جعفری کے ایک خط کا اقتباس ہے۔ ہم اپنے ترقی پسند نقادوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ادب میں تنگ نظری اور ادب میں متحدہ محاذ کے موضوعات پر خاص توجہ دیں کہ اس وقت ادب کا یہ سب سے اہم تقاضا ہے"۔

اس مضمون کے لکھنے کا مقصد دراصل ترقی پسندی کی وضاحت ہے۔

سردار جعفری نے کچھ لوگوں کے اعتراضات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

" ادھر کچھ دنوں سے یہ ہوا چلی ہے کہ ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی کا فرق بالکل نظر انداز کر دیا جائے بعض حضرات کا خیال ہے کہ ترقی پسندی کے مفہوم کا کوئی تعین ممکن نہیں ہے اور بعض یہ سمجھتے ہیں کہ سیاسی جدوجہد کی ترجمان انتہا پسندی ہے۔ جب سے ہم نے یہ کہا کہ ترقی پسند مصنفین تنگ نظری کا شکار ہو گئے تھے تب سے ہم پر حملہ اور زور شور سے ہونے لگا ہے اور لوگوں نے وسیع النظری کا یہ مقصد قرار دے دیا ہے کہ ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی کا فرق اٹھا دیا جائے اور صرف اچھے اور برے ادب کا فرق باقی رکھا جائے"۔

علی سردار جعفری نے مذکورہ بالا اعتراضات کے جوابات دیتے ہوئے لوگوں کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔

وہ رقمطراز ہیں:

1۔" ہم تنگ نظر ان معنوں میں تھے کہ ہم میں سے بہت سے ترقی پسندوں نے احمد عباس اور جذبی ایسے ترقی پسندوں کو بھی برداشت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب اگر ہم اس غلطی کا اعتراف کرتے ہیں اس پر شرمندہ ہوتے ہیں اور اسے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ترقی پسند اور رجعت پسند میں تمیز نہ کریں اور صرف یہ کہیں کہ ادب اچھا ہوتا ہے یا برا اور اچھا ادب ترقی پسند اور رجعت پرست سب لکھتے ہیں۔ یہ نظریہ "ادب برائے ادب" کا نظریہ ہے جس کے خلاف ہم پندرہ بیس برس سے جدوجہد کر رہے ہیں۔۔۔"

2۔" ویسے میں بھی یہ قبول کرنے کو تیار ہوں کہ ادب یا تو اچھا ہوتا ہے یا برا۔ لیکن اچھے اور برے میں فرق کیا ہے۔ میں سب سے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ ہر ادب کا مواد Content کیسا ہے ؟ اچھا یا برا ؟ اچھا مواد میں اس کہتا ہوں جو صحتمند، مفید اور حوصلہ بخش ہو۔ برا مواد وہ ہے جو بیمار، غیر مفید، مایوس کن، تاریک اندیش یا گندہ ہو۔ سیاسی جدوجہد سے لے کر حسن و عشق کے موضوعات تک اچھے اور برے کی جستجو کی جا سکتی ہے۔ برے مواد کی ہیئت بظاہر جتنی خوبصورت ہو، اس کے اظہار و بیان میں جتنی شدت ہو اس ادب کو میں انتہائی برا اور خطرناک سمجھتا ہوں کیونکہ اس کا زہر زیادہ اثر انگیز اور کارگر ہوتا ہے۔

۔۔۔ اچھا ادب وہ ہے جو اظہار و بیان میں حسین اور موثر ہو لیکن اس سے پہلے اس کے مواد کا صحت مند ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ صحت مند مواد کا انتخاب کرنے کے بعد میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس میں اظہار و بیان کا کتنا حسن، کتنا خلوص اور کتنی

شدت ہے۔ممکن ہے کہ اس کے پرکھنے میں مجھ سے غلطی ہوجائے اور بعض ایسی چیزیں چھوٹ جائیں جو انتخاب میں شامل ہونے کے قابل ہوں اور بعض ایسی آجائیں جو اس قابل نہ ہوں۔اس غلطی کا اعتراف اور تدارک کرنے کے لئے میں ہر وقت تیار ہوں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے اس معیار کو ''وسیع النظری'' کے نام پر ترک کردوں۔میں چاہتا ہوں کہ کبھی ہمارا کوئی صاحب فکر نقاد یہ بھی لکھے کہ ہماری روایات میں عوامی قدریں کیا ہیں اور جاگیرداری اور سامراجی قدریں کیا ہیں، کن قدروں کو لے کر آگے بڑھنا ہے اور کن قدروں کو ترک کرنا ہے''۔ 161

علی سردار جعفری کا مضمون ''عوامی شاعری اور عوامی زبان'' شاہراہ، دہلی کے اکتوبر 1952 کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے وامق جونپوری کے جولائی اگست 1952 کے شاہراہ میں شائع شدہ پرکاش پنڈت کے نام خط کا حوالہ دیا ہے جس میں وامق نے ایک اہم بحث کا آغاز کیا تھا۔سردار جعفری نے لکھا ہے کہ اس سوال پر غور کرنا بہت ضروری ہے کہ عوامی شاعری کیا ہے کیونکہ ترقی پسند شاعر عوامی شاعری کرتے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں۔

وامق جونپوری کے خط کے اقتباسات پیش ہیں:

1۔''موجودہ زندگی کا دور جمہوری ہے جو عوامی جدوجہد کی آغوش میں پرورش پا رہا ہے۔وہ چیز ہرگز عوامی نہیں کہی جاسکتی جس سے عوام کو فائدہ نہ پہنچ سکے یا جس کو عوام اپنا نہ سکیں۔اس لئے آج کے معیار پر اصلی ترقی پسند شاعری ہے جو عوامی شاعری کہی جاسکے، عوامی شاعری وہی شاعری ہے جس کو عوام سمجھیں سکیں، جس کو عوام گاسکیں جس میں عوام کو اپنی زندگی دکھائی دے تاکہ وہ اس کی روشنی میں ترقی کرسکیں''۔۔۔

2۔''اس وقت تک عوامی شاعری نہیں کہی جاسکتی جب تک اس میں عوامی زبان کا استعمال ایک تحریک کی صورت میں نہ آجائے۔آج عوام کے متعلق شعر کہنے سے زیادہ عوام کے لئے شعر کہنا ضروری اور اہم ہے''۔۔۔

3۔''ترقی پسند تحریک کے گذشتہ دور میں شاعروں کو اپنے ہم دوش ساتھیوں کی نشوونما اور دوسرے متوسط اور اونچے طبقے کی ہمدردی حاصل کرنا مقصود تھا تاکہ اس کی مدد سے عوامی تحریک کامیابی کے ساتھ آگے بڑھائی جاسکے۔اس لئے اس دور میں متوسط طبقے ہی کی زبان کا استعمال صحیح تھا، اور اب عوام کے لئے شعر کہنے میں عوام ہی کی زبان کا استعمال ہوسکتا ہے''۔

4۔''جس زبان میں متوسط طبقے کا ادیب شاعری کرتا ہے وہ اس کو اپنے اجداد سے ترکہ میں ملی ہے۔متوسط طبقہ اپنے کلچر اور کردار کے اعتبار سے بنیادی طور سے لاشعوری انداز میں رجعت پسند ہوتا ہے۔وہ ترقی پسندی اور عوامی جدوجہد کا نعرہ تو ضرور لگاتا ہے مگر عوامی زبان کے مسئلے میں آکر اس کے اصل روپ کا انکشاف ہوجاتا ہے''۔

5۔''عوامی زبان وہ ہے جس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ملک کے عوام اگر اچھی طرح بول نہ سکتے ہوں تو کم از کم سمجھتے ضرور ہوں۔اور وہ زبان وامق کے نزدیک فلمی گیتوں کی زبان ہے۔1936 سے آج تک اردو میں صرف تین یا چار ایسی عوامی نظمیں لکھی گئی ہیں جن کو قبول عام کی سند حاصل ہوسکی ہے مثلاً مخدوم کی نظم ''جنگ آزادی''، میرا (یعنی وامق کا) گیت بھوکا بنگال اور عمر شیخ کا ''نیا ترانہ''۔

علی سردار جعفری نے جو جوابات دیئے اور وضاحتیں پیش کیں ان کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

(الف) ''وامق کے تمام مفروضات غلط ہیں۔ پہلی اور اہم چیز یہ ہے کہ زبان قومی ہوتی ہے طبقاتی نہیں ہوتی اور قومی زبان ہی عوامی زبان ہے۔ اسے ان تمام طبقوں (جاگیردار، سرمایہ دار، درمیانی طبقہ، مزدور اور کسان) نے مل کر کئی صدیوں سے بنایا ہے۔ اس قوم کے تمام لوگ عوام اور غیر عوام بلا تکلف بولتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ تعریف گمراہ کن ہے کہ ''عوام اگر اچھی بول نہ سکتے ہوں تو سمجھتے ضرور ہیں۔ ذرا سوچئے وہ کیسی ''عوامی زبان'' ہوگی جسے عوام اچھی طرح بول نہ سکتے ہوں۔

۔۔۔اس میں کچھ الفاظ متروک ہو جاتے ہیں یا کچھ نئے الفاظ کا اضافہ ہوتا رہتا ہے لیکن زبان بنیادی طور سے نہیں بدلتی ہے۔ وامق درمیانی طبقے کی زبان کو عوام کی زبان سے الگ بتاتے ہیں اور اسے یہ کہہ کر متروک قرار دینا چاہتے ہیں کہ متوسط طبقہ اپنے کلچر اور کردار کے اعتبار سے بنیادی طور پر لاشعوری انداز میں رجعت پرست ہوتا ہے۔ معلوم نہیں وہ عوام کا لفظ کن معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ عوام کوئی طبقاتی وحدت نہیں ہیں۔ ان میں مزدور اور کسان کے ساتھ درمیانی طبقہ بھی شامل ہے۔ رہ گیا رجعت پرست ہونے کا سوال تو کسانوں کا طبقہ بھی بنیادی طور سے رجعت پرست ہوتا ہے اور خود عوام بھی بنیادی طور سے ترقی پسند نہیں ہوتے کیونکہ ان میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند ہر قسم کے طبقے ملے ہوتے ہیں۔

(ب)۔ ''وامق نے عوامی شاعری کے لئے یہ شرط لگا دی ہے کہ ''جس کو عوام گا سکیں''۔ یہ گیت کی خصوصیت ہے، جس کی بنیاد جن گان (Folk Song) پر ہوتی ہے اور نظم کی لازمی خصوصیت نہیں ہے۔ نظم دونوں طرح کی ہوتی ہے جو گائی جا سکے اور وہ جو تحت اللفظ پڑھی جا سکے، سنائی جا سکے، خطیبانہ انداز سے پیش کی جا سکے۔ والٹ وہٹ مین، مایا کوفسکی، پبلو نرودا کسی کی نظمیں گائی نہیں جا سکتیں اور ان کے عوامی شاعر ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔۔۔۔ پھر ہندوستان کی شاعری میں بھی کتنی مثالیں ملیں گی جو گائی نہیں جاتیں یا گائی نہیں جا سکتیں مثلاً کیفی کی نظمیں اور خود مخدوم کی نظم اسٹالن کی آواز جسے مخدوم ترنم سے پڑھتے ہیں لیکن ترنم سے پڑھنے اور گائے جانے میں فرق ہے۔ اس کے بعد اس بیان کی غلطی ظاہر ہو جاتی ہے کہ اردو میں صرف تین یا چار ایسی عوامی نظمیں لکھی گئی ہیں جنہیں قبول عام کی سند حاصل ہو سکتی ہے''۔

نظموں کو عوامی شاعری سے خارج کر دینا بہت بڑی غلطی ہے۔

(ج)۔ ''عوامی شاعری کیا ہے؟ یہ محض زبان یا ہیئت کا سوال نہیں ہے بلکہ بنیادی طور سے موضوع اور حقیقت نگاری کا سوال ہے۔۔۔ عوامی شاعری کے لئے عوام کی زندگی اور جدوجہد کی ترجمانی اس طرح کرنا ضروری ہے کہ انہیں اپنی جدوجہد کو آگے بڑھانے اور زندگی کے بدلنے میں مدد ملے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ عوام کی سمجھ میں آ سکے۔ عوام کی سمجھ میں آسکنے کا مسئلہ محض آسان زبان کا مسئلہ نہیں ہے۔ بعض اوقات تصورات مشکل ہوتے ہیں اور آسان زبان کے باوجود بھی ان کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ سب سے پہلا سوال موضوع کے انتخاب کا ہے۔ اگر موضوع عوام کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے تو اس کے سمجھنے میں انہیں آسانی ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنی زندگی کو پہچانتے ہیں۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ شاعر عوام کی زندگی میں برابر کا شریک ہو''۔

(د)۔ ''آخر میں چند الفاظ پچھلے سترہ برس کی عوامی نظموں کے بارے میں۔۔۔ مجھے ایسے دو تین درجن گیت یاد ہیں جو اپنی مقبولیت میں ان تین گیتوں سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں جن میں لینن کا وردان، چل پڑا کارواں لینن کا۔ مزدوروں نے

ملکوں ملکوں۔ بھا کولندن جاؤ۔ اب نا گاڑی چالے۔ چپ چل کی چھوری۔ جاگا تلنگانہ اس بار لڑائی لانے والا۔ ٹرومن چاچا وغیرہ شامل ہیں۔ پھر مجاز کی نظم لال جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں۔۔۔ پھر یہ گیت ہی تو سارا سرمایہ نہیں۔ ترقی پسند شاعروں نے اچھی انقلابی نظمیں بھی کہی ہیں جنھیں کوئی شخص عوامی شاعری سے خارج نہیں کرسکتا۔ انہیں بھی قبول عام کی سند ملی ہے.................. مخدوم ہی کو لیجئے۔ اس نے صرف ''جنگ آزادی'' نہیں کہی ہے بلکہ اسٹالن کی آواز، اندھیرا، سپاہی، انقلاب اور تلنگانہ بھی کہی ہیں اور یہ سب عوامی نظمیں ہیں''۔

(ہ)۔ ''لیکن ان تمام باتوں کے باوجود امق نے جو سوال اٹھایا ہے وہ بہت اہم ہے اور ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کو اس پر بحث کرنی چاہیئے۔ میں نے انتہائی مصروفیت کے عالم میں ذرا سا وقت نکال کر یہ چند ورق لکھ ڈالے ہیں''۔ 162

سردار جعفری کا مضمون ''یہ ترقی پسندی نہیں ہے'' شاہراہ دہلی کے ستمبر اکتوبر 1954 کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ اس کی ابتداء میں سردار جعفری نے فراق کا غزل پر مضمون اور خطوط کا حوالہ دیا ہے جو اگست 1954 کے نقوش (لاہور) میں شائع ہوئے ہیں۔ بقول سردار جعفری ان میں فراق نے نظریہ شاعری کو بیان کیا ہے۔ اپنی خودستائی بھی کی ہے اور اپنے آپ کو میر، غالب، اقبال، جوش سے بڑا شاعر بتایا ہے اور کہیں کہیں شیکسپیئر اور ملٹن کا ہم پلہ ہونے کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ اپنے مضمون میں سردار جعفری نے فراق کے مضمون اور خطوط کا جائزہ لیا ہے اور اس کے بعد انہوں نے فراق کے نظریہ کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ان سب باتوں سے جو نتائج نکلتے ہیں وہ یہ ہیں۔

(الف) فراق کے نزدیک عشق جو جنسیت کی ترقی یافتہ اور وجدانی شکل ہے یعنی جنسی عشق شاعری ہی کا نہیں بلکہ تمام فنون لطیفہ، ساری تہذیب زندگی اور اس کے عوامل کا خالق ہے۔

(ب) اس عشق میں امرد پرستی۔۔۔ کا بھی ایک جمالیاتی مقام ہے۔

(ج) فراق نظم کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن غزل کو سب سے بڑی صنف سمجھتے ہیں جس کے ''مرکزی موضوعات حسن و عشق ہیں اور زندگی کے مرکزی حقائق و احساسات''۔

(د) نظم کے لئے مقصدی ہونا ٹھیک ہے لیکن غزل کو مقصد یا افادی پہلو سے ترقی پسندی کا مرض لاحق ہو جاتا ہے اور وہ چھوئی موئی شاخ مرجھا جاتی ہے جیسے فیض اور مجروح کی غزل۔

سردار جعفری لکھتے ہیں:

''جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں اس نظریے کا ترقی پسندی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ وہ نظریات ہیں جو پہلے بھی رجعت پرست حلقوں میں اچھالے جا چکے ہیں اور جن کے خلاف ترقی پسند تحریک جدوجہد کرتی رہی ہے''۔

دس گیارہ صفحات پر مشتمل بحث کے آخر میں سردار جعفری نے فراق کو اپنے نظریہ خصوصاً نظریہ شاعری پر نظر ثانی کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

سردار جعفری لکھتے ہیں:

''فراق اگر ان حالات کی روشنی میں اور ترقی پسندی کے ہوشیار مخالفین کی کوششوں کے پہلو بہ پہلو اپنے خطوط اور غزل اور اپنے مضمون کو جانچنے کی زحمت گوارا کریں تو وہ خود بھی اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ وہ غلط نظریات کی تاویل کرنے میں ایسا پھنسے ہیں کہ اسی رجعت پرستی کے ہاتھوں میں کھیل گئے۔جس کے وہ شعوری طور سے مخالفت ہیں اور جس کے خلاف انہوں نے اپنی شاعری کے بہتر حصے کو استعمال کرنا چاہا ہے۔یہ تنہا فراق کی کوتاہی نہیں ہے بلکہ طبقاتی سماج کے ان الجھے ہوئے حالات میں بہت سے لوگوں کے یہاں نظریے اور عمل کا، تاویل اور برتاؤ کا یہ تضاد ملتا ہے۔بڑے بڑے شاعروں کی شاعری اور نظریۂ شاعری کے تضاد کی شکل میں یہ دورخی نظر آتی ہے۔فراق کی شاعری کا بہترین حصہ بھی اتفاق سے وہی ہے جو ان کے نظریہ کے خلاف جاتا ہے اور جس شاعری کی عظمت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔فراق ہمارے عہد کے بڑے شاعر ہیں۔اس لحاظ سے جہاں ان کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ ان کے ہم عصروں اور نوخیز ادیبوں اور ترقی پسند ادب کو فیض پہنچا سکتے ہیں، قوت عطا کرسکتے ہیں وہیں اس کا بھی اندیشہ ہے کہ وہ گمراہی پھیلانے میں بے اندازہ کامیاب ہوسکتے ہیں۔اس لئے ضرورت ہے کہ فراق اپنے نظریہ پر اور خصوصاً نظریہ شاعری پر نظر ثانی کریں''۔ 163

سردار جعفری کا مضمون ''وجد کی شاعری''، ''آج کل'' دسمبر 1956ء میں شائع ہوا۔وجد حیدرآباد کی سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہوکر لکھنؤ ٹریننگ لینے گئے۔وہاں ان کی ملاقات سردار جعفری سے ہوئی۔سردار جعفری نے وجد کی نظم اجنتا کو ایک خوبصورت نظم کہا اور بتایا کہ یہ اردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہے اور اس کے ہر مصرعے میں وجد کا دل دھڑک رہا ہے۔

اجنتا کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

''اجنتا ہندوستانی تہذیب اور فن کا وہ لافانی کارنامہ ہے جس کی مثال دنیا کا کوئی ملک نہیں پیش کرسکتا۔بیرونی اقتدار نے ہمارے ماضی پر پردے ڈال رکھے تھے ہماری تحریک آزادی کے ساتھ ساتھ پردوں کو اٹھانے کی جو کوششیں کی گئی ہیں ان میں سے ایک کوشش وجد کی یہ نظم ہے۔یہ نظم اور وجد کی بعض دوسری نظمیں ان لوگوں کے لئے بھی ایک مسکت جواب کی حیثیت رکھتی ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ اردو شاعری کو ہندوستان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے''۔ 164

وجد کی نظموں کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

1۔''ایک خصوصیت جو مجھے وجد کی اس قسم کی نظموں میں نظر آتی ہے اس کا ذکر کردینا مناسب ہے۔قدیم ہندوستان کے فنون لطیفہ میں ایک بہت بڑے نقاد عالم کمارسوامی نے کسی جگہ ایک بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ قدیم ہندوستان میں فنکار اور دستکار اور محنت کش اور معمار میں کوئی فرق نہیں تھا۔یہ دونوں روحیں ایک ہی جسم میں رہتی تھیں۔گذشتہ چند صدیوں میں سرمایہ داری اور تجارتی سماج نے ان دونوں روحوں کو الگ الگ کردیا جس کی وجہ سے محنت کش کو بھدا اور غیر فنکار سمجھا جاتا ہے اور فنکار کو مزدوروں سے الگ کرکے غیر مفید سمجھا جاتا ہے جس کا کام جی کو خوش کرنا ہے۔سماجی افادیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔یہ نکتہ وجد کی شاعری میں بھی موجود ہے۔وہ اہل ہنر مزدوروں کو بھی اہل ہنر کہتا ہے بلکہ ان کا ذکر اتنی ہی محبت اور عقیدت سے کرتا ہے جس کا اظہار اجنتا اور ایلورا کی نظموں میں ہوتا ہے۔اس کا عنوان ہے ''مزدوروں کا پیغام''۔جامعہ عثمانیہ کے محنت کش معمار ہوں یا اجنتا کے فنکار اور ایلورا کے بت کار سب نے کام چھوڑا ہے نام کسی نے نہیں چھوڑا۔وجد کی شاعری بار بار یہی

پیغام دیتی ہے"۔

2۔"وجد کی شاعری کے اور بھی کئی پہلو ہیں ۔ان میں سب سے زیادہ نمایاں حب الوطنی اور جذبہ آزادی کا پہلو ہے۔ وجد کی شاعری میں "کسان اور ترانہ دکن" جیسی حب الوطنی اور آزادی سے سرشار نظمیں ہیں ۔پہلی پر جوش کا اثر اور دوسری پر اقبال کا اثر ان نظموں کی معنوی اہمیت کو کم نہیں کرتا۔ ہر نیا شاعر ابتداء میں اپنے پیش رو شعراء سے متاثر ہوتا ہے پھر وہ آہستہ آہستہ اپنی آواز پیدا کر لیتا ہے اور وجد کی یہ اپنی آواز "لہو ترنگ" کے بعد "آفتاب تازہ" میں زیادہ آسانی سے پہچانی جاتی ہے"۔

3۔"سرکاری ملازمت کے باوجود انہوں نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو تحریک آزادی کے ولولہ انگیز نعروں کے ساتھ ہم آہنگ رکھا۔چنانچہ ان کی 1942ء کی ایک نظم "نیا گیت" خاص طور سے قابل توجہ ہے"۔

4۔"نظم "کاروان زندگی" ..... میں بڑی وسعت ہے اور اس کے مصرعے صدیوں کو سمیٹے ہوئے ہیں ۔اس نظم کی سرحدیں ہندوستان کی جغرافیائی سرحدوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ شاعر ماضی، حال اور مستقبل کے ساتھ ساتھ ساری انسانی دنیا کا احاطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور صرف ایک ملک ایک قوم کی نہیں بلکہ اقوام عالم کی آزادی کی بشارت دے رہا ہے"۔

5۔"تغزل اور رومانیت ..... یہ دونوں چیزیں اس کی شاعری کی جان ہیں"۔

6۔"خاک دکن کو یہ اپنا نیا شاعر مبارک ہو جسے ہم پورے ہندوستان کا شاعر سمجھتے ہیں"۔ 165

مجاز کا انتقال 5/دسمبر 1955ء کو ہوا۔سردار جعفری نے اپنے مضمون "کفن بر دوش" میں مجاز کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

مجاز نے اپنے محبوب شعراء سے جو تاثر لیا اس بارے میں سردار جعفری لکھتے ہیں:

"اس وقت مجاز کے محبوب شاعر، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی تھے۔جوش کی رندی اور بے باکی، اختر کی معصومیت اور رنگینی اور حفیظ کی نغمگی نے اسے متاثر کیا تھا اور جب اس رندی اور بے باکی، معصومیت اور رنگینی اور نغمگی نے مجاز کی شاعری میں تحلیل ہو کر ایک نیا روپ اختیار کیا تو ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور کی سب سے حسین شاعری پیدا ہوئی جس نے وقت کی ساری فضا کو سرشار کر دیا"۔ 166

مجاز کی شاعری کا جذبی اور فیض کی شاعری سے تقابل کرتے ہوئے سردار جعفری نے بتایا کہ مجاز کی شاعری میں شروع سے آخر تک نشاط ہی نشاط ہے، اس کے یہاں غم بھی شعر کا جامہ پہن کر نشاط اور کیفیت پیدا کرتا ہے، جذبی اور فیض نے عشق کے غم کو محسوس کیا اور مجاز نے عشق کے نشاط کو۔فیض کے یہاں حسن خواب آلود، خاموش اور دردمند ہے لیکن مجاز کے یہاں حسن تیز، طرار اور شوخ ہے، فیض اپنے دل سے باتیں کرتا ہے اور مجاز سماج سے، فیض گنگناتا ہے اور مجاز گاتا ہے اور اس کے گیت میں بغاوت کا آہنگ سب سے زیادہ بلند ہے۔اس کے ساز کی لے میں ہمیشہ شمشیر کی تیزی ملے گی۔

کارزار زندگی میں عورت کی شمولیت کے بارے میں مجاز کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

"مجاز غالباً اپنے عہد کے شعراء میں وہ تنہا شاعر ہے جس نے عورت کو کارزار زندگی میں پیچھے رکھنے کی کبھی کوشش نہ کی۔

اس نے آزادیٔ نسواں کے مقابلے میں زمرد کے گلوبند کو پیش کیا اور نہ علم کو عورت کے حسن کی توہین سمجھا۔اس نے آزادی اور انقلاب کے نام پر عورت کو محبت دینے سے کبھی انکار نہیں کیا.....اُس نے ہمیشہ حسن کو مشن کے ساتھ میدان میں اترنے اور جدوجہد کرنے کی دعوت دی۔اس لیے اس کے یہاں اکثر مشن اور بغاوت ہم معنی الفاظ بن جاتے ہیں۔یہ جذبہ صرف اس وقت پیدا ہوسکتا ہے جب عورت کو مرد کی عیش وعشرت کا کھلونا یا محض بچہ پیدا کرنے کی مشین نہ سمجھا جائے بلکہ اس کی سماجی حیثیت اور انسانیت کو بھی تسلیم کیا جائے تب وہ اچھی معشوقہ بھی بن سکتی ہے اور پروقار ماں بھی۔اور شاعری میں یہ عشق کا ایک نیا تصور تھا اور یہ تصور اس تحریک آزادی کے ساتھ پیدا ہوا تھا جس نے جھانسی کی رانی سے لے کر سروجنی نائیڈو تک بے شمار ہندوستانی ہیروئین پیدا کی تھیں۔اسی لیے مجاز اپنی نظم ''نوجوان خاتون'' میں جب جدید عورت کا تصور پیش کرتا ہے تو اسے آزادی کی جدوجہد سے الگ نہیں کرتا' بلکہ ایک قدم آگے جا کر یہ بھی کہتا ہے کہ ہندوستان کی نئی عورت کا حسن تحریکِ آزادی کی آگ میں پک کر ہی نکھر سکتا ہے'' 167

مجاز کے سماجی شعور کے بارے میں سردار جعفری لکھتے ہیں:

''مجاز کی ذاتی زندگی مسلسل محرومی اور ناکامی' افلاس اور بدنصیبی کی زندگی تھی اور اس کی تلخی کہیں کہیں جھلک اٹھتی ہے.....وہ زندگی سے فرار کے بجائے زندگی کے نظام کو بدل دینے کو زیادہ شاعرانہ سمجھتا ہے۔وہ اپنے گردوپیش پر ایک نظر ڈالتا ہے۔حقیقت کا جائزہ لیتا ہے اور اس کی باغی فطرت اسے اصل دشمن کا پتہ لگانے پر مجبور کرتی ہے اور اسے سماج کے کتنے ہی حجابوں کے بیچ سے باہر گھسیٹ لاتا ہے اور وہ شبستانوں میں بھی جھانکتا ہے اور اقتدار کے ایوانوں میں بھی.....اس نظم میں' جو نومبر یا دسمبر 1938 کی تخلیق ہے' مجاز کا سماجی شعور رومانیت کے تمام پردوں کو چاک کر کے باہر نکل آتا ہے' یہ شاعر صرف رومان پرست نہیں ہے بلکہ بغاوت کرنے کی بھی ہمت رکھتا ہے۔اس لیے وہ انسانی ادراک پر سے تعصب اور جہالت کے تاریک جالوں کو نوچ کر پھینک دینا چاہتا ہے۔وہ حرکت' ارتقا اور تغیر کے ساز پر گانا زیادہ پسند کرتا ہے' اس کا انداز اب بھی رومانی ہے لیکن وہ زندگی کے حقائق سے دست وگریبان ہے۔'' 168

مجاز کی مشہور اور نمائندہ نظموں ''آوارہ'' اور ''اندھیری رات کا مسافر'' میں عصری حسیت حوصلہ مندی کی تعریف کی' انگریزی سامراج اور اس کے نظام کی مخالفت کی شمولیت کو بھی اجاگر کیا۔''اس دور کی دو سب سے زیادہ اہم اور مجاز کی نمائندہ نظمیں '' آوارہ'' اور ''اندھیری رات کا مسافر'' ہیں۔ان دونوں کی تخلیق کے درمیان صرف چند مہینوں کا وقفہ حائل ہے۔ ''آوارہ'' داخلیت اور خارجیت کا بڑا حسین امتزاج ہے اور اس میں ''ذاتی مسرتیں'' اور رنج وکاوش وسیع تر حقائق کے اجزا معلوم ہوتے ہیں۔اس نظم میں اس عہد کی کیفیت بھرپور طریقے سے آئی ہے۔یہ اس بے کار نوجوان کی تصویر ہے جو سرمایہ داری کے بنائے ہوئے شہروں میں بے روزگار پھر رہا ہے اور جس کی بے روزگاری کو آوارگی کا نام دیا جاتا ہے۔اس کے دل میں نہ جانے کتنی امنگیں' آرزوئیں اور حسرتیں ہیں لیکن یہ بستی جو اس کی اپنی بستی ہے' اسے غیر کی معلوم ہوتی ہے' اور وہ اپنے آپ کو تنہا اور اجنبی محسوس کرنے لگتا ہے۔اسے معلوم نہیں کہ کیا کرے پھر بھی کچھ کر گزرنے کا حوصلہ دل میں باقی ہے اور یہی حوصلہ مندی اس نظم کی اہمیت اور اثر آفرینی کو بڑھا دیتی ہے۔''اندھیری رات کا مسافر'' میرے نزدیک ''آوارہ'' کے آخری حصے کا پھیلاؤ

ہے....مجاز سب کو آزادی کے لیے بغاوت پر آمادہ کرتا ہے۔اپنے آپ کو نوجوان مرد کو نوجوان خاتون کو کارخانے کے مزدور کو سارے ہندوستان کے باشندوں کو لیکن وہ دشمن کے خدوخال کو مبہم نہیں چھوڑتا۔وہ دشمن ایک بیرونی سامراج اور اس کا لایا ہوا نظام اور ایک ایسی حکومت ہے جس کی مخالفت ہندوستان کی ہر سیاسی جماعت کر رہی تھی، جس کے لیے بچے بچے کے دل میں حقارت کا جذبہ تھا"۔ 169

سردار جعفری کا مضمون "میر تقی میر کی شاعری" رسالہ شاہکار الٰہ آباد 1961 میں شائع ہوا۔

میرؔ نے اپنے دیوان کو درد و غم کا مجموعہ کیوں بتایا ہے یا میر کے یہاں دل اور دلی کی خرابی کا ذکر ایک ساتھ کیوں آیا ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے علی سردار جعفری نے لکھا:

"ان کا (میر تقی میر) کا اپنا بیان یہ ہے کہ "میری شاعری خواص کی پسند کی ہے پر مجھے گفتگو عوام سے ہے" انہوں نے (میر تقی میر) اپنے دیوان کو درد و غم کا مجموعہ بتایا ہے کیونکہ جہاں سارا عالم خاک ہو چکا ہو وہاں صرف اپنے آپ پر رونا بے سود ہے۔اس لیے میر کے یہاں دل اور دلی کی خرابی کا ذکر ایک ساتھ آتا ہے اور عاشق اور آدمی ہم معنی الفاظ ہیں"۔ 170

غالب اور میر میں جو فرق ہے اس کی وضاحت سردار جعفری نے اس طرح کی ہے:

"میر کے زمانے کی طرح میر کی شاعری کا عاشق بھی ایک کچلی ہوئی شخصیت ہے جو اپنا کھویا ہوا وقار واپس مانگ رہی ہے۔اس میں انانیت کا دور دور پتہ نہیں ہے۔صرف بے دماغی ہے۔انانیت، دولت، طاقت یا صلاحیت کے غرور سے پیدا ہوتی ہے اور بے دماغی سب کچھ کھونے کے بعد آتی ہے (غالب اور میر میں یہی فرق ہے)۔حسن عسکری نے اپنے ایک مضمون میں بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ میر کی شاعری کا عاشق محبوب سے محبت کا طالب نہیں۔بس اتنا چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ انسانوں جیسا برتاؤ کیا جائے۔اس کے عالم و فاضل ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ انسان ہونے کی وجہ سے۔(دیباچہ گل نغمہ: فراق گورکھپور)۔اس تصور میں میر کا بچپن، جوانی اور دلی کی تباہی اور بربادی ایک ہی تصویر کے کئی رخ ہیں اور میر نے اس تصویر میں اتنے ہی مختلف انداز سے رنگ بھرا ہے"۔ 171

میرؔ کی عصری حسیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری رقمطراز ہیں:

"میرؔ کی غزلوں میں ایسے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں انہوں نے راست سماجی، معاشی اور سیاسی مضامین کو ڈھال دیا ہے.....اس براہ راست انداز بیان کے علاوہ میر کے عہد کے مظالم اور انسانی شخصیت کی شکست و ریخت کو محبوب کے پردے میں بھی بیان کیا ہے اور اس پردے کو اٹھانے کی خود ہی ترغیب بھی دی ہے.....اس طرح کی شاعری میں انہوں نے محبوب کو ظالم، سفاک، گھٹیا، کمینہ اور اوباش، بدمعاش، خوں خوار، خوں ریز، جھوٹا، مکار سبھی کچھ کہا ہے۔محبوب کی کالی آنکھوں کی سبھی نے تعریف کی ہے لیکن میر نے ان کو "سیہ رو" اور سیہ کاسہ کہہ کر گالی بھی دی ہے۔سیہ رو کے معنی بدچلن اور سیہ کار کنجوس کو کہتے ہیں.....اور پھر یہی محبوب ظالم اور سفاک بادشاہوں، حکمرانوں اور فاتحوں کی ذات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔اب اس کی آمد تباہی کا باعث ہوتی ہے۔اس کی راہوں میں خون کے دریا موجیں مارتے ہیں، لاشیں پڑی رہتی ہیں اور دھرتی کے سینے پر فوجوں کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے.....یہ بات اہم ہے کہ اردو میں واسوخت کی ابتداء میر نے کی ہے"۔ 172

میر کے ذاتی محبوب کا جہاں ذکر ہے اس کیفیت کے بارے میں سردار جعفری لکھتے ہیں:

''میر کی شاعری میں دو اور محبوب جھلکتے ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ایک تو میر کا ذاتی محبوب معلوم ہوتا ہے۔اس کا نام انہوں نے کہیں نہیں لیا اور کبھی کبھی وہ ان اشعار میں بھی جلوہ گر ہوتا ہے جن میں بظاہر محبوب کا کوئی ذکر بھی نہیں ہے یا تو محبوب کی آمد ہے یا رخصت ہے، عاشق کا اس کی گلی سے نکلنا ہے یا اس کی محفل میں پہنچنا ہے۔ان شعروں میں وہ کیفیت ہے جو عشقیہ شاعری کی جان ہے۔ایک مہذب درد، ایک لذت سے بھری ہوئی کسک اور دل کی ایک ایسی دھڑکن جو لفظوں سے منتقل ہو جاتی ہے'' 173

عظیم شاعری کے بارے میں سردار جعفری نے بتایا ہے:

''دنیا کی عظیم شاعری سہل ممتنع ہے، جو شاعری یہ کیفیت حاصل کر لیتی ہے وہ تمام تاریخی، قومی، لسانی سرحدوں کو توڑ دیتی ہے اور بنی آدم کی میراث بن جاتی ہے۔اس کی شہادت شیکسپیئر، حافظ، سعدی، خیام، پشکن، غالب، ٹیگور سب دے سکتے ہیں۔ 174

''تازہ کاری'' کی وضاحت کرتے ہوئے سردار جعفری لکھتے ہیں:

''اگر اردو کی نئی شاعری اپنی روایت کے احترام کے ساتھ نئی تکنیک اور جدت کی طرف قدم بڑھائے گی اور آج کے اجتماعی عرفان کو اپنے ذاتی عقیدے سے ہم آہنگ کرے گی تو وہ شاعری پیدا ہو سکے گی جو بیک وقت زمانے کی طرح بوڑھی اور جوان ہوگی۔تازہ کاری وہی قابل قدر ہوتی ہے جس میں صدیوں کی صداقت کی روح ہوتی ہے۔غالب اور شیکسپیئر آج بھی جدید اور تازہ کار ہیں اور آج کے عہد میں عظیم شعرا، خواہ وہ دنیا کی کسی زبان میں شعر کہہ رہے ہوں، اپنی تازہ کاری کے ساتھ ساتھ غالب اور شیکسپیئر کے ہم عصر ہیں۔انسانی جذبات اور احساسات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔غصہ غصہ ہے رشک رشک ہے۔محبت محبت ہے۔لیکن ان کے پس منظر اور وقتی محرکات بدلتے ہیں اور اسی تبدیلی میں شاعری کی تازہ کاری کی داستان پوشیدہ ہے''۔ 175

(سردار جعفری، میر تقی میر کی شاعری مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں)

سردار جعفری نے خلیل الرحمٰن اعظمی کے شعری مجموعے ''نیا عہدنامہ'' پر اسی عنوان سے ایک تنقیدی مضمون قلمبند کیا ہے جسے انہوں نے رسالہ گفتگو ممبئی 1967 میں شائع کیا ہے۔خلیل صاحب کے شعری مجموعہ کے اس عنوان کے بارے میں سردار جعفری نے اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ شاعر نے ''عہدنامہ'' کو پیمان وفا کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔اس عنوان کی نظم پڑھ کر یہی اثر پڑتا ہے۔چونکہ دیباچے میں انہوں نے اپنے پرانے مسلک ترقی پسندی سے برأت کا اعلان کیا ہے، اس لیے قیاس یہی کہتا ہے کہ نئے عہدنامے کا مطلب نیا پیمان وفا بھی ہے۔اگر یہ صحیح ہے تو فطری سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعر کا نیا پیمان وفا کس کے ساتھ''۔ 176

سردار جعفری نے خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزلوں کے بارے میں لکھا ہے:

(1) خلیل الرحمٰن میرے نزدیک جدید شاعر نہیں (اس سے ان کی شاعری پر حرف نہیں آتا) وہ صرف جدید عہد کے شاعر

ہیں۔انہوں نے اپنا سارا انداز کلاسیکی شاعری اور خاص طور سے غزل سے لیا ہے۔اس میں جو بھی جدت ہے وہ ترقی پسند مدرسہ فکر کی دین ہے اور یہ خلیل کی اپنی شاعری کا ماضی ہے.....''۔

(2)''.....خلیل کی غزلیں پڑھ کر یہ احساس بڑی شدت کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ ماضی اور حال کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ وہ جس ماضی سے رشتہ توڑ آئے ہیں' یا رشتہ توڑ لینے پر مجبور کر دیے گئے ہیں' وہ انہیں بری طرح یاد آتا ہے اور انہیں بار بار آواز دیتا ہے۔انہیں خود اپنے کھو جانے کا احساس ہے۔آج کے آئینے میں وہ اپنی شکل تک نہیں پہنچان سکتے۔نام تک بھولے جا رہے ہیں۔37 غزلوں اور چند نظموں کے اس مختصر سے مجموعے میں ایک ہی خیال ایک ہی جذبے کی تکرار ہے.....غرض آدھی سے زیادہ غزلیں ایسے اشعار سے بھری ہوئی ہیں۔ان میں یکساں جذبے اور خیال کے باوجود حسن اور تاثیر ہے۔ان کے لہجے میں شاعر کا دل دھڑکتا ہے اور آوازوں کی تہوں کے اندر اس کی اپنی آواز کی تہیں آہستہ آہستہ کھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔یہ خلوص اور صداقت کے بغیر ممکن نہیں.....ٹکنیک کے اعتبار سے ان اشعار میں میر اور فراق کی سی پرکاری ہے'' 177

سردار جعفری کا مضمون ''لمحوں کے چراغ'' (موت زندگی کے آئنے میں)'' چار قسطوں میں آج کل کے شمارے جنوری 1996' فروری 1996' مارچ 1996 اور اپریل 1996 میں شائع ہوا۔مضمون کے محرکات کے بارے میں سردار جعفری کا 5/اگست 1995 کو تحریر کردہ نوٹ مضمون کے شروع ہونے سے پہلے درج کیا گیا ہے۔

نوٹ ملاحظہ کیجیے:

یہ مضمون ''لمحوں کے چراغ'' چار قسطوں پر مشتمل ہے۔1968 میں جب میں دل کے دورے کے بعد اسپتال سے گھر آیا تو میرے دوست خوشونت سنگھ نے جو انگریزی ہفتہ وار ''السٹریٹیڈ ویکلی'' کے ایڈیٹر تھے' موت کے موضوع پر مضامین کا ایک سلسلہ لکھنے کی فرمائش کی۔ان کا اصرار تھا کہ اسپتال میں موت کا خیال ضرور آیا ہوگا۔اس وقت میں بہت کمزور تھا اس لیے سال بھر بعد یہ مضمون '' آج کل''میں شائع ہو رہا ہے۔چونکہ یہ مضمون ہندی میں بھی شائع کرنے کا ارادہ تھا' اس لیے اس کی زبان بہت آسان اور سیدھی سادی ہے۔ادبی عبارت آرائی کا ہندی ترجمہ بعض اوقات مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔''

سردار جعفری نے زندگی کے دو واقعات کا ذکر کیا جب بقول ان کے انہیں موت کا خیال آنا چاہیے تھا لیکن نہیں آیا اور تین واقعات کا ذکر کیا جب انہیں موت کا خیال آیا تھا۔

یہ واقعات اُن ہی کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے:

(1)''موت کا خیال مجھے بارہا آیا ہے اور کوئی انسان ایسا نہیں ہے جسے اس خیال نے کبھی نہ کبھی نہ ستایا ہو۔ماں باپ کی انتہائی کوشش اور احتیاط کے بعد بھی گوتم بدھ کو اس خیال سے محفوظ نہیں رکھا جا سکا۔کبھی کسی کے مرنے کی خبر اس خیال کو زندہ کر دیتی ہے کبھی کسی گذرتے ہوئے جنازے پر نظر پڑ جاتی ہے.....میں تقریباً دس سال ایک اسپتال کے پیچھے ایک ایسے کمرے میں رہ چکا ہوں جس کے نیچے وارثوں کو اسپتال میں مرنے والوں کی لاشیں دی جاتی تھیں۔جنازے وہیں تیار ہوتے تھے۔بہت سوں کی مذہبی رسمیں وہیں ہوتی تھیں۔کبھی صبح کبھی شام کبھی آدھی رات کو شور ماتم بلند ہوتا تھا۔''

(2)''بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ جب موت کا خیال آنا چاہئے تھا اور نہیں آیا۔میں ناسک (مہاراشٹرا) جیل میں تھا اور

میرے ساتھ تقریباً دوسو سیاسی قیدی تھے۔ایک بار دس گز کے فاصلے پر پولیس نے سیاسی قیدیوں پر گولی چلائی تو ایک لمحے یہ محسوس ہوا کہ میرا دل سینے سے پھسل کر زمین پر گر گیا اور پھر واپس آ کر دھڑکنے لگا۔ ہمارے ساتھیوں میں کئی زخمی ہوئے اور ایک کی جان گئی۔موت کا خیال بارک کے اندھیرے میں اس واقعے کے بعد آیا جب چاروں طرف تالے پڑ چکے تھے اور ہم سب بیٹھے ہوئے آپس میں اس واقعے پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔اس وقت کی ہیجانی کیفیت نے موت کے خیال کو قریب نہیں آنے دیا۔شاید میدان جنگ میں فوجی سپاہیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے''۔

(3)''دوسرا حادثہ اس واقعے کے چند سال بعد اسٹاک ہوم (سویڈن) میں پیش آیا۔میں ایک کانفرنس میں شریک تھا۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور ایک پارک سے گزرتے ہوئے میں نے پہلی بار زمین پر جمی ہوئی برف دیکھی۔پیروں کے نیچے برف کے آنے کا احساس بہت عجیب وغریب تھا۔ذرا سے فاصلے پر ایک چوکور ٹکڑا دکھائی دیا جس پر برف کی تہہ ذرا زیادہ دبیز تھی میں نے بڑے شوق سے بڑھ کر اپنا پاؤں اس پر رکھ دیا اور ایک لمحے میں' میں پانی کے اندر تھا۔خیریت یہ ہوئی کہ اس زمین کی سطح کے برابر حوض میں اندر سے کوئی پائپ گزر رہا تھا۔میرا پیر اتفاق سے اس پر ٹک گیا اور میں گلے گلے پانی میں کھڑا ہو گیا۔موت کا خیال تو درکنار' میرے جسم نے برف کے پانی کی ٹھنڈک کو محسوس نہیں کیا۔قبل اس کے کہ اس ٹھنڈک سے خون جم جاتا' میرے دوستوں نے مجھے باہر نکال لیا۔.....موت کا خیال اس شکل میں آیا کہ اگر حوض کے اندر پائپ نہ ہوتا تو کیا ہوتا''۔

(4)''مجھے سب سے زیادہ شدت کے ساتھ موت کا خیال 1940 میں آیا' جب لکھنو ڈسٹرکٹ جیل میں ایک صبح بارک کے دروازے اس لیے تاخیر سے کھولے گئے کہ ایک مجرم کو پھانسی دی گئی تھی۔اس کے بعد جب میں بنارس سنٹرل جیل میں تھا تو ایک رات کو ایک قیدی نے ہمارے سامنے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا اور ہم کچھ نہ کر سکے۔اس وقت میں نے موت پر پہلی نظم کہی۔ چند سال بعد بمبئی میں ایک عزیز دوست کی بیوی کے انتقال نے موت کے احساس کو پھر شدید کر دیا۔ایک اور نظم کہنے کے بعد میں نے اس احساس سے نجات پائی''۔

(5)''1968ء میں میرے دل نے مجھے ہسپتال پہنچا دیا اور موت کا خیال زیادہ شدت کے ساتھ واپس آیا''۔ 178

سردار جعفری نے قرآن شریف کی آیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میرے کان بچپن سے ان الفاظ کے عادی ہیں کہ موت برحق ہے' قبر برحق ہے' قیامت برحق ہے' حساب کتاب برحق ہے۔زندگی خدا کی نعمت ہے اور موت بھی خدا کی نعمت ہے اور کفران نعمت گناہ۔قرآن شریف کی یہ خوبصورت آیت جو میں نے بچپن میں لکھنو کے نہایت خوش الحان قاریوں سے سنی ہے اور بار بار پڑھی ہے اسی حقیقت کو بیان کرتی ہے۔(ترجمہ: جو مخلوق زمین پر ہے وہ سب فنا ہونے والی ہے اور صرف تمہارے پروردگار کی ذات جو عظمت اور کرامت والی ہے باقی رہے گی۔تو اپنے مالک کی کن کن نعمتوں سے انکار کرو گے۔)۔میرے حافظے میں یہ بات کہیں محفوظ نہیں ہے کہ قرآن کے علاوہ کسی اور جگہ یہ کہا گیا ہو کہ زندگی کی طرح موت بھی خدا کی نعمت ہے'' 179

سردار جعفری نے دوسری جنگ عظیم کے دوران فاشزم سے لڑنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''دوسری جنگ عظیم کے دوران فاشزم سے لڑنے والے بے شمار سورماؤں کی داستانیں ہیں جن کے دلوں میں زندگی اور

انسانیت کی محبت اتنی زیادہ تھی کہ موت کے لیے ایک حقارت کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا۔ جب چیکوسلواکیہ پر جولیس فیوچک کو قتل کرنے سے پہلے پراگ شہر کی ایک پہاڑی سے چاروں طرف ہنستی ہوئی بہار کا موسم دکھایا گیا جس کا فیوچک عاشق تھا اور وہ اپنا ضمیر فروخت کر کے باقی زندگی بھر اس بہار سے لطف اندوز ہوسکتا تھا تو اس نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا''۔ 180

سردار جعفری نے اپنے مضمون میں کئی ادیبوں، دانشوروں، شاعروں، صوفی، سنت، فلسفیوں اور مفکروں کے حوالے دیے جن میں یہ ہستیاں شامل ہیں۔ اکبرالہ آبادی، ذوق، فانی، قرۃالعین حیدر، مولانا ابوالکلام آزاد، گرونانک، اقبال، خواجہ فریدالدین عطار، صوفی سرمد، سردار بھگت سنگھ، بسمل عظیم آبادی، ٹیگور، لینن، مولانا حسرت موہانی، میر تقی میر، مصحفی، آئن سٹائن، حافظ، ابراہیم بن ادھم، غالب، جوش، مولانا جلال الدین رومی۔

سردار جعفری نے بزرگوں، صوفیوں کے پاس دنیا کی زندگی کی حقیقت کو اجاگر کرنے کے لیے ابراہیم بن ادھم کے ایک واقعہ کا ذکر کیا۔

وہ رقمطراز ہیں:

''ان بزرگوں نے دنیا کو کارواں سرائے تعبیر کیا جس کے ایک دروازے سے لوگ داخل ہوتے ہیں اور دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ صوفی ہونے سے پہلے ابراہیم بن ادہم اپنے دربار میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اجنبی شخص بغیر اجازت و اعلان کے اندر داخل ہوگیا۔ ابراہیم نے پوچھا ''کہاں آئے ہو'' اس نے کہا ''کارواں سرائے میں''۔ ابراہیم نے اسے بتایا کہ ''یہ کارواں سرائے نہیں میرا محل ہے'' اس نے سوال کیا ''تم سے پہلے اس مکان میں کون رہتا تھا''؟'' میرا باپ''۔ ابراہیم نے جواب دیا۔ ''اور اس سے پہلے''؟ بوڑھے نے پھر پوچھا اور ابراہیم نے اپنے دادا اور پردادا کا نام بتادیا۔ اجنبی ہنسنے لگا ''جس محل میں اتنے لوگ آتے جاتے رہے ہیں وہ ''کارواں سرائے نہیں ہے تو کیا ہے''۔ 181

صوفیوں کے حوالے سے انسانی مساوات کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا:

''موت کا یہ پہلو بھی صوفیوں اور شاعروں کے لیے بے حد دلنواز تھا کہ اس کی بارگاہ میں وہ طبقاتی تفریق نہیں رہتی جو اس دنیا میں انسانوں کو انسانوں سے علیحدہ کرتی ہے۔

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسی کا سرِ پُر غرور تھا

مضمون کی چوتھی اور آخری قسط کے آخر میں سردار جعفری نے انسان کے ذوق جستجو اور اس کی عظیم کامیابیوں کا ذکر کیا اور اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ وقت کی روانی دلفریب ہے اور درد غم فراق، وصال، خواہش، تپش کسک کوئی کیفیت لذت سے خالی نہیں۔

وہ رقمطراز ہیں:

''انسان میں بہت سی خوبیاں ہیں جن میں سب سے زیادہ نمایاں اس کا ذوق جستجو ہے۔ پردے اٹھانے اور حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش میں وہ کبھی کبھی بال کی کھال بھی نکالنے لگتا ہے مثلاً پہلے وہ فاصلے کو پہچاننا شروع کرتا ہے پھر اسے ناپتا ہے..... یہاں تک کہ زمین سے چاند کے فاصلے کو اور ایک ستارے سے دوسرے ستارے کے فاصلے کو ناپ لیتا ہے۔ اسی طرح وہ وقت کو پہچانتا ہے اور اسے بھی ناپتا ہے اور ان دونوں کا نام عطا کرتا ہے۔ پھر ہوائی جہاز اور راکٹوں کے ذریعہ سے اس زماں ومکاں میں سفر کرتا ہے۔ زمین پر بیٹھ کر لاکھوں میل کے فاصلے پر آسمان میں راکٹوں کی سمتیں بدلتا ہے۔ چاند پر اترتا ہے اور واپس آجاتا ہے.....

میرے نزدیک وقت اور انسان کے درمیان کسی قسم کی دوئی نہیں ہے۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ شاعروں کی زبان میں انسان بھی وقت کا ایک لمحہ ہے' اس دریا کی ایک موج ہے' بے قرار اور مضطرب لیکن باشعور اور حساس' صاحب ادراک' دردمند اور دانش مند۔ اس طرح وقت اگر ایک بے شعور خلاق ہے تو انسان بیدار مغز خلاق..... ہر انسان چھوٹے سے پیمانے پر ایک خالق ہے اور اس کی ہر تخلیق فطرت پر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس قوت تخلیق سے انسان نے ہزاروں سال میں اپنے ارتقا کا سفر طے کیا ہے۔ جب زندگی کے دوسرے مظاہر ادنیٰ درجے کے جانوروں کو موت نے نیست ونابود کر دیا تو انسان نے ہر منزل پر اپنی قوت تخلیق سے کام لے کر موت کو شکست دی ہے اور آج اس بلند مقام پر پہنچا ہے جہاں وہ چاند تاروں پر کمندیں پھینک رہا ہے' کرہ ارض پر انسانی زندگی لامتناہی اور لافانی کائنات کا سب سے بڑا اور سب سے اہم واقعہ ہے۔ ایسی صورت میں میرے لیے وقت کا تسلسل خوفناک نہیں ہوسکتا۔ وہ حسین ہے اور اس کی روانی دلفریب ہے۔ درد' غم' فراق' وصال' خواہش' تپش' کسک کوئی کیفیت لذت سے خالی نہیں''۔ 182

علی سردار جعفری نے مراٹھی زبان کے ایک انقلابی شاعر نارائن سروپ کی شاعری پر ایک تنقیدی مضمون لکھا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''نارائن سروپ کی شاعری مراٹھی زبان کی شاعری میں ایک نیا موڑ ہے۔ اس میں مہاراشٹرا کی زمین کی خوشبو ہے لیکن ساری دنیا کے انسانوں کا دل دھڑک رہا ہے..... پرانی مراٹھی شاعری زیادہ تر مذہبی تھی اور قدیم سنتوں کی دین تھی۔ اس میں اعلیٰ درجے کی انسانیت تھی۔ یہ انسانیت دوستی سروپ کا انقلابی ورثہ ہے۔ جدید عہد میں مزدور طبقے نے انا بھوسا ٹھے اور امر شیخ جیسے مقبول شاعر پیدا کیے لیکن درمیانی طبقے کے نقاد ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ پھر نارائن سروپ آیا۔ اپنی ساری طاقت' ساری پتھریلی خوبصورتی کے ساتھ مہاراشٹرا کے عوام نے اس کا استقبال کیا جیسے وہ برسوں سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ شہر شہر' گاؤں گاؤں گھوم کر اپنا مترنم کلام سناتا ہے۔ پتھر گانے لگتے ہیں۔ پانچ پانچ دس دس ہزار مزدوروں اور کسانوں کا مجمع نارائن سروپ کی نظمیں گھنٹوں بیٹھ کر سنتا ہے۔ درمیانی طبقے کے سفید پوش نقاد اب اس انقلابی شاعر کو نظر انداز نہیں کر پا رہے ہیں۔ وہ مراٹھی ادب کے محل میں داخل ہوگیا ہے اور اپنے میلے پاؤں سمیٹ کر قیمتی قالینوں پر بیٹھ گیا ہے..... نارائن سروپ کے سامنے زندگی کے گمبھیر مسائل ہیں' اپنے نچلے کچلے ہوئے طبقے کی مصیبتیں ہیں' مزدور طبقے کا عزم اور جلال ہے۔ اس سارے بوجھ کو اٹھائے ہوئے اس کی شاعری تھرکتی اور ناچتی ہے..... وہ خود اپنی نظمیں کبھی تحت لفظ اور کبھی گا کر سناتا ہے اور عوام اس کی نظمیں

گاتے ہیں۔اس کی ایک نہایت مقبول نظم گرنی چی لاؤن (کارخانے کا گیت) ہے۔یہ نظم لاؤنی کے انداز میں مہاراشٹرا کے طول وعرض میں گونج رہی ہے.....سروپ کی نظموں کے انتخاب کا ایک انگریزی ترجمہ چند ماہ پہلے شائع ہو چکا ہے۔اس نے شاعری 1962ء میں شروع کی ہے۔ابھی سفر کا آغاز ہے۔ایک شاندار مستقبل اس انقلابی شاعر کا انتظار کر رہا ہے۔یہ مقبولیت ناکافی ہے۔ابھی اسے بلندی کی کئی منزلیں طے کرنی ہیں۔ 183

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے سردار جعفری کی اختر شیرانی کے بارے میں دی گئی رائے پر تبصرہ کیا ہے۔

فاطمی رقمطراز ہیں:

''ان کی (علی سردار جعفری) ترقی پسندی اختر شیرانی کی شاعری میں ایک معنی خیز اور کارآمد نکتہ تلاش کر لیتی ہے۔اہل علم واقف ہیں کہ اردو شاعری میں اختر شیرانی کا مقام ایک خالص رومانی شاعر کا ہے اور کسی بھی طرح سماجی احساس ان کی شاعری میں ناپید ہے لیکن اس رومانی شاعری سے ترقی پسند شاعری کو جو فیض پہنچا' سردار کی باریک نگاہیں بڑی ذہانت سے اس پہلو کو تلاش کر لیتی ہیں۔

وہ اختر شیرانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اختر شیرانی نے اردو شاعری میں کوشت پوست کی عورت' معشوقہ اور محبوبہ کی تخلیق کی ہے۔پرانی شاعری میں عورت کے لیے غزل میں جگہ نہیں تھی حالاں کہ اس کا حسن جابجا جھلک اٹھتا تھا۔اس کی بہت سی تاویلیں کی گئی ہیں۔ایک یہ کہ ہماری تہذیب مانع تھی کہ کھل کر عورت کا ذکر کیا جاتا۔اس لیے ہمیشہ مذکر فعل استعمال کیا گیا۔دوسری اس سے زیادہ ذہین تاویل یہ ہے کہ مونث فعل لانے سے جذبہ عشق اور جمال محبوب کی اہمیت اور لطافت کو ٹھیس لگے گی' کیونکہ اردو غزل میں عاشق و معشوق نہ مرد ہے نہ عورت بلکہ محض عاشق اور محض معشوق یا ''ٹھیٹھ انسان'' ہے''۔

''اور انسان کا ذکر ہو خواہ وہ عورت ہی کیوں نہ ہو سردار جعفری اس شاعر و شاعری کو عزیز رکھتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ اختر کی شاعری نے یہ اہم کام اس وقت انجام دیا جب جوش و اقبال جیسے شاعر بھی عورت کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایسے میں اختر شیرانی کا یہ برملا و بے ساختہ اظہار ترقی پسند شاعری کو کس طرح رد کرتا ہے۔سردار کے لفظوں میں:

''ترقی پسند شاعروں نے اختر شیرانی کی اس روایت کو آگے بڑھا کر اردو شاعری کو زیادہ فطری بنا دیا اور اب ترقی پسند شاعری میں عورت معشوقہ' بیوی' ماں' مجاہدہ ہر روپ میں نظر آتی ہے''۔ 184

علی سردار جعفری کا تنقیدی مضمون'' غالب کی شاعری کا ہندی ترجمہ اور جمالیاتی فضا کی بازیافت'' نقوش غالب نمبر 3' شمارہ 116' 1971 میں شائع ہوا۔

بارہ صفحات پر مشتمل اس مضمون میں منظوم ترجمے کی مشکلات بیان کرتے ہوئے سردار جعفری نے بہت سی مثالیں دی ہیں۔

لکھتے ہیں:

''نثر کے برعکس شعر میں الفاظ کی حیثیت منطقی نہیں بلکہ جذباتی ہوتی ہے بعض اوقات لفظ اپنے معنی سے بھی زیادہ حسین

ہو جاتا ہے.... یہی وجہ ہے کہ کسی زبان کے شاعرانہ الفاظ کا ترجمہ قطعاً ناممکن ہو جاتا ہے۔ وہی ایک لفظ اگر نثر میں آئے تو ترجمے کا متحمل ہوسکتا ہے لیکن نظم میں آ کر اتنا نازک بن جاتا ہے کہ اس کو ہاتھ لگاتے ڈر لگتا ہے۔ ان شاعرانہ لفظوں کا جذباتی اور وجدانی مفہوم کتابی ترجمے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے اور جمالیاتی احساس کے حدود کا کوئی تعین ممکن نہیں ہے..... اردو میں ذوق، شوق، رشک، حسد، ہوس، حسرت، آرزو، تمنا، خواہش، ناز، انداز، ادا، شوخی، تکلف، فتنہ، بلا، غنیمت، کیفیت، جوش، مفرح، مجلس، محفل وغیرہ معمولی بول چال کے الفاظ ہیں جن کا ہندی بدل تلاش کرنا آسان کام نہیں ہے پھر یہی الفاظ جب اپنی شکلیں بدلتے ہیں تو ترجمے کی مشکلات اور بڑھ جاتی ہیں۔ آرزو کا ترجمہ ابھیلاشا اور آرزومند کا ترجمہ ابھیلاش کیا جاسکتا ہے لیکن جب ہم آرزومندی پر آتے ہیں تو لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں...... آرزومندی آرزومند ہونے کی کیفیت کا نام ہے یعنی آرزو کرنے سے انسان کے اندر جو جذباتی تبدیلی پیدا ہوتی ہے اس کے اظہار کے لیے آرزومندی کا لفظ استعمال کیا جائے گا.... پیکر اور قامت میں فرق ہے لیکن مجبوراً دونوں کے لیے آکار استعمال کرنا پڑتا ہے..... تشبیہہ استعارہ ترجمہ ہونے کے بعد بھی تشبیہہ اور استعارہ باقی رہتا ہے لیکن رمز صرف اصل لفظ کے ساتھ محدود ہے ترجمے میں اس کا جادو ٹوٹ جاتا ہے قفس جب پنجرہ ہو جائے اور دار و رسن پھانسی تو اچھے سے اچھا شعر بُری نثر میں تبدیل ہو جائے گا...... اضافت سے بنی ہوئی ترکیبوں کا ترجمہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے سنگم پر گنگا اور جمنا کی لہروں کو الگ الگ کرنے کی کوشش.... اشعار میں جو ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں مثلاً آئینہ خانہ، ہوا، دیدار، مغنی آتش نفس، جلوہ برق فنا، دود شعلہ آواز، غبار صدا، جادۂ راہ فنا، اجزائے پریشان،..... تنک آبی.... وغیرہ ان کے ہندی مترادفات کے بغیر شعروں میں وہ محاکاتی کیفیت باقی نہیں رہ سکتی جس نے ان اشعار کو حسن بخشا ہے۔ ان میں سے بعض کے ترجمے ممکن ہیں اور بعض کے نہیں..... بعض اوقات شاعری میں فاضل الفاظ بھی ملتے ہیں جو ترجمے کی گرفت میں نہیں آتے..... اور جو بات ''ماورائے سخن'' یا ''ورائے شاعری ہوتی ہے اس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ اس کی لذت کو صرف روح چکھ سکتی ہے، ذہن محسوس کرسکتا ہے اور اس کے لیے کام و دہن کی تربیت ضروری ہے۔ لفظ صرف پڑھے نہیں جاتے بلکہ چکھے بھی جاتے ہیں اور سونگھے بھی جاتے ہیں اور سنگیت کی طرح سنے بھی جاتے ہیں''۔

مضمون کے آخر میں سردار جعفری نے ہندی کے لیے اردو سے ترجمہ کو گائیڈ کی حیثیت دیتے ہوئے اصل شاعری کی جمالیاتی فضا کی بازیافت کے مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''جن زبانوں میں اتنا بُعد ہو جتنا انگریزی اور اردو میں ہے ان میں ترجمہ ایک ایسی مجبوری ہے جس سے نجات ممکن نہیں لیکن ہندی کے لیے اردو سے ترجمہ زیادہ سے زیادہ ایک گائیڈ کی حیثیت رکھتا ہے جو اس وقت تک اہم ہے جب تک سیاح تاج محل تک پہنچا نہیں ہے۔ اس کے بعد گائیڈ مٹ جاتا ہے اور تاج محل اپنی ساری نزاکت سارے حسن کے ساتھ سیاح کی روح سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ دراصل یہ مسئلہ اصل شاعری کی جمالیاتی فضا کی بازیافت کا مسئلہ ہے'' 185

سجاد ظہیر پر سردار جعفری کا یہ مضمون ''رقص و شرر'' ماہنامہ ''گنگ و جمن'' کانپور، سجاد ظہیر نمبر 1976 میں شائع ہوا۔ مضمون کی ابتداء میں سردار جعفری نے کچھ اشعار لکھے۔ اس کے بعد لکھا کہ سجاد ظہیر ایک ایسی ہی چنگاری تھے۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ

میں دفن ہیں جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور خواجہ غلام السیدین جیسے ممتاز اہل علم اور وطن دوست ابدی نیند سو رہے ہیں۔انہوں نے بتایا کہ برطانوی حکومت نے رجعت پرستوں اور قدامت پرستوں کے دباؤ میں آکر ''انگارے'' کو ضبط کرلیا تھا پھر بھی افسانوں کا یہ مجموعہ ہمارے ادب کا ایک موڑ بن گیا تھا۔سردار جعفری نے بتایا کہ سجاد ظہیر کا ان پر پہلا تاثر بہت خوشگوار تھا وہ پر خلوص، محنتی اور نرم گفتار نوجوان نظر آئے۔

سجاد ظہیر کے مشن اور ان کی قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

''بنّے بھائی کے سارے بھائی خوب پیسہ کمارہے تھے لیکن بنے بھائی نے سیاسی اور تہذیبی کاموں کو ترجیح دی اور انہیں سرگرمیوں کیلئے اپنی ساری زندگی وقف کردی۔اُن دنوں کمیونسٹوں کو نئے زمانہ کا اولیا سمجھا جاتا جنہیں اپنی مفلسی پر ناز تھا۔'' 186

ترقی پسند تحریک کی سراہنا کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا:

''1942 سے 1948 تک ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کا دور تھا جو ساری زبانوں پر محیط تھی اور اس نے ادب کا بہت بڑا اور بہت اچھا ذخیرہ پیش کیا۔ہندوستان میں اتنی زبردست تہذیبی تحریک اس سے پہلے کبھی نہیں اٹھی تھی۔ہماری تحریک آزادی سے اس کی گہری وابستگی تھی۔ترقی پسند کا لفظ باعث افتخار بن گیا'' 187

''ن۔م۔راشد'' عنوان سے سردار جعفری کا مضمون رسالہ گفتگو ممبئی 1976 میں شائع ہوا۔

ن۔م۔راشد کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

''9/اکتوبر 1975 کو لندن میں ن۔م۔راشد کا انتقال ہوگیا (اخبارات میں 11/اکتوبر کی تاریخ چھپی ہے)۔میں نظریاتی اختلاف کے باوجود راشد کا شمار اس عہد کے اہم بزرگ شعرا میں کرتا ہوں۔وہ اردو شاعری کی تاریخ میں آزاد نظم کے خالق کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔راشد انقلابی شاعر نہیں تھے باغی تھے۔مذہب کے معاملے میں لاادریت کے قائل تھے۔انتقال کے بعد ان کی لاش دفن نہیں کی گئی بلکہ وصیت کے مطابق نذر آتش کی گئی۔وہ کمیونزم کے مخالف تھے۔(لیکن 1947ء میں فرقہ وارانہ فسادات کے دوران کمیونسٹوں کے رویے سے اس قدر متاثر ہوئے کہ کمیونسٹ پارٹی میں داخل ہونے کی خواہش ظاہر کی)۔انہوں نے چند نظمیں کمیونزم کے خلاف لکھیں جو ان کی دوسری کتاب ''ایران میں اجنبی'' کے صفحات کی زینت ہیں (اس کے لیے ان کو رجعت پسند کہا گیا)''۔ 188

ن۔م۔راشد کے تین شعری مجموعوں ''ماورا'' ''ایران میں اجنبی'' اور ''لا=انسان'' میں ان کے تصور انسان کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

''راشد کی شاعری کا سفر راشد کے تصور انسان کا سفر ہے۔''ماورا'' کا انسان شکست خوردہ ہے، رومانیت زدہ ہے۔فرار، سیاسی غلامی کے لیے عورت کے جسم سے انتقام اور خودکشی کے عذاب میں مبتلا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ لفظ اور استعارہ میں تازگی ہے اور شعری آہنگ میں ایک نشاطیہ کیفیت ہے۔ان لفظوں میں بعض نہایت خوبصورت مصرعے اور نہایت خوب صورت بند ہیں۔شاید یہ خوب صورتی راشد کے دل میں بیٹھے ہوئے انسان کے نشاط تصور سے پیدا ہوئی ہے۔یہ انسان 'ایران میں اجنبی'' میں انگڑائی لیتا ہے اور ''لا=انسان'' میں اپنے حسن کے بعض گوشوں سے نقاب اٹھاتا دکھائی دیتا ہے۔آخری

مجموعے کا انسان نہ تو شکست خوردہ ہے، نہ رومانیت زدہ، نہ فرار اور خودکشی کے عذاب میں مبتلا۔ وہ ایک پُرکیف شخصیت ہے جو زندگی کے رنگ و نور میں نہا رہی ہے اور مستقبل کے بہتر انسانوں کے خوابوں میں کھوئی ہوئی ہے..... راشد کی شاعری میں اقبال کی طرح فکر جذبے پر حاوی ہے۔ ان کی شاعری بہت زیادہ فارسی آمیز ہے لیکن انہوں نے لفظوں کا ایک نیا احساس اور آہنگ کا ایک نیا شعور دیا ہے۔ یہ آہنگ بلند اور پروقار ہے"۔ 189

جی شیشندر شرما مشہور تلگو شاعر ہیں ان کی نظم "نا دیشو ناپر جلو" کا اردو ترجمہ اختر حسن نے کیا۔ سردار جعفری نے اردو ترجمہ کا مطالعہ "میری دھرتی میرے لوگ" پیش کیا جو ماہنامہ پونم، حیدرآباد کے اگست 1977 کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔

جی شیشندر شرما کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

"ایک بلند قامت شاعر کی بلند قامت تخلیق میرے سامنے ہے یہ بات قابل رشک ہے کہ تلگو زبان میں ایسی دولت ہے اور اس حقیقت میں میرے لیے ایک حیرت ناک مسرت ہے کہ تلگو زبان کا یہ حساس اور جمال پرست شاعر جو انقلابی جلال کی بلندی تک جاتا ہے اور جس کا دل انسانی محبت کے نور سے جگمگا رہا ہے میرا ہمعصر ہے۔ شاید یہ کہنا بہتر ہوگا کہ میں اس کا ہمعصر ہوں"۔

شیشندر شرما کی مذکورہ نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

"یہ نظم رنگ و آہنگ کا ایک خوبصورت آبشار ہے..... نادر تشبیہوں، اچھوتے استعاروں اور بے مثال لفظی پیکروں کا ایک جلوس ہے جس کو ساتھ لیے شاعر شہر سے گاؤں سے، زمین سے، آسمان سے گزر رہا ہے..... اس کی یہ ساری شاعرانہ فوج جس میں مزدور، کسان، عاشق بھی شامل ہیں عصر حاضر کی بے انصافیوں اور انسان کی تذلیل کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے لیے وجود کے میدان میں اتری ہے۔ یہ نظم غنائی کیفیات سے مالا مال ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس میں ایک رزمیہ انداز بھی ہے۔ میں اس کو مکمل طور سے رزمیہ نہیں کہہ سکتا..... یہ والٹ وھٹ من کی شاعری سے زیادہ قریب ہے۔ یہ ہندوستان کا رزمیہ ہے جو اپنی شاعرانہ بلندی کو چھوتے چھوتے عہد حاضر کی ساری دنیا کا رزمیہ بن جاتا ہے۔" 190

نظم میں غذا کے تعلق سے اشعار پیش کرتے ہوئے سردار جعفری لکھتے ہیں: "یہ ابدی حقیقت ایک سطح پر مادہ اور شکتی ہے جو مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے۔ ایک چیز سے دوسری چیز پیدا ہوتی ہے۔ یہ تبدیل ہوتی رہتی ہے لیکن فنا نہیں ہوتی، ختم نہیں ہوتی۔ دوسری سطح پر یہ ایک اخلاقی قانون کا اعلان ہے جو دوسرے کو غذا دیتا ہے وہ اپنے لیے غذا محفوظ کرتا ہے۔ غذا ساری انسانیت کی ملکیت ہے، غذا ساری انسانیت میں تقسیم ہونی چاہیے۔" 191

سردار جعفری نے لکھا ہے کہ شاعر شیشندر شرما نے اس خوبصورت نظم کو صرف نو دن میں لکھا ہے۔ آخر میں سردار جعفری نے لکھا ہے کہ ہندوستان کی زبانوں کے درمیان براہ راست ترجمے کے ذریعے سے یہ لین دین اگر اور بڑھے گا تو ہمارے ادب و شعر کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

سردار جعفری نے ایک مضمون "اقبال کی غزل" 1977 میں لکھا جس میں انہوں نے اقبال کی غزلوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے، اقبال کی غزلوں اور حافظ، غالب اور رومی کی غزلوں میں مماثلتوں کا ذکر کیا، تشبیہات، استعارے، تلمیحات، بلند

آہنگی، نئی فکر، نیا آہنگ کی ستائش کی۔انہوں نے اس بات کی بھی ستائش کی کہ اقبال کی غزل عام فہم ہے اور اس میں قنوطیت نہیں ہے۔سردار جعفری نے ایک بہت ہی اہم بات کا بھی ذکر کیا کہ اقبال نے اپنی غزل سے عہد نو کی تنقید کا کام لیا ہے۔

''اقبال کی غزل میں حافظ کی سرشاری، غالب کی بلندی فکر اور رومی کے دل کی بیتابی ہے.....بلند آہنگی ہے، براہ راست گفتگو ہے، نئی فکر ہے، نیا آہنگ ہے جس کی مثال اردو اور فارسی شاعری کی ایک ہزار برس کی تاریخ میں نہیں ملتی۔یہی اقبال کی غزل کا اعجاز ہے۔یہ تصورات کی شاعری ہے، ایسے تصورات جن کی گرمی لفظوں کو پگھلا دیتی ہے اور یہ الفاظ قاری کے دل و دماغ پر ایک عظیم فکری آبشار بن کر گرتے ہیں.....اقبال کی دوسرے قسم کی غزل وہ ہے جس میں تشبیہ، استعارہ، تلمیح وغیرہ سے حسن معنی کی مزید آرائش کی گئی ہے.....اقبال کی بعض غزلوں میں ایک ہی مرکزی خیال مختلف اشعار کے پیکر میں ظاہر ہوتا ہے مثلاً اپنی بال جبریل کی ایک غزل میں انہوں نے اپنے فلسفۂ خودی کو اس طرح پیش کیا ہے جس سے مرد کامل کے خد و خال ابھرتے ہیں، ان اشعار میں انداز بیان براہ راست ہے اور معنوی حسن کے علاوہ کسی اور آرائش سے کام نہیں لیا گیا ہے.....

اقبال کی غزل کی ایک قسم وہ ہے جسے دعائیہ غزل کہنا چاہیے۔اس میں شاعر خدا سے ہم کلام ہوتا ہے.....خودی انسان کی تخلیقی قوتوں کی بیداری ہے جو خدا کی ناتمام دنیا کو تکمیل کی منزل کی طرف لے جاتی ہے.....اقبال کو انسان کی عظمت کا پورا احساس ہے یہ دعائیہ غزلیں اردو شاعری میں ایک عظیم الشان اضافہ ہیں.....ان غزلوں میں اور بانگ درا کی غزلوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔بانگ درا کی غزلوں کا لہجہ زیادہ سے زیادہ شاعرانہ ہے لیکن بال جبریل کی غزلوں کا لہجہ پیغمبرانہ ہے۔دونوں کتابوں کی اشاعت میں تقریباً دس سال کا فرق ہے۔ان دس سالوں میں اقبال نے اپنی غزل گوئی کی تربیت دراصل فارسی غزل گوئی کے ذریعہ سے کی ہے۔ان کا شاعرانہ ارتقا زبور عجم میں تلاش کیا جاسکتا ہے جس کی اشاعت 1927 میں ہوئی تھی۔غزلوں کا یہ آہنگ جو بانگ درا میں تقریباً ناپید ہے، سب سے پہلے زبور عجم کی غزلوں میں نمایاں ہوتا ہے۔اقبال نے اپنی غزل سے عہد نو کی تنقید کا بھی کام لیا ہے اور نہایت بے تکلفی سے فرنگی فرنگ اور یورپ کے الفاظ غزل کے سانچے میں ڈھال دیئے ہیں.....اقبال کی غزل میں نہ قنوطیت ہے، نہ ابہام، نہ عدم وضاحت۔یہ بلند آہنگ اور بے باک غزل ہے۔اس میں مائیکل انجلو کے فن کی طاقت ہے''۔ 192

علی سردار جعفری نے کرشن چندر کے افسانہ ''کالو بھنگی'' کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔

اس کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

(1) ''میں آج پریم چند کے تسلسل کی ایک کڑی کرشن چندر کے ایک افسانے ''کالو بھنگی'' کو بنیاد بنا کر بات کروں گا جس کے ادبی پرچم پر پریم چند کا یہ مقولہ ہے کہ ''ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا.....''۔

(2) ''کالو بھنگی ایک ایسی کہانی ہے جس میں نہ کردار ہے نہ پلاٹ۔اس کے بعد بھی وہ کہانی ہے۔کامیاب کہانی ہے اور پریم چند کی پوری روایت کی وارث ہے۔یہ ایک ایسی کہانی ہے جس میں کچھ نہیں ہوتا۔وہ کرشن چندر کے اعتراف شکست سے شروع ہوتی ہے اور اعتراف شکست پر ختم ہوتی ہے کہ میں کالو بھنگی پر کوئی کہانی نہیں لکھ سکتا۔یہ شخص کالو بھنگی کرشن چندر کی زندگی سے لے کر موت تک ایک آسیب کی طرح اس کے شعور پر سوار رہتا ہے اور اب کرشن چندر کے مرجانے کے بعد بھی اپنی

جھاڑو ہاتھ میں لیے کھڑا ہے اور زبان بے زبانی سے کہہ رہا ہے کہ مجھ پر کہانی لکھ دو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کرشن چندر آنے والی نسلوں سے کہہ رہا ہے کہ کالو بھنگی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اگر کہانی لکھ دو گے تو یہ اپنی جھاڑو لے کر چلا جائے گا لیکن تم اس پر کہانی نہیں لکھ سکو گے جیسے میں نہیں لکھ سکا کیونکہ آٹھ روپے کی آمدنی پر کہانی نہیں لکھی جا سکتی اور پھر کالو بھنگی کی زندگی میں کچھ ہوتا بھی تو نہیں ہے۔ اس نے عمر بھر کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی کام کیا ہے۔ اسپتال کی گندگی اٹھانا اور صفائی کرنا اور پھر اپنی جھاڑو لے کر کرشن چندر کے سامنے آجانا اور ہونٹ ہلائے اور زبان چلائے بغیر یہ مطالبہ کرنا کہ چھوٹے صاحب ہم پر کہانی لکھ دو..... کالو بھنگی آخری دن تک وہی کالو بھنگی ہے جو پہلے دن تھا.....''۔

(3)''.....اپنی کہانی کالو بھنگی میں کرشن چندر نے کوئی فضا بھی تخلیق نہیں کی صرف کالو بھنگی کا جغرافیائی ماحول بیان کر دیا ہے اور چند لوگوں کے بارے میں اطلاع دی ہے جو اسپتال میں کالو بھنگی سے ذرا اونچے درجے کے ہیں..... کالو بھنگی کا حلیہ یہ ہے۔ بڑے بڑے ننگے گھٹنے پھٹے پھٹے کھردرے بدہیئت پاؤں سوکھی ٹانگوں پر ابھری ہوئی دریدیں' بھوکے پیٹ کی سیاہ جلد پر سلوٹیں' مرجھائے ہوئے' سینے پر گرد آلود بالوں کی جھاڑیاں' ناک کے نتھنے پھیلے پھیلے' گالوں پر جھریاں' آنکھیں نیم تاریک گڑھے اور سر کی جگہ ننگی چندیا۔ انداز گفتگو بے حد پھیکا سیٹھا''۔

(4)''.....آٹھ روپے ملتے ہیں مجھے.....چار روپے کا آٹا' ایک روپے کا نمک' ایک روپے کا تمباکو' آٹھ آنے کی چائے' چار آنے کا گڑ' چار آنے کا مصالحہ،.....ایک روپے بنئے کو دیتا ہوں۔ اس سے کپڑے سلوانے کے لیے روپے کرج لیتا ہوں.....بڑے صاحب ایک روپے تنخواہ میں بڑھا دیں تو مجا آجائے.....گھی کھاؤں گا ایک روپے کا اور مکئی کے پراٹھے کھاؤں گا' کبھی پراٹھے نہیں کھائے۔ مالک بڑا جی چاہتا ہے.....کالو بھنگی تم نے بیاہ نہیں کیا' نہیں چھوٹے صاحب.....اس علاقے میں میں ہی ایک بھنگی ہوں اور دور دور تک کوئی بھنگی نہیں ہے.....پھر ہماری شادی کیسے ہو سکتی ہے.....''

(5)''.....اس مکالمے سے جو کردار ابھرتا ہے وہ ایک دبے اور پسے ہوئے مظلوم انسان کا کردار ہے جو اتنا مظلوم ہے کہ اس کو اپنی مظلومیت کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ اتنا کچلا ہوا ہے کہ اس کے دل میں کوئی تمنا' کوئی آرزو نہیں ہے۔ زندگی میں صرف کام ہے اور وہ بھی انتہائی غیر دلچسپ اور گندہ کام۔ کوئی سکون کوئی راحت نہیں۔ اس کے تمام احساسات مر چکے ہیں۔ یہاں تک مر چکے ہیں کہ جب وہ اسپتال کے کمپاؤنڈ کو جو اس سے درجے میں بڑا ہے بیمار لڑکیوں سے عشق و محبت کا اظہار کرتے دیکھتا ہے تب بھی اس کے دل میں عشق و محبت کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ رشک' حسد' نفرت' کچھ نہیں۔ یہ ساری باتیں کرشن چندر نے ان الفاظ میں نہیں کہی ہیں لیکن نہایت چابکدستی سے کہانی کے تانے بانے میں پرو دی ہیں۔ کالو بھنگی کا کوئی دوست نہیں ہے۔ کوئی ساتھی نہیں ہے.....'' اسپتال میں بیمار آتے ہیں' اچھے بھی ہو جاتے ہیں' مر بھی جاتے ہیں لیکن یہ کالو بھنگی' بے حس اور بے معنی کالو بھنگی ایسے ہی اپنی جھاڑو لیے کھڑا رہتا ہے.....''

(6)''.....مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ کالو بھنگی کوئی کردار نہیں ہے۔ یہ ہماری سماجی زندگی اور معاشرتی وجود کی بدصورتی کی علامت ہے جس کو بیان کرنے کی طاقت کسی ادیب کے قلم میں نہیں ہے۔ اس کا خاموش وجود ہندوستان اور دنیا کے مظلوم انسان کی معکوس تمنا ہے جیسے وہ ایک گالی ہے جو بدسلوکی کو ختم کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے۔ یہ علامتی کردار

زمانے کے صدیوں پرانے ظلم کی تخلیق ہے اور اس ظلم کو بھی کوئی تنہا ادیب ختم نہیں کرسکتا اور خود کرشن چندر نے اس افسانے کے خاتمے پر اپنے حسین و جمیل انداز میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ تنہا ادب سماجی حقیقت کو تبدیل نہیں کرسکتا۔ ادب اس سماجی آسیب اس کابوس کو محسوس کرسکتا ہے، دیکھ سکتا ہے اور دوسروں کو دکھا سکتا ہے۔ تبدیلی لانے کیلئے ادب کو اپنا رشتہ سماج کے تانے بانے سے جوڑنا ہوگا۔ ادب وقت اور تاریخ کی راہوں سے بے نیازانہ نہیں گزر سکتا..... یہ ایک با مقصد اور Committed ادیب کا نظریہ ہے.....''

(7)''.....میں اس مقالے کو کرشن چندر کی کہانی کے ایک طویل اقتباس پر ختم کروں گا جو کالو بھنگی کی تمنا ہے جس سے وہ خود ناواقف ہے اور افسانہ نگار اس تمنا میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس اقتباس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ افسانہ نگار کالو بھنگی کے وجود ہی کو ختم کردینا چاہتا ہے اور اس کے لیے تنہا افسانہ نگار کافی نہیں ہے بلکہ ساری انسانی دنیا کی شرکت ضروری ہے۔

''(اقتباس).....اور تو اسی جھاڑو لیے میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا اور میں کوئی عظیم افسانہ نہ لکھ سکوں گا، جس میں انسانی روح کی مکمل مسرت جھلک اٹھے، اور کوئی معمار عظیم عمارت تعمیر نہ کرسکے گا جس میں ہماری قوم کی عظمت اپنی بلندیاں چھولے اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے گا جس کی پنہائیوں میں کائنات کی آفاقیت جھلک جائے۔ یہ بھرپور زندگی ممکن نہیں جب تو جھاڑو لئے یہاں کھڑا ہے۔ اچھا ہے کھڑا رہ پھر شاید وہ دن کبھی آجائے گا کہ تجھ سے تیری جھاڑو چھڑا دے اور تیرے ہاتھوں کو زمی سے تھام کر تجھے قوس قزح کے اس پار لے جائے''۔

(8)''.....لیجئے کرشن چندر کا اقتباس ختم ہوا اور اس کی یوتو پیا کا پورا خواب آپ کے سامنے ہے.....کرشن سے پہلے غالب نے اپنے عاشقانہ خواب کو اس طرح بے کم و کاست بیان کیا ہے.....اور کرشن چندر میں غالب کی جرأت رندانہ ہے کیونکہ اس کو حسن کا معیار تبدیل کرنا ہے جس سے یہ سماج تبدیل ہوگا اور یہ بغیر جرأت رندانہ کے ممکن نہیں ہے اور یہ پریم چند کا ورثہ ہے۔ یہی اس کا نو بہار ناز ہے اور یہی وہ غنچۂ ناشگفتہ جس کو وہ پھول بنادینا چاہتا ہے۔ اس کے بعد بھی یہ کہنا پڑے گا کالو بھنگی اردو افسانے میں سب سے بڑا کنایہ ہے سب سے بڑی علامت ہے''۔ 193

سردار جعفری نے فن اور ٹیکنیک کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''صرف ٹیکنیک خوبی بڑے فن کی ضامن نہیں ہے۔ فن اور ٹکنک میں یہ فرق ہے کہ فن لفظ و معنی، جسم و جان دونوں کا ارتباط ہے جبکہ ٹکنک صرف جسم ہی جسم ہے''۔ 194

سردار جعفری نے تخلیقی فن کار کو نقاد سے زیادہ تنقیدی صلاحیت کا حامل قرار دیا ہے۔

انہوں نے مثالوں سے اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

(1)''ہر سنجیدہ شاعر اور ادیب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ادبی ماضی کی بازیافت خود کرے اور پیشہ ور نقادوں کی رائے کا احترام کرتے ہوئے اس سے حتی الامکان گریز کرے ورنہ میر تقی میر کے بہتر نشتروں کو میر کی کل کائنات سمجھنے پر مجبور ہونا پڑے گا''۔

(2) ''میں نقاد کو کم تر یا حقیر نہیں سمجھتا ہوں۔ بعض نقادوں کے لیے میرے دل میں بڑا احترام ہے جیسے لیو کاش یا آنند کمار سوامی۔ ایک مارکسی نقطہ نگاہ کا حامل ہے اور دوسرا مابعد الطبیعیاتی نقطہ نگاہ اور عینیت کے فلسفے کا علمبردار۔ لیکن دونوں میری نظر میں عظیم ہیں اور ان کی تحریریں پڑھنا لذت سے خالی نہیں۔ پھر بھی میں یقین رکھتا ہوں کہ ادب اور شعر کا معیار نقاد مقرر نہیں کرتا اور نہ وہ ادب کے دھارے کا رخ پھیر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خود آنند کمار سوامی نے جنہوں نے ہندوستانی اور ایشیائی فنون لطیفہ کے اسرار و رموز سے مغرب کو آشنا کرنے کی کوشش کی ایک جگہ یہ مزے کی بات لکھی ہے کہ جب اجنتا اور ایلورا کی تخلیق ہو رہی تھی تو ان کو راہ دکھانے والا کوئی نقاد نہیں تھا۔ حافظ شیرازی اور میر تقی میر کے عہد میں بھی پیشہ ور نقاد نہیں تھے۔ تذکرہ نگار تھے جو سخن فہم بھی ہوتے تھے اور طرفدار بھی۔ ان کے ہم عصروں کی رائیں تنقید سے زیادہ جذباتی ردعمل کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ادب اور فن کے جتنے اصول تھے وہ سب تخلیقی فن کاروں کی کاوش کا نتیجہ تھے۔ ہمارے ادب کا یہ کردار جس کو پیشہ ور نقاد کہتے ہیں۔ جدید مغربی ادب کی دین ہے۔ ادب کا معیار خود ادیب اور شاعر مقرر کرتا ہے اور بعض عظیم تخلیق کار ادب کا معیار بھی بدل دیتے ہیں۔ لفظوں کے معنی اور مفہوم تک کو بدل دیتے ہیں جیسے اقبال نے خودی کا مفہوم بدل دیا چنانچہ پریم چند نے بھی اپنے ادب کا معیار خود مقرر کیا تھا''۔ 195

سردار جعفری نے عشق کے بارے میں بتایا کہ ''عشق سب سے زیادہ لطیف چیز ہے اور اشارے اور کنائے تو اس کا سب سے بڑا حسن ہے۔ اس کی جان ہیں''۔ 196

سردار جعفری کے مطابق ''پریم چند کی روایت زیادہ جاندار ثابت ہوئی اور یہ سماجی حقیقت نگاری کی روایت ہے۔ ترقی پسند تحریک کے تمام افسانہ نگار اس روایت کو لے کر آگے بڑھے ہیں اور اس صدی (بیسویں صدی) کی چوتھی اور پانچویں دہائی کے چار بڑے ستون' کرشن چندر' راجندر سنگھ بیدی' سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی ہیں۔ اس کارواں میں اور بھی بہت سے نہایت اہم افسانہ نگار شامل ہیں جن کی تعداد ستر اسی تک پہنچتی ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے تجربات کے مطابق موضوعات میں نیا تنوع پیدا کیا ہے اور اپنی بصیرت کے مطابق نئے نئے اسالیب اور نئی نئی تکنک بھی استعمال کی اور افسانے کی دنیا میں بہار آ گئی۔ وہ اہم افسانہ نگار بھی جو براہ راست پریم چند کی وراثت لے کر نہیں آئے ہیں جیسے قرۃ العین حیدر وہ بھی پریم چند سے کترا کر نہیں گذرے ہیں'' 197

کرشن چندر نے اپنی کہانیوں کی تکنک میں جو تجربے کیے اس کی ستائش کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

''اپنے ہم عصروں میں کرشن چندر نے سب سے زیادہ کہانیاں لکھی ہیں۔ اس کا قلم ایک آبشار کی طرح گیت گاتا رہا ہے۔ ان میں کمزور کہانیاں بھی ہیں اور ایسی کہانیاں بھی جو شاہ کار کا درجہ رکھتی ہیں اور عہد حاضر کی کلاسیکی کہانیوں میں شمار کی جائیں گی۔ اس بسیار نویس سے کم لکھنے والوں کے یہاں بھی رطب و یابس موجود ہے۔ یہ تخلیقی عمل کا حصہ ہے۔ درخت کی کوئی بھی شاخ جب درجنوں پتیاں پیدا کرتی ہے تو ایک پھول کھلاتی ہے۔ کرشن چندر کی دوسری خصوصیت یہ ہے' جس میں کوئی ہم عصر اس کے قریب نہیں پہنچتا کہ اس نے کہانی کی تکنک میں بے شمار تجربے کیے ہیں۔ اس میں بھی اس کو کامیابی اور ناکامی دونوں سے سابقہ پڑا ہے۔ بالکونی' زندگی کے موڑ پر' ان داتا' بہت جاگتے ہیں' تین غنڈے' پشاور ایکسپریس' برہم پترا' کالو بھنگی'

غالیچہ صرف چند کہانیوں کا نام ہیں جن میں ہر ایک کی تکنیک الگ الگ ہے۔آج سے تیں پینتیس برس پہلے وہ Abstract کہانی کا تجربہ کر چکا تھا۔بغیر کردار کی کہانی کا تصور دے چکا تھا''۔ 198

سردار جعفری نے ''ترقی پسند ادب'' میں کرشن چندر کی کہانیوں کی ستائش کی:

(1) ''اس نے قحط بنگال کے بعد سے جیسے مورچہ بنا کر کہانیاں لکھنا شروع کیں اور ایک سے ایک بہتر کہانی لکھی''۔

(2) کرشن چندر نے اپنے خوبصورت افسانے ''کہانی کی کہانی'' میں کہنے کو تو اپنے ادبی سفر کی مختلف منزلیں ہیں جو رومان سے انقلاب تک پھیلی ہوئی ہیں۔ہر منزل اور ہر موڑ پر ترقی پسند ادب کا کارواں چلتا ہے''۔ 199

پروفیسر محمد بیگ احساس نے اپنی تصنیف ''کرشن چندر ''شخصیت اور فن'' میں لکھا ہے کہ کرشن چندر نے فسادات پر کہانیاں لکھی ہیں۔انہوں نے سردار جعفری کا لکھا ایک دیباچہ کا حوالہ دیا جس میں فسادات پر لکھنے کی درخواست کی گئی ہے۔

''اگست 1946 میں ملک کے مختلف مقامات پر فسادات ہوئے۔کلکتہ' نواکھالی' بہار' راولپنڈی' امرتسر' لاہور' ممبئی' دہلی' میوات اور پورا پنجاب اس آگ کی لپیٹ میں جلنے لگتا ہے۔کرشن چندر نے 1948 تک صرف فسادات پر ہی کہانیاں لکھیں اور اپنا فرض ادا کیا۔پنجاب اور بنگال تقسیم ہوا اور کرشن چندر کا تعلق پنجاب سے تھا اس لیے انہیں فطری طور پر ان فسادات سے بہت دکھ پہنچا۔ترقی پسندوں نے ان فسادات کے خلاف لکھنے کی اپنے ادیبوں سے درخواست کی۔

سردار جعفری لکھتے ہیں:

''بمبئی کے ادیبوں اور فن کاروں نے امن کا جلوس نکالا۔پاکستان کے ادیب اپنی کانفرنس کر رہے ہیں لیکن اکثریت کی زبانیں ابھی گنگ ہیں۔ان کے قلم خاموش ہیں۔جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے اوپندر ناتھ اشک' عصمت چغتائی' احمد عباس' کیفی اعظمی' یوسف ظفر' فکر تونسوی اور کرشن چندر کے علاوہ کسی ادیب نے فساد پر قلم نہیں اٹھایا''۔ 200

علی سردار جعفری کا لکھا تنقیدی مضمون کیفی اعظمی کا انگریزی سے اردو ترجمہ ڈاکٹر شمشاد جھٹنا گر نے کیا اور یہ ''کیفی اعظمی: عکس اور جہتیں'' مرتبہ شاہد ماہلی میں شامل ہے۔اس مضمون کی ابتداء میں سردار جعفری نے بتایا کہ اطہر حسین جو کیفی اعظمی کے نام سے مشہور ہیں۔اعظم گڑھ کے گاؤں ''مجواں'' میں پیدا ہوئے بچپن میں انہوں نے اردو اور فارسی پڑھی' باضابطہ تعلیم حاصل کرنے سے پہلے ہی انہیں کچھ چیدہ چیدہ اشعار زبانی یاد تھے' بیت بازی کے کھیل میں وہ بہت ماہر تھے۔بڑے ہوئے تو انہوں نے حافظ' سعدی' میر' غالب کو پڑھا' اعلیٰ شاعری کو جذب کرنے کے اس تجربے نے ان کی روح کو بالیدگی بخشی اور ذہن کو آزاد کیا۔1943 میں کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کے مرکزی دفتر کی راہ پکڑی اور ایک اخبار نویس بن گئے۔تہذیب و ادب کی عظیم ہستیوں سے تعلقات سے کس قدر علمی و ادبی فیض حاصل ہو سکتا ہے۔اس کا ذکر سردار جعفری نے کیفی کے حوالہ سے کیا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''یہاں (ممبئی میں) انہیں (کیفی اعظمی) ہندوستانی تہذیب اور ادب کی عظیم ہستیوں سے ملنے کا موقع ملا جیسے ہندی شاعر سمترا انندن پنت اردو شاعر جوش ملیح آبادی' ملیالم کے شاعر اور کتھاکلی کے ترجمان ونے تول' مراٹھی ڈرامہ نویس ماما وریکر' مقبول رقاص اودے شنکر' فلم اداکار کے ایل سہگل اور پرتھوی راج کپور اور ان جیسی بہت سی ہستیاں جو پارٹی کے مرکزی ہیڈ

کوارٹر میں برابر آیا کرتے تھے جسے ''راج بھون'' کہا جاتا تھا۔ان تعلقات سے کیفی صاحب کی شاعری کو ایک اچھوتی تازگی اور خیالات کو بلندی عطا کی''۔ 201

سردار جعفری نے بتایا کہ کیفی ناگپاڑہ ممبئی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہا کرتے تھے۔انہیں اپنی بیٹی شبانہ اعظمی کی تعلیم پر روپیہ خرچ کرنے کیلئے بہت سی ذاتی قربانیاں کرنی پڑیں۔اسی دوران کیفی ایک فلم رائٹر کی حیثیت سے ابھرے انہوں نے فلموں کے لیے ڈائیلاگ اور گیت لکھے اور چیتن آنند کی فلم ہیر رانجھا کی مکمل اسکرپٹ منظوم لکھی۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے سردار جعفری کی جوشؔ کے بارے میں رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

جوشؔ کے سلسلہ میں سردار جعفری کی رائے ہے کہ وہ انقلابی سے زیادہ رومانی شاعر ہیں۔وہ جوش کو پورے طور پر انقلابی شاعر تسلیم کرنے میں تکلف کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ اردو شاعری میں انقلاب کا لفظ سب سے پہلے اقبال نے استعمال کیا ہے۔سرمایہ دار' مزدور' زمیندار' کسان' آقا' غلام' حاکم اور محکوم کی باہمی کشاکش کے موضوعات پر سب سے پہلے اقبالؔ نے نظمیں کہی ہیں۔پھر جوش کو ''شاعر انقلاب'' کا خطاب کیوں دیا گیا۔وہ جوش کو محض ایک ایجی ٹیشنل شاعر تسلیم کرتے ہیں لیکن ان کی اس قسم کی شاعری میں بھی آزادی کا جو تصور ابھرتا ہے وہ بڑے کام کی چیز ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں ان کی شاعری سماج کے ظلم' فریب اور ریاکاری کا پردہ چاک کرتی ہیں۔عدل وانصاف' محبت کی ترغیب دیتی ہیں اور پھر انسان دوستی کی اس منزل پر پہنچ جاتی ہیں جہاں شاعر کہہ اٹھتا ہے۔

کوئی حد ہی نہیں اس احترام آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

وہ جوشؔ کو سوفی صدی رومانی شاعر تصور کرتے ہیں اور ان کے انقلاب کو بھی رومان کے حوالے سے دیکھتے ہیں جس کے زیر اثر وہ بہت جلد جذبات وہیجان کے طوفان میں بہہ جاتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ جوش کی رومانی فطرت انہیں جلد بازی کی ترغیب دیتی ہے اور وطن کی آزادی کے لیے وہ اس قدر بے تاب ہو جاتے ہیں کہ واقعات اور حالات کی رفتار میں اپنے تخیل کی سرعت پرواز نہ پا کر مایوس ہونے لگتے ہیں۔ایک طرف ایسی سبک رومانیت وجذباتیت جو جوش کی شاعری کا حصہ ہے تو دوسری طرف وہ جوش کی عقل پرستی کے اس قدر قائل ہیں کہ اس ضمن میں سردار' جوشؔ کو حالیؔ اور اقبالؔ سے آگے بڑھا دیتے ہیں۔شاید اس لیے کہ جوش کی عقل پرستی میں ایک باغیانہ لہر ہے۔سردار نے جوش کی منظر نگاری کو بھی ان کی عقل پرستی سے وابستہ کیا ہے لیکن کہیں بھی انہوں نے عقل پرستی کی وضاحت نہیں کی ہے۔سچ یہ ہے کہ جو الزام پریم چند کی تخلیقات پر لگتے ہیں جوش اس سے الگ نہیں ہیں۔جوش کسی منضبط فکر اور منظم نقطہ نظر کے حامل نہ تھے۔ان کی رومانی فطرت انہیں ایسا کرنے بھی نہیں دے سکتی تھی۔وہ سماج کے طبقاتی نظام کا تربیت یافتہ تصور نہ رکھتے تھے۔ایک طرف وہ عورت کو صرف حسن کی دیوی سمجھتے ہیں اور اس کے لیے محنت بری چیز سمجھتے ہیں۔دوسری طرف محنت زدہ عورت کی تصویر بھی پیش کرتے ہیں۔

آخر سردار یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

''نظریاتی اعتبار سے جوش نے ایک ایسے بے بنیاد فلسفہ کو اپنا رکھا ہے جو کسی طرح ترقی پسند نہیں کہا جا سکتا ہے۔ایک

طرف تو وہ خدا، مذہب اور تقدیر کے قائل نہیں ہیں لیکن دوسری طرف وہ انسان کو مجبور محض سمجھتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ انسان اپنے افعال پر قادر نہیں ہے جو کچھ کرتا ہے اس کے کرنے پر مجبور ہوتا ہے''۔

اس کے باوجود جوش کو بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں صرف اس لیے کہ وہ انگریز حاکم کے خلاف تھے، ساتھ میں وہ جہالت، توہم پرستی وغیرہ کے بھی خلاف تھے۔ان کی نظموں کو پڑھنے کے بعد ہمیں اپنے وطن، اپنی قوم، اپنی تہذیب وتمدن سے محبت بڑھ جاتی ہے۔جوش نے ان تضادات کے باوجود پوری نسل کو متاثر کیا اور بقول سردار ترقی پسند شاعر جوش کے اس ورثے کو لے کر ہی شاعری کر رہے ہیں۔یہیں سے پوری ترقی پسند شاعری، جس میں خود سردار جعفری کی شاعری بھی شامل ہے، کے جوش و جذبہ، رجحانات اور بعض تضادات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے''۔ 202

جوش پر سردار جعفری کی تنقید پر اظہار خیال کرتے ہوئے شافع قدوائی نے لکھا:

(1) ''جوش ملیح آبادی کو ان کی بعض واشگاف انقلابی نظموں کے باعث شاعر انقلاب کے لقب سے نوازا گیا اور بعض سرکردہ ترقی پسند نقادوں نے بھی جوش کی شاعری کی تعین قدر میں تصور انقلاب کو اساسی حوالہ بنایا تاہم سردار جعفری نے پہلی بار یہ باور کرایا کہ جوش کی نظمیں انقلابی نہیں بلکہ براہ راست سیدھی سادی ایجی ٹیشنل نظمیں ہیں جو اردو شاعری میں ایک اضافہ ہیں۔جوش کی افتاد طبع کا اور ان کے شعری اکتسابات کا محاسبہ کرتے ہوئے علی سردار جعفری نے مدلل طور پر لکھا ''جوش سو فیصد رومانی شاعر ہیں اور ان کا انقلاب کا تصور بھی رومانی ہے جس کے زیر اثر وہ بہت جلد مشتعل ہو کر جذبات اور ہیجان کے طوفان میں بہہ جاتے ہیں اور مجاہد کی شان سے نیزہ ہلاتے اور تلوار چلاتے میدان میں اتر آتے ہیں۔یہ جوش کی رومانی فطرت ہی کی کرشمہ سازی ہے کہ کبھی ان کا انقلاب مٹھیوں میں افشاں بھر کر چلتا ہے اور کبھی سرمایہ داروں کی ہڈیاں چباتا ہوا۔کبھی وہ نئی دلہن کی طرح خوبصورت ہوتا ہے اور کبھی دیو کی طرح مہیب و دہشت ناک۔اسی رومانی انقلاب پرستی کے زیر اثر وہ کبھی کبھی اپنے ابنائے وطن سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں کہ یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ نفرت وحقارت کا اظہار کر رہے ہیں اور وہ پوری ہندوستانی قوم کا نامرد، ذلیل روسیاہ سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں.....اصل میں ان کی رومانی فطرت انہیں جلد بازی کی ترغیب دیتی ہے اور وطن کی آزادی کے لیے وہ اس قدر بے تاب ہو جاتے ہیں کہ واقعات و حالات کی رفتار میں اپنے تخیل کی سرعت پرواز نہ پا کر مایوس ہونے لگتے ہیں''۔ 203

(2) ''سردار جعفری نے جوش کی طویل نظموں پر داد کے خوب ڈونگرے برسائے ہیں اور لکھا کہ وہ ان میں علمی سنجیدگی فلسفیانہ وقار، تشبیہوں اور استعاروں کی رنگینی اور ندرت، پرسکون ترنم اور پُرعظمت روانی، معنی آفرینی اور خیال آرائی کے امتزاج کا وہ معجزہ ہے جو اردو شاعری اس سے پہلے پیش نہیں کر سکی۔الفاظ کا اتنا بڑا جادوگر کبھی پہلے پیدا ہی نہیں ہوا''۔ 204

(3) جوش کے رومانی ہونے کے بارے میں سردار جعفری کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے شافع قدوائی نے بتایا کہ جوش کے بیشتر ناقدین نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے۔

''مذکورہ تنقیدی رائے کی صلابت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ جوش کے بیشتر ناقدین نے سردار جعفری کے بنیادی نکتہ یعنی جوش انقلابی نہیں بلکہ رومانی شاعر ہیں، کی محض تفصیل مرتب کی ہے۔سردار جعفری نے جوش کے اسلوبیاتی خصائص اور ڈکشن

وغیرہ کی طرف مجمل اشارے کیے ہیں اور بعد کے نقادوں نے موضوع سے قطع نظر زبان و بیان کے حوالے سے شاعر انقلاب و رومان کی نظموں کا جو جائزہ لیا ہے اس کی اساس سردار جعفری کے محاکمہ پر قائم ہے"۔ 205

سردار جعفری کا مضمون "قتیل شفائی" رسالہ فن اور شخصیت قتیل شفائی نمبر 1981 میں شائع ہوا۔اس مضمون میں سردار جعفری نے بتایا کہ قتیل شفائی نے شفا کانپوری (اصل نام حکیم محمد یحییٰ خاں شفا' راولپنڈی) سے شروع شروع میں اصلاح لی اور اپنا قلمی نام قتیل شفائی رکھا۔

قتیل شفائی کی شاعری کے بارے میں سردار جعفری نے بتایا:

"قتیل حسن و عشق کی ہلکی پھلکی مہک' لطیف کیفیات کے شاعر ہیں۔ان کا آہنگ نرم اور نغمہ ریز ہے۔الفاظ تتلیوں کی طرح اڑتے ہیں.....انہوں نے تجارت بھی کی اور ملازمت بھی لیکن قبل اس کے کہ ان کے وجود میں چھپا ہوا شاعر دم توڑ دیتا وہ ان جھمیلوں سے باہر نکل آئے اور تقریباً چالیس سال سے دلوں میں مسرت کا چراغ روشن کر رہے ہیں۔قتیل کی محبوب اصناف میں ہیں گیت' غزل اور نظم۔اس ترتیب سے ان کی اہمیت ہے۔حفیظ جالندھری کے بعد اردو زبان کو سب سے دل فریب گیت قتیل نے عطا کیے ہیں۔یہ اردو زبان کی نئی دولت ہے۔غزلوں اور نظموں میں قتیل حسن و عشق کی منزلوں سے گذر کر سیاسی اور سماجی دنیا میں بھی داخل ہو جاتے ہیں لیکن اپنے البیلے انداز کے ساتھ.....ان غزلوں کی خصوصیت پیچیدہ ترکیبوں سے دور ایک آسان اور سبک زبان ہے۔قتیل کی اسی ادا نے ان کو سب کا محبوب بنا رکھا ہے" 206

سردار جعفری نے قتیل کی کتاب "آموختہ" کے اس شعر۔

یا میرا دل پتھر کردے
یا دھرتی کے زخموں پر مرہم رکھ دے

شاعر کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ یہ شاعر کی انسان دوستی کی پہچان ہے"۔ 207

راحت اندوری کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

"راحت اندوری کو میں نے ملک اور بیرون ملک کے مشاعروں میں متعدد بار سنا ہے۔انہوں نے اردو شاعری کو عوام میں مقبول بنایا ہے۔مسقط سے کراچی کے سفر میں ان کا خوش گوار ساتھ رہا۔ان سے گفتگو کے دوران اندازہ ہوا کہ وہ شعر و ادب کے رخ و رفتار سے باخبر ہیں۔اس نوجوان شاعر کا شعری رشتہ قرون وسطی کی روایات سے ملتا ہے"۔ 208

سردار جعفری نے انگریزی میں لکھا اپنا مقالہ بعنوان:

"Progressive movement and its influence on Urdu Poetry" سردار جعفری نے ٹورنٹو یونیورسٹی کے ہال میں منعقدہ 25 اور 26 دسمبر 1982 کو منعقدہ کانفرنس میں پیش کیا۔اردو سوسائٹی نے اس کانفرنس کا اہتمام کیا تھا۔

اس مضمون کے تعلق سے پروفیسر ضیاء (علیگ) نے لکھا ہے:

"یہ مضمون تحقیقی بھی تھا اور معلوماتی بھی۔ذہن اور فکر کو سوچنے کی طرف بھی راغب کرتا تھا اور ترقی پسند تحریک نے ہماری

زندگی، ہمارے ادب اور ہمارے رجحانات کو کس طرح متاثر کیا ہے اس کا بھرپور جائزہ بھی لیا تھا.....ادب کو زندگی سے قریب تر کرنے میں جو ترقی پسندیت کو دخل ہے اس کا پرخلوص احاطہ بڑے بصیرت افروز انداز میں کیا گیا تھا۔ یہ مضمون اس بات کی ضمانت تھا کہ جعفری صاحب کی ذہنی تربیت بڑی حد تک ترقی پسند تحریک کے زیر اثر عمل میں آئی ہے۔ بعد میں یہی مضمون تھوڑے سے ردو بدل کے ساتھ رسالہ Urdu Canda میں جس کی ادارت ولی عالم شاہین کرتے ہیں اس کے پہلے شمارے میں شائع ہو کر خاصا مقبول ہوا"۔ 209

سردار جعفری نے "عندلیب گلشن نا آفریدہ" مضمون میں غالب کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔ یہ مضمون مجلّہ "غالب نامہ" نئی دہلی جنوری 1983 میں شائع ہوا۔ مضمون کے ابتداء میں غالب کی اردو غزل کے چند اشعار سے بحث کی اس کے بعد زیادہ تر فارسی غزلوں پر اظہار خیال کیا ہے۔ غالب کی شاعری میں عصری حسیت کے بارے میں سردار جعفری نے بتایا ہے:

"اس نے (غالب) اپنے عہد کے واقعات پر بہت کم اشعار کہے ہیں مگر اس عہد کا پیش منظر اس عظیم شاعر میں کچھ اس طرح جلوہ گر ہے جیسے بہتے ہوئے پانی میں درختوں کا مرتعش عکس۔ بہت سی غزلوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے اور قصائد سے بہت کچھ پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ غالب کو قدروں کے زوال کا غم زیادہ تھا نظام کی موت کا غم کم۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی نظر تغیر پر تھی۔.....غالب کی نگاہ میں ایک پورے نظام زندگی اور آئین حیات کی تبدیلی تھی"۔ 210

علی سردار جعفری کا مضمون "ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری" کا انگریزی سے اردو ترجمہ ریحان احمد عباسی نے کیا اور یہ تین قسطوں میں کتاب نما میں شائع ہوا۔ قسط نمبر ا، کتاب نما جولائی 1983ء کے مارے میں دوسری قسط اگست 1983 اور تیسری اور آخری قسط ستمبر 1983ء میں شائع ہوا۔

پہلی قسط میں سردار جعفری نے اردو شاعری کو ترقی پسند تحریک کی دین کے بارے میں بتلایا کہ تحریک نے اس کے افق کو وسعت دی، ماضی کے پر تصنع استعارے کو جدید حسی پیکر عطا کیے، آزاد نظم ڈرامائی نظم اور تمثیلی نظم کو فروغ دیا اور ان نظموں میں بحروں کے نئے تجربے کیے، ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں ایک حربے کے طور پر استعمال کیا۔ شعری زبان کو مایہ دار بنایا، عام اور عوامی الفاظ کو استعمال کیا اور اس طرح ترقی پسند شاعری کو عوام سے قریب کیا، اردو شاعری اور ادب میں فنی اضافے کیے۔ پرانی تلمیحات کو نئے معانی اور مفاہیم سے آشنا کیا، نئی علامتیں اور نئے شعری پیکر عطا کئے جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے اور جن پر تحقیقی کام کی ضرورت کو اجاگر کیا۔ سردار جعفری نے بتایا کہ شاعری کا بنیادی اور واحد موضوع تمام دوسرے فنون اور ادب کی طرح انسان اور صرف انسان ہے۔ ترقی پسند شعراء کے ان کارناموں کا بھی ذکر کیا کہ انھوں نے چند ترقی پسند شعراء کے حوالے بھی دیئے۔

دوسری قسط میں سال 1936 کو سردار جعفری نے بہت اہم سال قرار دیا اور اس میں انھوں نے امریکن شاعر کارل سینڈبرگ کی نظموں کا مجموعہ the people yes کا حوالہ دیا جو اسی سال شائع ہوا اس مجموعہ کی ایک طویل نظم کا اقتباس اور اس کا منظوم ترجمہ بھی پیش کیا۔ اسی طرح لینن انعام یافتہ اور نوبل انعام یافتہ شاعر پابلو نرودا کی نظم کا حوالہ دیا جو 1936 یں لکھی گئی اس نظم کے ساتھ اس کا بھی منظوم اردو ترجمہ دیا گیا اور اسی زمانے کی مشہور تصویر اور مشہور ناول کا بھی تذکرہ کیا اور اقبال

کی آخری تصنیف ''ضربِ کلیم'' کا حوالہ بھی دیا جو 1936ء میں شائع ہوئی۔علی سردار جعفری نے بتایا کہ اقبال نے اپنی تخلیقی زندگی کے ہر مرحلے پر فن برائے فن کے نظریے کی مذمت کی تھی، انھیں فن برائے زندگی پر یقین تھا اور وہ چاہتے تھے کہ شاعری انسان اور کائنات کے رشتے کو سمجھنے کی ذمہ داری قبول کرے۔سردار جعفری نے لکھا ہے کہ اقبال کا سب سے قیمتی ورثہ انسانی عظمت اور اس بات پر اعتماد ہے کہ وہ اپنی قسمت بدل سکتا ہے۔

تیسری قسط کی ابتداء میں جمالیات سے بحث کی گئی ہے۔سردار جعفری نے لکھا ہے کہ ہمارا ہندوستانی جمالیاتی نظام تو بنیادی انسانی جذبات پر مبنی ہے جن میں غصہ اور نفرت بھی شامل ہیں اور شاعری میں ان کی جگہ ہے۔انھوں نے کہا کہ وہ نفرت کا پرچار کرنا نہیں چاہتے لیکن اس کا ہدف اگر ظلم اور جبر ہو تو یہ جذبہ مقدس بن جاتا ہے۔

سردار جعفری نے اپنے ایک مضمون ''ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری'' میں لکھا ہے:

''ہمارا ہندوستانی جمالیاتی نظام تو بنیادی انسانی جذبات پر مبنی ہے۔جنھیں رس کہا جاتا ہے۔ان رسوں میں غصے اور نفرت کو بھی جمالیات کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔غصے اور نفرت کو آپ اچھا کہیں یا برا پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ انسانی جذبات ہیں اور اس حیثیت سے شاعری میں ان کی جگہ ہے۔میں نفرت کا پرچار کرنا نہیں چاہوں گا لیکن شاعری میں اس کے اظہار کو جائز سمجھتا ہوں اور یہ کہ اگر اس کا ہدف ظلم اور جبر ہو تو یہ جذبہ مقدس بن جاتا ہے۔نفرت کا یہ شعلہ مہابھارت اور فردوسی کے شاہنامے کے صفحات میں بلند ہوتا ہے۔ترقی پسند شاعری میں اس کی کوئی کمی نہیں ہے''۔211

پاکستان کی شاعرہ پروین فنا کے مجموعہ کلام ''تمنا کا دوسرا قدم'' پر سردار جعفری نے کراچی میں 8 مئی 1984ء، اپنے تنقیدی مضمون ''حرفِ حق کے شدید احساس کی شاعری میں اظہار خیال کیا ہے۔سردار جعفری نے پروین فنا کو باشعور شاعرہ کہا ہے۔

ان کی شاعری کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

''آج کل جو خواتین شاعری کر رہی ہیں ان میں چند ایسے نام ہیں جن کے پاس پیکر تراشی کا خاص فن ہے اور ان میں ایک معتبر اور منفرد نام پروین فنا کا ہے۔میں ان کی شاعری کو محض موضوعات کی شاعری نہیں سمجھتا۔میرے نزدیک یہ محسوسات کی شاعری ہے لیکن ان کا احساس بیدار اور باشعور ہے۔اگر ایک طرف ذاتی غموں اور ناکامیوں کو شعر کے قالب میں ڈھالتا ہے تو دوسری طرف اجتماعی غموں کو بھی اپنی خوب صورت گرفت میں لے لیتا ہے۔یہ شاعری زندگی سے بیزاری کی شاعری نہیں ہے بلکہ زندگی سے محبت کی شاعری اور حرف حق کی بے باکی کی شاعری ہے اور یہ حرف حق فلسطین کی خون آلودہ سرزمین سے لے کر پروین فنا کے دل تک وسیع ہے۔ان کی نظم ''لہو بول اٹھے گا'' (نذر فلسطین) اس اعتبار سے ایک بھرپور اظہار ہے۔ایک فقرے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پروین کی شاعری حرفِ حق کے شدید احساس کی شاعری ہے۔میں پروین فنا کے مجموعہ کلام کا خیر مقدم کرتا ہوں جس کا مطالعہ روحانی بالیدگی کا سامان ہے اور غنائی کیفیات سے معمور ہے۔212

آزاد نظم کے مستقبل کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

''کہنے کو تو اردو میں غزل کی تاریخ ڈھائی تین سو برس ہے لیکن فارسی غزل کی روایت اس کی عمر بڑھا دیتی ہے۔اس

عرصے میں غزل اپنے امکانات ختم کر چکی ہے۔نظم جو صحیح معنوں میں 1857ء کے بعد پیدا ہوئی، اقبال اور جوش تک آتے آتے اپنی معراج کو پہنچ گئی اور پابند نظم پر ردیف اور قافیے کی قید کے ساتھ اقبال اور جوش نے آخری مہر لگادی۔اس کے بعد سے غزل بھی کہی جارہی ہے اور پابند نظم بھی اور دونوں میں اچھی خاصی شاعری ہورہی ہے۔لیکن یہ شاعری اپنے آسمان ہنر سے محروم ہے حالانکہ ابھی تک آزاد نظم قبول عام کی وہ سند حاصل نہ کرسکی ہے جو غزل اور نظم کو حاصل ہے۔پھر بھی میرے نزدیک اردو شاعری کا مستقبل آزاد نظم کے ساتھ وابستہ ہے۔213

(سردار جعفری: حرفِ حق کے شدید احساس کی شاعری (تمنا کا دوسرا قدم: پروین فنا)

''پابند نظم میں ردیف اور قافیے کی جھنکار ایک مخصوص حسن پیدا کرتی ہے اور آزاد نظم کو شعری پیکروں کا آہنگ نئی کیفیت عطا کرتا ہے''۔214

سردار جعفری نے ''انیس کی معجز بیانی'' عنوان سے ایک مقالہ انیس پر منعقدہ ایک سینار میں پیش کیا۔مضمون میں سردار جعفری نے انیس سے اپنی عقیدت کا ذکر کیا ان کے ذوق کی تربیت میں سب سے زیادہ انیس کی آواز ہے اور یہ کہ مرثیے سے نظم نگاری تک سفر میں انیس کی شاعری نے ان کی بہت رہنمائی کی ہے۔انھوں نے بتایا کہ انیس کے اثرات جوش کے یہاں بہت واضح ہیں اور اقبال کے کے یہاں بھی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔انھوں نے لکھا ہے کہ وہ انیس کا شمار اردو کے چار عظیم شعرا میں کرتے ہیں باقی تین میرؔ، غالب اور اقبالؔ ہیں۔انھوں نے انیس کے موضوع کو دنیا کا عظیم ترین موضوع شجاعت اور قربانی بتایا ہے۔

انیس کی منظر کشی پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے سردار جعفری لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے مجھے انیس کی شاعری کے جن حصوں نے متاثر کیا وہ صبح کی منظر کشی سے متعلق تھے اور اس کی وجہ میرا ذوق آوارگی تھا۔میں ترائی کے جنگلوں اور پہاڑوں میں بہت گھوما ہوں اور میں نے ترائی کے میدانوں سے ہی صبح کو طلوع ہوتے ہوئے اور آسمان پر تاروں کو بجھتے ہوئے دیکھا تو ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ انیس کے یہاں یہ منظر نگاری تخیلی نہیں ہے بلکہ حقیقی ہے۔میرے نزدیک مثنویوں کے بعد اسکو اردو شاعری میں فطری منظر نگاری کی ابتداء کہا جاسکتا ہے۔جوش کی شاعری میں صبح کی منظر نگاری اس کا تسلسل ہے۔صبح کی جس نرم ہوا کا ذکر انیس نے کیا ہے اس کے جھونکوں سے میرے بچپن نے فرحت حاصل کی ہے اور طلوع آفتاب سے میری آنکھیں روشن ہوئی ہیں ان مرثیوں میں طلوع ہی طلوع ہے۔غروب آفتاب کا کہیں نام ونشان بھی نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ صبح عاشورہ، صبح شہادت صبح سعادت ہے۔ان مراثی میں جہاں رات آئی ہے وہ اپنی تمام ہولنا کی کے باوجود اس صبح شہادت لے کر آئی ہے۔215

انیس کے مراثی کی فنی خوبیوں سے بحث کرتے ہوئے سردار جعفری نے کئی اشعار پیش کیے ہیں۔

چند اقتباسات پیش ہیں:

انیس نے ان تمام ادبی اور شاعرانہ حربوں سے کام لیا ہے جو اس وقت کے لکھنو میں رائج تھے۔ہر طرح کے صنائع، بدائع، تشبیہہ، استعارے، مبالغے لیکن اتنی فصاحت، بلاغت اور لطافت کے ساتھ کہ ذوق سلیم پر گراں نہیں گزرتے.....مثال

کے طور پر انیس نے مبالغہ آرائی اس طرح کی ہے کہ پڑھنے والا لطف لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور بات دور از کار نہیں معلوم ہوتی۔ کربلا میں گرمی کی شدت کو بیان کرنے کے لیے یہ مصرع کہنا کہ ''بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر'' اعجاز سخن کی مثال ہے.....صنعت ایہام کا استعمال انیس کے یہاں بہت زیادہ ہے لیکن ذوق سلیم پر گراں نہیں گزرتا بلکہ لطف میں اضافہ کر دیتا ہے .....انیس نے بہت سی تشبیہیں استعمال کی ہیں اور ان میں تخیل کی بلندی، ندرت اور ذوق کی لطافت سے کام لیا ہے۔ انیس کی یہ تشبیہیں صرف نئی نہیں ہیں بلکہ اردو شاعری میں اضافے ہیں۔ انیس کے مراثی میں کئی ہزار تشبیہیں اور استعارے ہیں جو انسان کو حیران کر دیتے ہیں۔216

سردار جعفری نے اپنے تنقیدی مضمون ''چراغ لالہ'' میں اقبال کی شاعری کو موضوع بنایا ہے۔ یہ مضمون افکار کراچی سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر، 1991ء میں شائع ہوا۔ مضمون کی ابتداء میں سردار جعفری نے بتایا کہ انہوں نے اقبال پر جو ڈاکومنٹری فلم بنائی ہے اس میں تین علامتیں استعمال کی گئی ہیں۔ آبجو کو پیغمبری اور شاعری کی علامت، لالے کا پھول خودی کا، عظم جمال اور شاہین کو خودی کا مظہر جلال کے طور پر استعمال کیا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ:

پہلی علامت جوئے آب کی شکل میں گوئٹے کے یہاں سے آئی ہے اور پیام مشرق کی نظم نغمہ محمدی کے ترجمے میں ظاہر ہوئی ہے۔

سردار جعفری نے شاعری کی ایرانی روایت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شاعری کی ایرانی روایت میں بھی حسن و عشق کے اسرار کے لیے ایک پھول اور ایک طائر کو اہمیت دی گئی ہے..... شاعری کی ایرانی روایت میں گلاب کا پھول حسن ہے اور بلبل عشق۔ محبوب باغ اور پھول کی صفات سے آراستہ ہے اور عاشق بلبل کے دل کی بے تابی اور اس کے نغمہ و فریاد کا پیکر۔ پھول میں ایک شان بے نیازی ہے اور مکمل سکوت اور بلبل میں انداز نیاز مندی ہے اور مسلسل ترنم۔ یہاں لذت وصل خواب و خیال ہے اور لذت فراق حقیقت.....فراق جو طلب آرزو کو زندہ رکھتا ہے، نغمے کو سرعطا کرتا ہے اور عشق کو یکتائی بخشتا ہے۔ اقبال لذت وصال سے زیادہ لذت فراق کا شاعر ہے اور عالم فراق میں اس کے نغمے کا تلاطم بڑھ جاتا ہے''۔217

سردار جعفری نے ''لالہ'' کے مفاہیم پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''لالہ نور کی علامت ہے، رنگ کی علامت ہے، الہامی کیفیت کی علامت ہے۔ شہادت اور قربانی کی علامت ہے، الہامی کیفیت کی علامت ہے۔ شہادت اور قربانی کی علامت ہے، آزادی کی علامت ہے اور اس انسان کامل کی علامت ہے جس میں خدائی صفات ہوں۔ اپنی نظم ''طلوع اسلام'' میں جو ترکوں کو فتح اور برطانیہ کی شکست پر کہی گئی ہے۔ اقبال نے لالے کے پھول کا بہت خوب صورت استعمال کیا ہے۔ اقبال کی شاعری میں لالے کا پھول ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ انسان تکمیل خودی کی منزل میں جتنا آگے بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرتا ہے اور اس طرح خدا کو اپنی ذات کی تکمیل سے آشنا کرتا ہے''۔218

شاعرانہ الہام کی وضاحت کرتے ہوئے سردار جعفری رقمطراز ہیں:

1۔یہ علم اب تک کسی کو نہیں، بڑے سے بڑے شاعر اور ماہر نفسیات کو بھی نہیں کہ تخلیقی شعر کا کارخانہ اندرون ذات کس طرح کام کرتا ہے۔شعور اور احساس میں وہ کیفیاتی تبدیلی کس طرح ہوتی ہے اسے شاعرانہ الہام کہتے ہیں۔کوئی شاعر تخلیق شعر کے آخری لمحے تک اس سے واقف نہیں ہوتا کہ کس طرح کا مصرعہ کن الفاظ اور کن استعاروں کے پیراہن پہن کر نازل ہو رہا ہے اور جب وہ ذہن و دل سے زبان اور کاغذ پر منتقل ہوتا ہے تو ایک عجیب حیرت ناک مسرت کے ساتھ اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔جو کم تر درجے کے شاعر مشق سخن کے زور پر ٹھوک بجا کر شعر کہتے ہیں وہ اس لذت تخلیق سے محروم ہیں.....''

2۔''کبھی کبھی بڑے شاعر بھی الہام کے کمزور لمحوں سے دوچار ہوتے ہیں اور ان لمحوں میں معمولی قسم کا شعر کہتے ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی عظیم تخلیق کے دوران شدید لمحے اور کمزور لمحے یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔طویل نظموں میں یہ زیادہ ہوتا ہے۔اس قسم کی تخلیق میں شاعر ترمیم اور اصلاح کرتا ہے۔گویا الہام کے ساتھ ریاض بھی ضروری ہے''۔

3۔ ''شاعرانہ الہام غیر مشروط اور لامحدود نہیں ہوتا۔اس میں اکتسابی علوم کا پرتو ہوتا ہے اور معاشرتی حالات اور ذاتی تجربات کی پرچھائیاں''۔

4۔ ''الہام اس زبان میں ہوتا ہے جس سے شاعر واقف ہے۔اور انہیں علوم کے دائرے میں جو شاعر نے حاصل کیے ہیں (اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی تمام ذہنی اور روحانی کیفیات اور باطنی طاقت کے باوجود الہام ماحول اور تاریخ سے بے نیاز نہیں ہوتا۔

5۔ایک شاعر کا الہام دوسرے شاعر کے الہام سے مختلف شکل اختیار کرتا ہے۔

6۔ 'ایک ہی وقت میں دو بڑے شاعر دو مختلف معاشروں میں رہ کر دو بالکل مختلف اور بعض اوقات متضاد کیفیات کا اظہار کرتے ہیں اور ایک ہی واقعے کے زیر اثر ایک دوسرے کے برعکس استعارے اور علامتیں تراشتے ہیں کیوں کہ دونوں کی نفسیاتی کیفیات اپنے اپنے معاشرے میں زیر اثر ہوتی ہے (ایک ہی معاشرے میں دو اور دو سے زیادہ نفسیاتی کیفیات ممکن ہیں) اگر ہم اقبال اور ٹی ایس ایلیٹ کے شعری عمل پر ایک نظر ڈالیں تو اس نکتے کی وضاحت میں مدد ملے گی۔دونوں بڑے شاعر ہیں اور ہم عصر ہیں دونوں اعلیٰ درجے کے خلاق ہیں۔دونوں اپنے عہد کی نمائندگی کرتے ہیں اور اپنے عہد کے علوم پر حاوی ہیں۔دونوں مغرب کی مادیت پرستی سے نالاں ہیں۔دونوں کے پاس مذہبی اقدار اور روحانی علاج ہیں پھر بھی دونوں ایک دوسرے سے اتنے الگ ہیں کہ میرے خیال میں اقبال نے کبھی ایلیٹ کو گوئٹے کی طرح اپنا ہم نوا سمجھا ہوگا۔ایلیٹ کی 1917 کی نظم the love song شام کی ایک تصویر سے شروع ہوتی ہے۔تقریباً اسی زمانے میں اقبال نے ایک نظم ''بزم انجم'' کہی وہ بھی شام کی ایک تصویر سے شروع ہوتی ہے لیکن اس میں شام کا رنگ کچھ اور ہے۔اقبال کے یہاں شام دولہن کی طرح سجی ہوئی ہے اور ایلیٹ کے یہاں اس پر موت کی پرچھائیں ہے۔وہ آسمان اور زمین کے درمیان ایک بے ہوش مریض کی طرح لیٹی ہوئی ہے۔اقبال کی نظم کی لالہ رنگ شام صبح عیش کی تمہید ہے۔ایلیٹ کی نظم کی شام اس کیفیت سے محروم ہے۔219۔

پابلو نرودا کی شاعری اور شخصیت پر علی سردار جعفری کا یہ مضمون ''پابلو نرودا'' پہلے افکار، نومبر دسمبر 1991 اور پھر نیا ورق،

فروری تا جولائی 2004 میں شائع ہوا۔ مضمون کی ابتداء سے پہلے ادارہ نیا ورق نے اپنے نوٹ میں یہ وضاحت کی ہے کہ سردار جعفری کا یہ مضمون تقریباً دو دہائی قبل رسالہ گفتگو میں شائع ہوا تھا۔ پابلو نرودا کا یوم پیدائش 12 جولائی 1904 ہے۔ اور صد سالہ جشن کے موقع کی مناسبت سے اسے 2004 میں شائع کیا جا رہا ہے۔

مضمون میں سردار جعفری نے بتایا کہ 1947ء میں ایک مکان میں انگریزی کتاب Residence on Earth مصنف پابلو نرودا دیکھی جس میں اصل نظمیں ہسپانوی زبان میں تھیں اور سامنے کے صفحے پر ان کا ترجمہ انگریزی زبان میں دیا گیا تھا۔ اس کتاب میں انہیں لورکا کی نظم دیکھی جو بقول سردار جعفری ان کا بڑا محبوب شاعر تھا۔ وہ اسپین کی خانہ جنگی کے دوران فرانکو کے فاشسٹ سپاہیوں کے ہاتھوں غرناطہ میں قتل کیا گیا تھا۔ سردار جعفری نے لکھا ہے کہ لورکا اور پابلو نرودا ہسپانوی خانہ جنگی کے زمانے میں ایک دوسرے کے دوست ہو گئے تھے۔ یہیں سے پابلو نرودا کی شاعری میں نیا موڑ آیا اور وہ انقلابی اور عوامی آہنگ پیدا ہوا جو نرودا کا طرۂ امتیاز ہے۔ پابلو نرودا کے بارے میں سردار جعفری نے یہ بھی بتایا کہ وہ صرف ایک شاعر اور مغنی ہی نہیں تھا بلکہ ایک انقلابی سپاہی اور مجاہد تھا جو پورے امریکی خطے کا ضمیر بن چکا تھا اور انسانیت کے ضمیر کو بیدار کر رہا تھا۔

سردار جعفری نے نرودا سے اپنا تقابل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میرے اور پابلو نرودا کے قد و قامت میں فرق تھا۔ وہ مجھ سے بہت بڑا شاعر تھا۔ جو فرق اقبال نے اپنی ذات میں اور گوئٹے کی ذات میں محسوس کیا تھا، وہی فرق میں نے اپنے اور نرودا کے درمیان پایا لیکن میری اور چلی کے اس دلنواز شاعر کی دھڑکنیں ایک تھیں اور میں نے محسوس کیا کہ ہمارے درمیان مشترکہ قدر صرف اسپین اور چین کی تحریک آزادی اور فاشسٹ دشمنی ہی نہیں ہے جس کا بھرپور احساس جواہر لال نہرو نے ہندوستان کو دلایا تھا، صرف سوویت یونین اور کمیونزم کی محبت ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے درمیان شاعری کی ایک مشترکہ روایت بھی ہے۔ یعنی والٹ ہٹ مین اور مایا کوسکی کی وراثت جن سے دونوں نے اپنے اپنے ظرف کے مطابق فیض حاصل کیا ہے''۔220

سردار جعفری نے بتایا کہ پابلو نرودا کی طویل نظم ''امن آنے والی شفق کے نام'' نے ساری دنیا میں دھوم مچا دی۔ یہ امن عالم کا ایک شاندار قصیدہ ہے، جلاوطن شاعر کی حب الوطنی سے سرشار ہے اور پھر یہ حب الوطنی ساری دنیا کی محبت کے سمندر کی ایک لہر بن جاتی ہے۔ سردار جعفری کے مطابق نرودا ایک نہایت منجھا ہوا ڈپلومیٹ اور بہت سنجیدہ شاعر ہونے کے باوجود سینے میں ایک معصوم دل رکھتا تھا۔ سردار جعفری نے اپنی نظم 'پابلو نرودا'' میں اس کی دلنواز شخصیت اور شاعری کے تاثرات کو محفوظ کیا۔

پابلو نرودا کی مقبولیت کے بارے میں سردار جعفری رقمطراز ہیں:

''نرودا کی شہرت اور مقبولیت برابر بڑھتی گئی اور یہ بے پناہ تھی۔ وہ 1934 میں چلی کی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر بنا اور آخر دم تک پارٹی کا ممبر رہا۔ سامراجی حکمراں اور لیڈر اس سے ڈرتے تھے لیکن اسکی شاعری کا معجزہ یہ تھا کہ ان ملکوں کے ادیب اور شاعر نرودا سے انسپریشن حاصل کر رہے تھے۔ عمر کی ترقی اور بیماری کے باوجود اس کی تخلیقی قوتوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ آخر تک شعر کہتا رہا اور آخری تک انقلاب کے لیے لڑتا رہا۔ چلی میں الندے کی صدارت ایک طرح سے نرودا کی شاعری کی جیت تھی اور وہ اپنی مرضی کے خلاف اپنے دوست الندے اور انقلاب کی خاطر پھر سے سفیر بن کر فرانس چلا گیا۔ اس زمانے میں

نرودا کی شاعری اوراس کی عظمت کا سب سے بڑا اعتراف نوبل انعام کی شکل میں کیا گیا'۔221

علی سردار جعفری کا مضمون ''اقبال اور کمیونزم'' آل احمد سرور کی مرتبہ کتاب ''اقبال اور مغرب'' میں شامل ہے۔سردار جعفری نے لکھا ہے کہ اقبال مارکسزم اور کمیونزم کو اپنی ناقدانہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ان کی شعری تخلیقات پیام مشرق (1923)، بانگ درا (1924)، زبور عجم (1927)، جاوید نامہ (1931)، بال جبریل (1935) اور ضرب کلیم (1936ء) میں انقلاب اور کمیونزم کا ذکر ملتا ہے۔

مضمون سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

1۔ بانگ درا میں اقبال کی فکر نے سرمایہ داری نظام کو قطعی طور سے رد کر دیا جس پر طلوع اسلام کے یہ اشعار شاہد ہیں۔''

2۔اقبال نے ذرائع پیداوار کی ذاتی ملکیت اور ان کے استعمال سے انسانی استحصال کو حرام قرار دیا ہے۔یہ کمیونزم کا بنیادی اصول ہے۔کارخانے اور زمین دو سب سے بڑے ذرائع پیداوار ہیں اور ان پر انفرادی قبضے کو حرام قرار دے کر اقبال نے کمیونزم کے بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا ہے''۔

3۔اقبال نے بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ کمیونزم میں روحانیت کی آمیزش ضروری ہے۔

4۔وہ یہ بھی محسوس کرتے رہے کہ اشتراکی جمہوریت اسلام کے اصولوں سے بہت قریب ہے۔

5۔بال جبریل کی پہلی نظم میں لینن کی زبان سے خدا کے وجود کی شہادت دینے کے بعد اقبال سرمایہ داری نظام اور ملوکیت پر بھرپور تنقید کرتے ہیں اور اس زبان میں اسکی دھجیاں اڑاتے ہیں جو مارکس نے استعمال کی ہے۔یہاں اشارے اور کنایہ کو نظر انداز کر کے شاعر نے اس برہنہ گفتاری سے کام لیا ہے جو رزمیہ شاعری کے فکری حصوں میں ہوتی ہے''۔

6۔یہ نظام جس کو ہم غیر طبقاتی نظام کہہ سکتے ہیں، مذہب اور روحانیت سے عاری نہیں ہونا چاہئے۔

7۔نظم ''اشتراکیت'' کا آخری شعر

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک

اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمان جدت کردار کے ساتھ قرآن میں غوطہ زن ہو کر کن رموز و اسرار کو بے نقاب کر سکتا ہے۔یہ رموز و اسرار قرآن کی ایک آیت قل العفو میں پوشیدہ ہیں جس کا یہ ذاتی مفہوم ہے کہ مسلمان کے پاس اس کی ذاتی ضرورت کے بعد جو دولت بچ جائے وہ راہ خدا میں یعنی عام انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے صرف کی جائے۔دیکھئے یہ نکتہ کمیونزم کی اس تعلیم سے کتنا قریب ہے کہ انسانیت اپنی صلاحیت کے مطابق محنت کرے اور اپنی ضرورت کے مطابق محنت کی پیداوار یا دولت کو استعمال کرے۔

8۔ابلیس کی مجلس شوریٰ، کو جو اقبال کے انتقال کے بعد ارمغان حجاز میں شائع ہوئی بعض لوگ کمیونسٹ دشمن نظم کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔یہ صحیح نہیں ہے۔اس نظم میں چار سیاسی، سماجی اور معاشی نظام پیش کیے گئے ہیں۔سرمایہ داری ملوکیت،

فاشزم، کمیونزم اور اسلام ۔ پہلے دو نظام سرمایہ داری ملوکیت اور فاشزم، شیطانی نظام ہیں ۔تیسرا انسانی نظام ہے اور چوتھا اسلامی، اقبال پہلے دو شیطانی نظاموں پر تیسرے انسانی نظام کو ترجیح دیتے ہیں لیکن اسلامی نظام کو تیسرے نظام سے بہتر سمجھتے ہیں"۔

9۔نظم کارل مارکس کی آواز، میں مغربی نظام معیشت کو علم وحکمت کی مہرے بازی کہا گیا ہے۔

10 ۔اشعار.....مساوات شکم کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر شخص کو دو دو چار چار روٹیاں برابر تقسیم کی جائیں گی اور انسان حیوانی سطح پر زندگی بسر کرے گا۔اس کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ معاشی نظام اس نہج پر ہونا چاہئے کہ ایک طبقہ دوسرے طبقے کا معاشی استحصال نہ کر سکے۔ جب خوشہ گندم دہقان کی روزی یا روٹی میں تبدیل ہوتا ہے تو مساوات شکم کی بنیاد پڑتی ہے ۔کیا اسلام کی تعلیم میں یہ سبق موجود نہیں ہے کہ جب تم پیٹ بھر کے کھاؤ تو یہ دیکھ لو کہ تمہارا کوئی ہمسایہ بھوکا تو نہیں ہے۔یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے کہ ہم مارکسزم کی بنیاد مساوات شکم پر قائم ہے۔مساوات شکم اس کا صرف ایک پہلو ہے جس کو اقبال کے ایک فقرے سے واضح کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے گاندھی جی کو 29 نومبر 1920 میں لکھا تھا" سیاسی آزادی سے قبل معاشی آزادی ضروری ہے"۔

11 ۔اقبال کا آئیڈیل اسلام تھا۔قرآن اور مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی ان کا انسپریشن اور انقلاب آنے کا پیغام، ان کے تصور انقلاب میں روحانی اقدار کے ساتھ کموزم کے بعض عناصر کی آمیزش ہے۔ان کے فلسفے وفکر کی سب سے بڑی دین ان کا تصور انسان ہے جس کی روشنی سے ان کی شاعری جگمگا رہی ہے۔خود خدا کا بنایا ہوا جہاں اس کو کب کی تابانی سے روشن ہے۔ایک جگہ لکھا ہے کہ میں اپنی عمر اس سوچ میں گزار رہا ہوں کہ انسان کیا ہے۔ (فیضان اقبال۔مرتبہ شورش کاشمیری صفحہ 230) ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ "میری نظر میں ایک بڑھئی کے ہاتھ جو آرے کے مسلسل استعمال سے کھردرے ہوگئے ہیں اس دانشور کے نرم و نازک ہاتھوں کے مقابلہ میں زیادہ خوبصورت اور کارآمد ہیں جس نے قلم کے سوا کوئی دوسرا وزن نہیں اٹھایا"۔

(اقبال پوئٹ فلاسفر آف پاکستان ۔انگریزی۔مرتبہ حفیظ ملک کولمبیا یونیورسٹی پریس، امریکہ)

اقبال کا اسلام ملا کے اسلام سے مختلف ہے۔ شاعر مشرق کو صرف شاعر ملت بنا کر ان کی جدید ذہنی کیفیت (Modernism) کو نظر انداز کرنا خطرناک ہے۔222

سردار جعفری کا مضمون "کمیونزم کی ناکامی" ستمبر 1991ء کا لکھا ہوا ہے اور یہ افکار (کراچی) سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991 میں شائع ہوا ہے۔روس میں کمیونزم پوری طرح درہم برہم ہوگیا۔اس حوالے سے سردار جعفری نے مدلل اور جامع مضمون تحریر کیا ہے۔

مضمون کی ابتداء میں انھوں نے لکھا ہے:

"کمیونزم روس میں ختم ہوا ہے۔ہمارے ہاں نہیں ۔کمیونزم دراصل ایک تصور ہے بہتر زندگی کا۔جو کچھ سوویت یونین میں تھا وہ کمیونزم نہیں تھا بلکہ کمیونزم کی طرف جانے کا صرف ایک راستہ تھا۔ 1919 میں انقلاب روس نے سامراجی طاقتوں کو

ہلا دیا تھا اور پھر روس ایک نئے نظام زندگی کی طرف گامزن ہوا جس میں اس کو کامیابی حاصل ہوئی۔ 1924ء کے بعد سے تعمیر شروع ہوئی۔ اس نظام کو بہتر اور زیادہ خوبصورت نظام زندگی دیا۔ بھوک کا علاج کیا۔ موٹی جھوٹی روٹی سب کو ملنے لگی۔ موٹا ہی سہی لیکن کپڑا بھی ملنے لگا۔ تعلیم عام ہوئی اور حفظان صحت کا سب کے لیے انتظام ہوا۔ 223

روس میں کمیونزم کے استحکام کے ساتھ ساتھ جو منفی حالات پیدا ہو رہے تھے اس کا ذکر کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

''پارٹی کی جو تنظیم بنائی گئی تھی وہ ژارشاہی دور کی تھی۔ اس میں کمیونزم پارٹی کے ممبروں کو اکثریت کی رائے سے مخالفت کرنے کا حق نہیں تھا۔ تمام اخبارات پارٹی کے تھے۔ اس طرح تحریر اور تقریر کی آزادی پر پابندی کی وجہ سے جو مظالم اس اسٹالنی وفد میں ہو رہے تھے ان کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی جا سکی اور چیزیں اس حد تک پہنچ گئی تھیں کہ ایک جبر اور خوف کا نظام بن گیا اور وہ نظام جو ایک برکت بن کر آیا تھا اپنی سیاسی، تنظیمی کمزوریوں کی وجہ سے لعنت میں تبدیل ہو گیا۔ 224۔

سردار جعفری نے سوویت یونین میں کمیونزم کی ناکامی کی وجوہات پر روشنی ڈالی جن میں مغربی طاقتوں اور نیشنلزم کی انتہا پسندی کو شامل بتایا۔

وہ رقمطراز ہیں:

''گورباچوف سوویت سماج کو مغربی سامراجی یلغار سے بچانے میں ناکام ہو گیا اور اس وقت جو بحران ہے وہ اتنا خطرناک ہے کہ سوویت یونین میں خانہ جنگی بھی شروع ہو سکتی ہے اور مغربی طاقتوں کی اس وقت نظر سوویت یونین کی ایٹمی طاقت پر ہے جس کو وہ تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ جس طرح عراق میں انھوں نے ایٹمی طاقت کو تباہ کیا، سوویت یونین میں اس طرح تو نہیں کر سکتے لیکن مغربی سامراجی نیت صاف نہیں ہے اور سوویت یونین اس اعتبار سے کمزور ہو گیا اور روسی آسانی سے اپنی مدافعت نہ کر سکے۔ ہم تیسری دنیا کے لوگ ہیں۔ ہمارے سامنے افلاس، جہالت، بے روزگاری، تعلیم جیسے مسائل ہیں۔ ان کا حل تلاش کرنے میں ہمیں اپنے آپ کو ان غلطیوں سے بچانا پڑے گا جو سوویت یونین کے دور میں ہوئیں۔ اشتراکی نظام نے جو خواب دیکھے تھے ان میں سے کچھ خوابوں کو سرمایہ داری نظام نے اپنے نظام میں شامل کر لیا۔ آج خلائی ریاست کا تصور ہے وہ سوشلسٹ نظام کی دین ہے۔ صارفین کی سوسائٹی ایک طرح کا سرطانی مزاج رکھتی ہے۔ سوویت کے اندر جو اقتدار کی کشمکش ہے اس میں گورباچوف کا ہاتھ مضبوط رہے۔ ان کے مقابلے میں جو لیڈر شپ ہے وہ قابل اعتبار نہیں۔ سوویت یونین سے سرخ پرچم کو اتار دیا گیا ہے اور اس کے مقابلے پر زار کے زمانے کا ترنگا لہرایا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نیشنلزم کی انتہا پسندی کمیونزم سے زیادہ طاقتور بن گئی ہے''۔ 225

ڈاکٹر تاج پیامی نے جاگیردارانہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکیت کی تفہیم کرتے ہوئے سوویت یونین میں کمیونزم کی ناکامی پر اظہار خیال کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''جاگیردارانہ نظام میں زمین کے مالک اور اس میں کام کرنے والے مزدور دو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ جاگیردار مزدوروں کا استحصال کرتا ہے۔ بقول مارکس مزدور جتنا پیدا کرتا ہے اس سے کم استعمال کرتا ہے۔ مارکس کی یہ بات سرمایہ دارانہ

نظام پر بھی لاگو ہوتی ہے۔سائنس اور صنعت کی ترقی کے سبب جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہوااور اس کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام نے لے لی۔دولت سمٹ کر چند آدمیوں کے ہاتھوں میں آگئی۔غریب مزدوروں کا ایک بڑا طبقہ اس آرام اور آسائش سے محروم رہا جس سے سرمایہ دار لطف اندوز ہو رہے تھے۔اشتراکیت کی تان دولت کی مساویانہ تقسیم پر ٹوٹتی ہے۔شخصی ملکیت ختم کر کے دولت کی پیدائش سے وسائل کو جماعتی ملکیت بنا دیا جاتا ہے اور ضرورت زندگی کو افراد پر تقسیم کرنے کا انتظام بھی جماعت یا ریاست کے ذمہ ہے۔اشتراکی روسیوں نے روس میں اشتراکی نظم قائم کر کے یہ سمجھا کہ انھوں نے وہاں طبقاتی فرق کو مٹا کر ایک مثالی معاشرہ Ideal society قائم کر دیا ہے۔وہاں نہ کوئی جاگیردار تھا اور نہ کوئی سرمایہ دار لیکن یہاں بھی جب مزدور طبقہ حکمراں بن گیا تو اپنی من مانی کرنے لگا۔اب اشتراکی سوویت یونین کا شیرازہ بکھر چکا ہے''۔226

سردار جعفری کے مضمون کمیونزم کی ناکامی؟ سے عمر رضا نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سردار جعفری کو اشتراکی نظام سے بہت سی خوش آئند اُمیدیں وابستہ ہیں۔

عمر رضا لکھتے ہیں:

مضمون کے مطالعے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بطور نظام سردار جعفری نے کمیونزم کی حمایت کی ہے اور اس کی رحمتوں پر آمنا وصدقنا کیا ہے لیکن اسکے استعمال کرنے والوں پر سوالیہ نشان لگایا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جو عنوان قائم کیا ہے،اس میں ابہام اور استفہام پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔کمیونزم کی ناکامی کے بعد سوالیہ نشان اور مضمون کی ابتداء میں ہی یہ لکھنا کہ کمیونزم روس میں ختم ہوا ہے،ہمارے یہاں نہیں اور تمام باتوں کے بعد مضمون کے آخر میں یہ کہنا کہ ''نیشنلزم کی انتہا پسندی کمیونزم سے زیادہ طاقتور بن گئی ہے''اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اشتراکی نظام سے سردار جعفری کی بہت سی خوش آئند امیدیں اب بھی وابستہ ہیں جس میں انھیں ایک بہترین سماج کی تعبیر نظر آتی ہے''۔227

سردار جعفری کمیونزم کے زبردست حامی رہے ہیں اور اخیر دم تک انھوں نے اس کی حمایت کی ہے۔عمر رضا نے بجا طور پر لکھا ہے کہ ''مناسب معلوم پڑتا ہے کہ اس اہم نظریے پر بھی مختصراً غور کرتے چلیں تا کہ اس بات کی قدرے وضاحت ہو جائے کہ اس میں ایسی کون سی خاص بات ہے جس کے باعث سردار جعفری اس نظریے سے اس قدر متاثر نظر آتے ہیں۔خصوصاً ایسے وقت میں بھی انھوں نے اس کا دامن نہیں چھوڑا جب روس میں اس کا عملی نمونہ ناکام ہو گیا تھا۔228

کمیونزم کی تفہیم کرتے ہوئے عمر رضا لکھتے ہیں:

1) کمیونزم، مارکسزم نظریہ کے فکر کی پیداوار ہے جو انسان اور انسانی سماج کے تاریخی واقعات و حالات جاننے اور انہیں بہتر بنانے کے اصولوں کو بتاتا ہے۔دونوں (مارکس اور اینگلز) نے انسانی سماج کے موجودہ ڈھانچے پر کافی غور و فکر کیا اور وہ اس میں مستقل مستغرق رہے کہ معاشرہ بدلتا کیوں ہے؟ مستقبل میں اور کیا تبدیلیاں آسکتی ہیں۔لینن نے اکتوبر 1917ء میں زار روس میں محنت کش عوام اور غریب کسانوں کی حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی چین کے ماؤسی تنگ، ویت نام کے ہو چی منہ اور کیوبا کے چی گوارا وغیرہ نے مارکس کے نظریے کو عام کیا جو رفتہ رفتہ مارکسزم کے نام سے مشہور ہو گئی۔

2۔ کارل مارکس کا ماننا تھا کہ آج تک تمام انسانی سماج کی تاریخ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے اور اس نظریے کا بنیادی

خیال یہ ہے کہ زمانہ قدیم سے لے کر آج تک دنیا کے ہر سماج کا ڈھانچہ اقتصادی بنیاد متعین کرتا ہے اور اس سماج میں رہنے والے تمام لوگوں کا طرز فکر و عمل اسی بنیاد پر بنتا ہے اور ہر سماج کی تاریخ کے اقتصادی بنیاد میں تبدیلیوں کی وجہ سے مبنی بگڑتی ہے۔علاوہ ازیں مارکس نے یہ بھی کہا ہے کہ طبقاتی اختلاف کی بنیاد ذرائع پیداوار کا ذاتی ملکیت ہونا ہے اور استحصال اس کی شاخیں ہیں جب تک یہ بنیاد جڑ سے نہیں اکھاڑی جائے گی، استحصال کا عمل جاری رہے گا اور طبقاتی اختلاف کا وجود برقرار رہے گا۔

3۔ مارکس نے کافی غور و فکر کے بعد اب تک کے سماج کے بارے میں یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ابتداء میں یہ سماج قبائلی (Trible era) تھا۔اس کے بعد غلامی کا دور آیا، غلامی کے دور کے بعد جاگیرداری نظام (feudalism) قائم ہوا۔ جاگیرداری نظام کے بعد جدید سرمایہ دارانہ نظام (capitalism) قائم ہوا جس کی ابتداء انگلینڈ سے ہوئی تھی جسے مارکس نے بورژوا جمہوری سماج سے تعبیر کیا تھا۔سامراجیت (imperialism) کو آخری نظام بتایا۔مذکورہ تمام نظاموں میں اس نے استحصال کے عمل دخل کی نشاندہی کی جس کے خاتمہ کے بعد ہی سوشلسٹ جمہوریت، کے قیام کی بات کہی جس میں رفتہ رفتہ اشترا کی نظام کا عمل دخل ناگزیر ہے۔اس میں پیداوار خواہ زراعتی ہو یا صنعتی، استحصال کے لیے نہیں کی جائے گی بلکہ انسانی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہوگی۔ذاتی جائیداد، نجی ملکیت اور دولت جمع کرنے کو اس استحصال کی بنیاد قرار دیا۔مارکس کا ماننا تھا کہ جتنے بھی قدرتی وسائل ہیں ان پر تمام انسانوں کا برابر حق حاصل ہونا چاہئے۔لہٰذا وہ کسی ایک کی جائیداد یا جاگیر بن کر نہیں رہ سکتے بلکہ اس سے سبھی کو فائدہ پہنچنا چاہئے تب ہی دنیا سے عدم مساوات، طبقاتی کشمکش اور استحال کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ جسے سوشلسٹ نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

4۔سوشلسٹ نظام کے متعلق ظفر امام لکھتے ہیں:

''سوشلسٹ نظام سے مراد وہ سماج ہے جہاں اشیاء کی پیداوار کے ذرائع اور پیداوار کی تقسیم اور مبادلہ کے تمام ذرائع ذاتی ملکیت میں نہ ہوں بلکہ پورے سماج کی ملکیت میں ہوں۔چنانچہ اس نظام کی سب سے اہم اور بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اشیاء کی پیداوار کے تمام ذرائع کا مالک چند ایک سرمایہ داروں کے بجائے سماج کا ہر فرد ہوتا ہے۔اشیاء کی پیداوار محض ذاتی منافع کمانے کا وسیلہ نہیں رہتی بلکہ یہ منافع سارے سماج کی مادی زندگی کو بہتر بنانے کا سب سے اچھا ذریعہ ہے۔ایسے سماج میں دوسروں کی محنت پر صرف چند لوگوں کے پلنے کی گنجائش نہیں رہتی۔نہ کوئی سرمایہ دار ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی مظلوم اور بے آسرا۔سماج کا ہر فرد مل جل کر اپنی زندگی بہتر بنانے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔229

5۔مارکس نے جس کمیونسٹ نظام کا خواب دیکھا تھا، اسے حقیقی شکل دینے کے لیے اس نے سب سے پہلے سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے اور اس کے بعد سوشلسٹ نظام کے قیام کی بات کہی تھی جس کے ذریعہ ایسے سماج کی تشکیل کرنا مقصود تھی جس کی بنیاد ٹھوس اقتصادی بنیادوں پر تھی اول: ذرائع پیداوار کا ذاتی ملکیت نہ ہونا۔دوم تعلقات پیداوار میں ہم آہنگی۔اس کا ماننا تھا کہ سیاسی اقتدار محنت کش عوام کے ہاتھ میں آتے ہی سوشلسٹ نظام خود بخود قائم ہوجائے گا۔اسے پہلا اور ابتدائی قدم کہا ہے۔اس نظام کی تعمیر سے پہلے اس نے ایک عبوری دور کا بھی ذکر کیا ہے جس میں مارکس اور لینن دونوں نے محنت کش عوام

کی آمرانہ حکومت (Dictatoriship of the protiteriat) قائم کرنے پر زور دیا ہے تا کہ محنت کش عوام اپنے سیاسی اقتدار کا استعمال کرتے ہوئے سابقہ فرسودہ نظام یعنی سرمایہ دارانہ نظام کی تمام نشانیوں اور اس کے مضر اثرات کو ہمیشہ ہمیسہ کے لیے ختم کر دیں اور نئے ابھرتے نظام کی تمام نشانیوں اور اس کے مضر اثرات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں اور نئے ابھرتے نظام میں کسی بھی طرح کے سرمایہ دارانہ تضادات باقی نہ رہ جائیں۔ سوشلسٹ نظام کی تعمیر میں طاقت کا استعمال اصولاً غیر ضروری ہوتے ہوئے بھی اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ تمام ذرائع پیداوار کا سماج کی ملکیت میں آجانا اور اس نئے سماج کے اندر طبقاتی کشمکش کا مفقود ہو جانا دراصل سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلسٹ نظام کی تعمیر کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس تعمیری دور میں سب سے پہلے محنت کش عوام کی مادی زندگی کو بہتر بنانا مقصود ہوتا ہے۔ جس کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ اس نظام میں مساوات یہ ہے کہ ہر فرد سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی محنت کے تناسب سے معاوضہ دیا جائے۔

6۔ لیکن یہ نظام جب اپنی ساخت اور بناوٹ کی بناء پر بلا کسی اقتصادی بحران کے تیزی کے ساتھ بتدریج بہتر ہوتا جائے اور اشیاء کے ذرائع پیداوار میں مستقل ترقی و توسیع ہوتی رہے نت نئے سائنسی ایجادات اور تکنک کا استعمال بڑھتا جائے، عوام کی معاشی، سماجی اور ثقافتی زندگی کا معیار بلند ہو، ہر فرد کو پہلے سے بہتر بننے کے وسیع تر مواقع ملنے لگیں، پورے سماج میں ہنر مند وغیر ہنر مند، جاہل و تعلیم یافتہ، بے کار اور با کار کی تفریق کسی حد تک ختم ہو جائے تو جلد ہی ایک ایسا دور آجائے گا جہاں اشیاء کے پیداوار کی تقسیم کو مقررہ مقدار اور معیار تک محدود رکھنا بے معنی ہو جائے گا۔ ان حالات میں ہر فرد کے لیے اپنی تمام تر ضروریات کو پورا کرنے کی وافر آسانیاں حاصل ہو جائیں گی وہ اپنی ضرورت کے مطابق ہر ایک چیز سماج سے بہ آسانی حاصل کر سکتا ہے۔ یعنی تمام اشیاء کی پوری پیداوار اور ان کی تقسیم کا قانون اب تبدیل ہو کر یہ ہو جائے گا کہ ہر فرد سے اس کی اہلیت کے مطابق کام لیا جائے جس کے عوض اس کی تمام ضروریات پوری کی جائیں۔ یہی سوشلسٹ نظام کے ارتقاء کی ایک بلند تر اور نئی منزل کمیونزم ہے۔230

روس میں اس نظام کا تجربہ ہوا اور ایک زمانے میں وہاں کمیونزم اپنے بال و پر مضبوط کر رہا تھا۔

1971ء میں ظفر امام نے اس سلسلہ میں لکھا تھا:

سوویت روس میں 1917ء کے بعد 1961ء تک سوشلسٹ نظام کی بنیادیں پورے طور پر مضبوط ہو چکی ہیں اور یہ نظام کم و بیش اپنی ساری تابناکیوں کے ساتھ قائم ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں 1961 کے بعد کمیونسٹ نظام کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔

چنانچہ آج سوویت روس کمیونسٹ نظام کی تعمیر میں مشغول ہے۔ یہ یقین ہے کہ اس صدی کے ختم ہونے تک اس تعمیر کا کام مکمل ہوگا۔ پھر اس نئے نظام کے بارے میں ہم پوری واقفیت حاصل کر سکیں گے۔231

عمر رضا نے 1991 میں اس نظام کے ناکام ہو جانے کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا:

"لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اور 1991 میں یہ نظام پوری طرح درہم برہم ہو گیا جس کے مختلف اسباب بیان

کیے جاتے ہیں۔

اول: وہاں انفرادی آزادی ختم ہوگئی۔دوئم: پرولتاری ڈکٹیٹرشپ قائم ہوگئی تھی جس سے یہ نظام برکت کے بجائے جبر اور خوف کا نظام بن گیا تھا۔بظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک نظر آرہا تھا لیکن بباطن معاشی طور پر روس کھوکھلا ہوتا گیا جس سے عوام میں معاشی آسودگی کی کمی کا احساس ہونے لگا تھا۔علاوہ ازیں علاقائی نیشنلزم نے سر ابھارنا شروع کر دیا تھا جسے مغربی سامراجیت نے مزید ہوا دے رکھی تھی۔نتیجتاً ایک خاص وقت کے بعد یہ نظام ناکام ہوگیا۔

یہ تھا کمیونزم کے بارے میں ایک مختصر سا تعارف، اس کے ارتقاء سوویت روس میں عروج اور زوال کے اسباب۔اب اس کے بعد دیکھیں کہ ان تمام واقعات کے باوجود سردار جعفری کو اس نظام میں انسانی زندگی میں بہتری کی صورت نکل آنے کی قوی امید کیوں کر وابستہ رہی ہے۔اس پر عمر رضا نے روشنی ڈالی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

1۔سردار جعفری اس نظام (کمیونزم) کے کٹر حمایتی ہیں۔انھوں نے اپنی زندگی کے اخیر لمحوں تک اس کا خواب دیکھا اور انہیں اس بات کا کامل یقین رہا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جہاں ادنی اور اعلیٰ کی تفریق ختم ہو جائے گی۔اگر چہ روس میں اس کا زبردست تجربہ ہوا۔

2۔علی سردار جعفری ایک سیاسی مزاج رکھتے تھے اور وہ کسی بھی نظریے پر یونہی عمل پیرا نہیں ہوتے تھے بلکہ بدلے ہوئے حالات کے تحت کسی بھی نظریے کو قبول کرنے میں یقین رکھتے تھے۔7 جون 1991 کو انھوں نے سوویت نظام کے ابتدائی دور میں ہی جس طرح کے منفی کردار در آنے لگے تھے، علاوہ ازیں وہاں جس طرح کی افسر شاہی حاوی ہوگئی تھی، اس کی سردار جعفری نے سخت نکتہ چینی کی تھی اور اس بات کی بھی نشاندہی کی تھی کہ اس زمانے میں سوویت انتظامیہ کی ادبی وثقافتی پالیسی کے خلاف ادیبوں اور دانشوروں میں کسی طرح کا احتجاج پایا جاتا تھا۔اس انٹرویو میں انھوں نے صاف طور پر کہا تھا:

مارکسزم کوئی کلیہ نہیں ہے۔یہ ایک سائنس ہے۔چنانچہ کمیونسٹ مینی فسٹو کی اشاعت کے بعد سے اب تک حالات میں زبردست تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ہمیں مارکسزم کے اصولوں کی تفسیر ان ہی بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں کرنی ہوگی۔

ہمارے درمیان دو طرح کے ادیب تھے۔ادیبوں کا ایک گروہ تو وہ تھا جو ادب کی تخلیق میں ہمہ تن اور پوری یکسوئی سے مصروف تھا اور دوسرے گروہ میں جن کے درمیان میں خود کو بھی شامل کرتا ہوں وہ ادیب تھے جن کی وابستگی کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی سے بھی تھی اور جو کہانیاں لکھنے اور ادب تخلیق کرنے کے علاوہ آزادی کی تحریک میں بھی حصہ لے رہے تھے۔232

3۔ سردار جعفری ادبی زندگی کے آخری مرحلے میں بھی ادب کو سیاست سے الگ نہیں کر پائے تھے۔یہی وجہ ہے کہ وہ کمیونسٹ پارٹی اور کانگریس پارٹی سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہے اور اس کے مطابق انھوں نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔خاص طور سے وہ کمیونسٹ پارٹی کے بہی خواہ تھے، درمیان میں کچھ ان بن ضرور ہوگئی تھی لیکن پھر وہ اپنے پرانے نظریات کو قدرے معتدل انداز میں قبول کرنے لگے تھے۔یہی وجہ ہے کہ روس کے ابتدائی سوشلسٹ نظام سے وہ بہت زیادہ متاثر تھے۔اس سے اثر پذیری کا عالم یہ تھا کہ روس میں کمیونزم کی ناکامی کے باوجود وہ اس کا خواب اخیر تک سجائے رکھے۔کیوں کہ بقول ان کے

خواب کبھی پورے نہیں ہوتے، پیغمبروں کے خواب بھی کبھی پورے نہیں ہوئے لیکن اصل بات یہ ہے کہ آدمی کو خواب دیکھتے رہنا چاہیے۔اس سے زندگی میں بہتری کی صورت نکلتی ہے۔اگر تمہارے کچھ خواب ہیں، زندگی میں کچھ مقاصد ہیں تو انھیں تازہ رکھو اوران کے حصول کی جدوجہد کرتے رہو۔خواب تمہیں پیہم جدوجہد پر آمادہ رکھتے ہیں۔ان سے تمہاری تحریروں میں ایک گہرا جمالیاتی احساس پیدا ہوگا۔

4۔سردار جعفری نے روس میں کمیونزم کی ناکامی کا اعتراف تو کیا ہے لیکن ہندوستان میں اسے وہ ناکام نہیں بتاتے بلکہ اس کے لیے مستقل جدوجہد کرتے رہنے کی وہ صلاح دیتے ہیں کیونکہ انھیں یہ کامل یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن انسانی زندگی میں بہتری کی صورت نکل آئے گی جو صرف اور صرف کمیونزم میں مضمر ہے۔یہی وجہ ہے کہ سردار جعفری کی ادبی وفکری جمالیات انھیں خیالات سے مبنی اور بگڑتی نظر آتی ہے۔233

علی سردار جعفری نے غالب کو مشترکہ تہذیب کی علامت قرار دیا۔

وہ لکھتے ہیں:

''غالب جو انیسویں صدی کی مشترکہ تہذیب کی ایک شان دار علامت تھے۔1827ء میں جب وہ تیس برس کے تھے کلکتہ گئے۔اس وقت بطور شاعر انھیں شہرت مل چکی تھی۔غیر معمولی فہم وفراست اور ماورائی دوراندیشی سے بہرہ مند اس شاعر کی نظروں میں ہندو، مسلمان، عیسائی اور یہودی یکساں حیثیت رکھتے تھے۔مثالی انسان کا ان کا تصور ان کی شاعری میں جگہ جگہ عیاں ہے۔ایک فارسی نظم میں انھوں نے ناقابل تقسیم انسانیت کا اپنا تصور پیش کیا ہے۔234

جاوید اختر کے پہلے مجموعہ کلام ''ترکش'' تبصرہ کرتے ہوئے سردار جعفری نے ایک مضمون ''شہری کلچر کا پہلا شاعر'' سہ ماہی بزم فکروفن، ممبئی اکتوبر 1996ء میں شائع ہوا سردار جعفری نے لکھا ہے کہ اس مجموعہ میں شامل کلام میں ناچتی گاتی نہایت مترنم بحرین کم ہیں اور ایسی بحرین زیادہ ہیں جو گفتگو کی سطح پر اپنا جادو جگا سکیں اور نثر سے قریب تر رہیں۔

جاوید اختر کے پہلے مجموعہ کلام ''ترکش'' پر تبصرہ کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

1۔ترکش کی شاعری کلچر کے علاوہ عصر حاضر کے کرائسس کی جھلک رہی ہے۔جو لہجے اور ڈکشن میں بہت نمایاں ہے۔اکثر وبیشتر دنیا کی عظیم ترین اور حسین ترین شاعری کرائسس کی آغوش میں پلی ہے۔تاریخ کا کوئی دور اس سے خالی نہیں ہے۔جاوید اختر نے ایک مصرع میں اپنے عہد کو سمیٹ لیا ہے۔وہ عصر حاضر کے کرائسس میں حوصلہ منداور سربلند ہے۔قتل وغارت گری کے اندھیرے میں یہ اشعار روشنی کی کرنوں کی طرح چمکتے ہیں۔

2۔جاوید اختر کی شاعری میں شہری زندگی اور آج کا اربن کلچر پوری طرح سے جلوہ گر ہے۔تیشہ وسنگ وآہن کے بنے ہوئے ان شہروں میں ہر انسان ہجوم میں رہتے ہوئے بھی بے انتہا تنہا ہے، اور مکمل طور سے بے گانہ پن کا شکار ہے۔یہ سرمایہ داری نظام کا تحفہ ہے جو Alienation صنعتی انقلاب کی برکتوں کا پروردہ ہے۔آج کا شہر زیادہ سفاک ہے، کسی کو کسی پر رحم نہیں آتا۔تجارتی مقابلہ آرائی میں لوگ زیادہ سے زیادہ سنگ دل ہو گئے ہیں۔

3۔ایک اور قابل ذکر نظم ''الجھن'' ہے۔اس کا لب لباب یہ ہے کہ شہر کی اس بھیڑ بھاڑ میں یا تو دوسروں کو کچل کر آگے

بڑھ جاؤیا پیچھے آنے والے تم کو کچل دیں گے۔ان کے برعکس ایک اور نظم ہے وہ کمر ہیا دآتا ہے۔اس شائستہ تہذیب کی علامت ہے جواب زیبِ طاق نسیاں ہو چکی ہے۔یہ مجموعہ اس اعتبار سے عصر حاضر کی دستاویز بھی ہے کہ اس میں فسادات اور ان سے ملتے ہوئے موضوعات پر اچھی اثر انگیز نظمیں شامل ہیں۔آخر میں یہ کہنا کہ میرے نزدیک اردو شاعری میں جاوید اختر شہری زندگی اور اربن کلچر کا پہلا شاعر ہے۔شہری اور مشینی کلچر کی جھلکیاں میری اور کیفی کی شاعری میں بھی مل جائیں گی۔ندا فاضلی اور دوسرے نوجوان شعراء کے یہاں بھی شہری زندگی سے متعلق نظمیں ملیں گی۔لیکن ہم اور وہ شہری کلچر سے اس طرح وابستہ نہیں ہیں جیسے جاوید اختر ،عینی نے ان کو بجا طور سے پاپ کلچر کا معمار کہا ہے۔235۔

بہار قانون ساز کونسل کے شعبہ اردو کی جانب سے 1997ء میں دو سو سالہ تقریبات غالب کا اہتمام کیا گیا۔جابر حسین کی خواہش پر علی سردار جعفری نے ''غالب کا سومنات خیال'' کے زیر عنوان مقالہ تحریر کیا جس میں غالب کی مثنوی ''چراغ دیر کا ترجمہ شامل ہے۔کتابی شکل میں اسے اردو مرکز عظیم آباد پٹنہ نے 1997ء میں شائع کیا۔

اس کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے عمر رضا نے لکھا ہے:

بنیادی طور پر یہ مقالہ غالب کی مثنوی چراغ دیر کے ترجمے سے پہلے ایک نوٹ کی حیثیت رکھتا ہے جس میں سردار جعفری نے اس مثنوی کی شان نزول بیان کی ہے۔شان نزول بیان کرنے کے لیے انھوں نے جو فضا قائم کی ہے اس سے ان کے اس عہد کے شعری طریقۂ کار اور نظریۂ ادب کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔مثلاً غالب کی شاعرانہ عظمت کے حوالے سے انھوں نے جو باتیں کہی ہیں اس سے ان کے نظریہ ادب کی عکاسی ہوتی ہے جس میں جلال و جمال کے توازن پر زور دیا گیا ہے۔

2۔سردار جعفری نے اس بات کی بھی تشریح و توضیح کی ہے کہ غالب نے اپنی شاعری کو سومناتِ خیال کیوں کہا تھا؟اس کے لیے انھوں نے ریاست گجرات کے کاٹھیاواڑ کے علاقہ میں سومنات کے مندر کا ذکر کیا ہے جسے 1024ء میں محمود غزنوی نے لوٹ لیا تھا جس سے ہندوؤں کے دل پر ایک گہرا زخم ابھر آیا تھا جس پر بقول سردار جعفری صوفیوں اور شاعروں نے مرہم رکھا اور ایک بڑی عبادت گاہ کی حیثیت سے اس کا ذکر کعبے کے ساتھ کیا(غالب کا سومنات خیال صفحہ 21)۔غالب نے اسے اپنی شاعری کا سومنات خیال کہہ کر جو وقار بخشا ہے وہ سردار کے لیے قابل توجہ ہے اور سردار جعفری نے اسی کو مقالے کا بنیادی موضوع بنایا ہے۔وہ لکھتے ہیں:''غالب نے اس عبادت گاہ کو اپنی شاعری کا سومنات خیال کہہ کر اس کو صوفیانہ فکر کے دائرے سے بھی باہر نکال لیا اور ایک نیا وقار عطا کیا ہے۔اس میں عقیدے کا دخل نہیں ہے۔بلکہ ایک غیر مذہبی فکر کی کارفرمائی ہے۔(غالب کا سومنات خیال،ص 21)غالب نے اپنی شاعری کو جس انداز میں سومناتِ خیال سے تعبیر کیا ہے اس پر مزید جستجو کرتے ہوئے سردار جعفری نے انیسویں صدی (اگر چہ کتاب میں اٹھارویں صدی تحریر ہے لیکن یہ کمپوزنگ کی غلطی نظر آتی ہے) کے وسط تک ہندوستان کی فضا کو فرقہ وارانہ کشمکش سے پاک بتلایا ہے جس کے لیے انھوں نے بطور خاص دہلی کا ذکر کیا ہے جہاں غالب قیام پذیر تھے۔غالب کے حلقہ احباب میں جس طرح مسلمانوں کے علاوہ ہندو برادران بھی شامل تھے۔مثلاً ان کے عزیز ترین شاگرد ہرگوپال تفتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جس طرح کے تہذیبی روابط تھے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔علاوہ ازیں قلعہ معلّٰی میں دیوالی اور دسہرے کا اہتمام،نظام الدین اولیاء کے مزار پر ہر سال بسنت کا تہوار منایا جانا،جس کا

سلسلہ ہنوز جاری ہے اور پھولوں والوں کی سیر وغیرہ کی نشاندہی کی ہے۔غرض انیسویں صدی کے وسط میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے جس طرح کی مشترکہ تہذیب کوفروغ دیا تھا جس سے ہندوستانی معاشرے میں بھائی چارگی اورامن وامان قائم تھا،اس کی روشنی میں سردارجعفری نے غالب کے سومنات خیال کوتلاشنے کی سعی کی ہے۔غالب نے ایک غیرایرانی استعارہ سومنات خیال،تخلیق کیا تھا۔بقول سردارجعفری میرا قیاس ہے کہ جب غالب نے اپنی شاعری کوفارسی شعرا کی شاعری سے الگ کرنے کی کوشش کی تو اس کے لیے ایک ایسا غیرایرانی استعارہ استعمال کیا جس میں ان شاعرانہ پیکروں کوآراستہ کرنے کی گنجائش ہو۔اس لیے سومنات خیال سے بہترکوئی دوسرا استعارہ ممکن نہیں تھا۔

(علی سردارجعفری،غالب کا سومنات خیال،مرتبہ جابرحسین،ص23)

2۔غالب کوجس قدرایرانی فارسی شاعری سے محبت تھی اسی قدر اپنے وطن ہندوستان سے بھی تھی۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کوسومنات خیال کہا ہے جس کی دلکش مثنوی چراغ دیر ہے۔غالب نے یہ مثنوی چوں کہ سفر کلکتہ کے دوران تخلیق کی تھی اس لیے سردارجعفری نے دلی سے کلکتہ کے سفر کی مختصر داستان بھی بیان کی ہے جو بنیادی طور غالب نے موروثی پنشن کے قضیہ کوحل کرنے کے لیے کیا تھا۔

3۔اس عہد کی ابتداء میں سردارجعفری کے شعری وفکری اظہار میں جوصحت مند تبدیلی آئی اور جس طرح سے وہ اعتدال اورتوازن کواہمیت دینے لگے تھے،اس پر اب وہ نہ صرف یہ کہ قائم ودائم نظر آتے ہیں بلکہ اس کی توسیع بھی کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی ان کی شاعری بھی جلال وجمال کے حسین امتزاج سے عبارت ہے۔236

جگن ناتھ آزاد کی شاعری کے بارے میں علی سردارجعفری نے لکھا ہے:

''جگن ناتھ آزاد کوشاعری ورثے میں ملی ہے لیکن وہ اس میراث پر قانع نہیں رہا۔اس نے خود اپنی کاوش سے شاعری کو سنوارا اورنکھارا ہے اوراس میں اپنے خون جگر کا اضافہ کیا ہے۔اس کی شاعری میں ماضی کی بہترین فنی روایات، نئے اور خوبصورت سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔آزاد کا موضوع دکھیا انسانیت اوراس کی تمنائیں ہیں،اس کے ہرہر شعر میں ماحول کی سخت گیری کا احساس ہے جس نے اس کی شاعری کوگمبھیر بنا دیا ہے۔لیکن اس دم گھونٹ دینے والی فضا سے باہر نکل آنے کی خواہش نے اس کی شاعری میں تڑپ اورحوصلہ مندی پیدا کی ہے۔اس لیے اس کی شاعری ایک زخمی دل کی پکار ہی نہیں بلکہ عہد حاضر کے انسان کی للکار ہے۔کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ ساتھ درد،تپش،امنگ اورحوصلہ مندی کے امتزاج نے اس کی شاعری کوبہت خوشگوار بنا دیا ہے۔237

سردارجعفری کا مضمون ''میرا نغرہ روٹی اور کتاب ہے'' اردو دنیا جولائی 1998 میں شائع ہوا اردو شاعری کی اہمیت اور وسعت پر اظہار خیال کرتے ہوئے علی سردارجعفری رقمطراز ہیں:

اردو نہایت خوبصورت اور دل آویز زبان ہے۔اس کے ہزار بارہ سو کلاسیکی اشعار میں اتنی وسعت ہے کہ ان کے اندر ایک دنیائے معانی آباد ہے اور وقت ضرورت ہر موقع،ہر محفل،ہر کیفیت،ہر مزاج کا شعر زبان پر آجاتا ہے اور انسانی جذبات کی کہکشاں میں ایک ہی لفظ طرح طرح کے معنی اختیار کرلیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ غالب کے دو عاشقانہ شعر ؎

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

میری گرفتاری پر اس طرح صادق آئے ہیں جیسے اس موقع کے لیے کہے گئے ہوں۔اردو شاعری نے اپنے جمالیاتی سفر میں ملک اور اقوام کے سیاسی سفر سے بے نیازی اور بے گانگی کا انداز کبھی اختیار نہیں کیا۔اس کے پاس صوفیانہ روایت کا جو ورثہ ہے اس میں مذہبی بیوروکریسی اور دنیاوی بیوروکریسی دونوں سے اجتناب شامل ہے۔شیخ ،ناصح ،واعظ،زاہد،محتسب،ملا اور اس قبیل کے دوسرے کردار اردو شاعری کے ہدف ملامت ہیں۔ان کی تنگ نظری،انتہاپسندی،ظاہرداری،مکاری اور خودپسندی پر خوب طنز کیا گیا ہے۔ان کے تصور مذہب اور تصور جنت و دوزخ،عذاب وثواب سب کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ان کے مقابل پرندوں اور عاشقوں کی دنیا ہے جن کے دل انسانی ہمدردی سے سرشار ہیں۔خدا تک پہنچنے کے لے انسان سے محبت کرنا ضروری ہے۔سب سے بڑا گناہ دل توڑنا ہے۔اس میں مومن اور کافر کی تفریق نہیں ہے۔یہ ساری کائنات حسن کی جلوہ گری ہے اور اس جلوہ گری کے بے شمار رنگ ہیں۔238

دیباچے اور تبصرے

سردار جعفری کی تنقید کے سلسلے میں ان کی تصانیف اور تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ ان کے لکھے دیباچے اور پیش لفظ کو بھی دیکھنا ہوگا۔

ذیل میں ان کے لکھے چند دستیاب دیباچوں اور پیش لفظ کا مطالعہ پیش خدمت ہے:

سردار جعفری نے کرشن چندر کے افسانوی مجموعہ ''ہم وحشی ہیں'' کا دیباچہ 16 نومبر 1947ء کو لکھا تھا۔اس میں آزادی کے بعد ہونے والے خونی فسادات اور خانہ جنگی کی تباہیوں اور بربادیوں کا ذکر کیا۔اسکے بعد ادیبوں کو اپنے فرائض پورے کرنے کے لیے کہا۔

ہمیں ادیبوں کی حیثیت سے اپنے فرائض پورے کرنے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کے ادیب جاگ رہے ہیں اور وہ اس وحشت،درندگی اور روح کے گھٹنے پن کو محسوس کر رہے ہیں جس نے ہندوستانی زندگی کو روک لگا دیا ہے۔بمبئی کے ادیبوں اور فن کاروں نے امن جلوس نکالا۔پاکستان کے ادیب اپنی کانفرنس کر رہے ہیں،لیکن اکثریت کی زبانیں ابھی گنگ ہیں۔ان کے قلم خاموش ہیں۔جہاں تک مجھے معلوم ہے اوپندر ناتھ اشک،عصمت چغتائی،احمد عباس،کیفی اعظمی،یوسف ظفر، فکر تونسوی اور کرشن چندر کے علاوہ کسی ادیب نے فساد پر قلم نہیں اٹھایا ہے۔اب تک جو لکھا گیا ہے وہ بہت اچھا ہے،لیکن کافی نہیں ہے۔یہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کے برابر ہے۔غنڈوں کے چھرے قلم سے زیادہ تیز چل رہے ہیں۔ان کی بندوقوں کی آوازیں،شاعروں کی آواز سے زیادہ بلند ہیں۔انسانی خون کا سیلاب ان ادب پاروں کو بہا لے جائے گا۔ہمیں ابھی اتنی

کتابیں لکھنی ہیں کہ ہم ان کے ڈھیر سے بند باندھ سکیں، پشتے بنا سکیں۔اس کو ہنگامی ادب کہہ کر صرف وہی لوگ ٹال سکتے ہیں جن کی روحیں سڑ گئی ہیں اور شعر و فن کے چشمے خشک ہو گئے ہیں۔آج چالیس کروڑ ہندوستانی اور پاکستانی ایک ایک ادیب اور ایک ایک شاعر کو نام لے کے آواز دے رہے ہیں۔تم نے ہمارے گونگے جذبات کو زبان عطا کی تھی، آؤ اور ہمارے دلوں کے نئے زخم دیکھو، اپنے چاروں طرف مڑ کر دیکھو، تمہیں بے شمار سہمی ہوئی آنکھیں نظر آئیں گی۔سنو ہمارے اینٹھے ہوئے ہونٹوں پر کون سے لفظ تڑپ رہے ہیں۔ہمارے سینوں میں کیسے نعرے جکڑے ہوئے ہیں جو نکل آنے کے لیے بے تاب ہیں۔تم ان گیتوں کو گا سکتے ہو ہم گانا چاہتے تھے اور نہیں گا سکے۔تم ان کہانیوں کو سنا سکتے ہو جو لہولہان ہو گئی ہیں۔ان ادھورے خوابوں کو پورا کر سکتے ہو جن کے تار و پود بکھر گئے ہیں۔239

سردار جعفری نے سعادت حسن منٹو کے افسانوی مجموعہ ''چغد'' کا دیباچہ اپریل 1948ء میں لکھا۔سردار جعفری نے بتایا کہ ''منٹو کی افسانہ نگاری ہندوستان کے درمیانی طبقے کے مجرم ضمیر کی فریاد ہے۔اسی لیے منٹو اردو کا سب سے زیادہ بدنام افسانہ نگار ہے اور وہ بدنامی جو منٹو کو نصیب ہوئی ہے، مقبولیت اور شہرت کی طرح صرف کوشش سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔اس کے لیے فن کار میں اصلی جوہر ہونا چاہئے اور منٹو کا جوہر اسکے قلم کی نوک پر نگینے کی طرح چمکتا ہے۔

منٹو کے کرداروں پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

منٹو نے ان کرداروں کی تصویر کشی کی ہے جن سے سرمایہ داری نظام نے ان کی انسانیت چھین لی ہے۔یہ سب پہلے بھی انسان تھے یا ان میں انسان بننے کی صلاحیت تھی لیکن اس سماج نے جس کی بنیاد لوٹ کھسوٹ پر ہے، ان سب کو جانور بنا دیا ہے۔وہ جانور جن کی صورتیں انسانوں کی سی ہیں لیکن پھر بھی انسان نہیں ہیں۔منٹو جھنجھلا جاتا ہے۔وہ ان کی روح کے اندر جھانک کر دیکھتا ہے اور اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کے سینوں کے اندر انسانی دل دھڑک رہے ہیں۔240

منٹو نے اپنے افسانوی مجموعہ ''چغد'' میں اصلی دشمن کو پہچان کر گولی مارنے کی بات کہی تھی اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے۔

''منٹو کو یہ نہیں معلوم کہ اس کا پستول اس کا قلم ہے جو اس کے ہاتھ میں ہے اور اس کا وار گولیوں سے بھی زیادہ کارگر ہے۔241

سردار جعفری نے منٹو کی اس صلاحیت کا ذکر کیا جس سے وہ سماج کی گندگی سماجی اور سیاسی مظالم کے خلاف احتجاج کر سکتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

منٹو نے سماج کی گندگی کو دیکھا ہے۔وہ انسانوں سے محبت کرتا ہے، اس میں سماجی اور سیاسی مظالم کے خلاف احتجاج کرنے کی قوت ہے۔وہ ترقی پسند قبرستان، میں سرمایہ دار سماج کے خلاف بڑا تلخ طنز کر سکتا ہے۔242

سردار جعفری نے اپنی تمثیلی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' کا پیش لفظ لکھا ہے۔

اس میں سردار جعفری نے اس نظم کے تعلق سے وضاحت کی:

یہ ایک منظوم تمثیل نہیں بلکہ تمثیلی نظم ہے۔ اسکے کردار کردار نہیں بلکہ صرف علامتیں ہیں۔ کہانی پلاٹ نہیں صرف مبہم سا خاکہ ہے جسے میں نے رنگ بھرنے کے لیے بنایا ہے۔ واقعات کے بجائے واقعات سے پیدا ہونے والے جذبات، تاثرات اور احساسات پیش کیے گئے ہیں۔ سب سے زیادہ اہم کردار وہ بچہ ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوا ہے اور وہ نئی دنیا کی علامت ہے اور اس کی معصوم روح پوری نظم پر حاوی ہے۔243

مذکورہ بالا بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر زاہدہ زیدی لکھتی ہیں:

''سردار جعفری نے اپنے اس بیان میں اپنی اس تخلیق پر جو روشنی ڈالی ہے اس کی معنویت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ منظوم ڈرامہ نہیں بلکہ تمثیلی نظم ہے کیونکہ بیشتر سنجیدہ اور معنی آفریں ڈراموں میں احساسات، تاثرات اور داخلی کیفیات خارجی واقعات سے زیادہ اہم ہوتی ہیں اور واقعات اور کرداروں کی علامتی معنویت یا ان میں ایک علامتی بعد تو دنیا کے اہم ترین ڈراموں کی ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے۔244

اپنے پیش لفظ میں سردار جعفری نے اس تخلیق کے مرکزی موضوع اور وزن کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

دنیا کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جس میں انسان کو شکست ہوئی ہو، افراد اور طبقات کو شکست ہوتی رہی ہے اور ہوگی لیکن انسان نا قابل شکست ہے کیوں کہ اس کی محنت عمل اور جدوجہد اس کے اپنے شعور ہی کی نہیں بلکہ اس کے ماحول کی بھی خالق ہے اور یہ عقیدہ جو اندھا عقیدہ نہیں، میرا سب سے بڑا انسپریشن ہے اور میں اسے ادب اور فن کا ابدی موضوع سمجھتا ہوں، سب سے زیادہ شاندار سب سے زیادہ عظیم المرتبت سب سے زیادہ حسین انسان ہے۔245

پروفیسر زاہدہ زیدی نے سردار جعفری کی تخلیق ''نئی دنیا کو سلام'' کو تمثیلی نظم تسلیم کرنے سے اختلاف کیا ہے اور اس تجریدی قسم کا منظوم ڈرامہ قرار دیا ہے۔

ان کے دلائل کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

سردار جعفری نے اس تخلیق کو تمثیلی نظم کہا ہے اور ان کے بعد ہر قسم کے نقاد بھی اسے تمثیلی نظم ہی کہتے رہے ہیں۔ اس لیے میرا کام کچھ دشوار ہو گیا ہے اور مجھے یہ بھی ثابت کرنا ہوگا کہ یہ ایک تمثیلی نظم نہیں بلکہ تجریدی قسم کا منظوم ڈرامہ ہے جس کی علامتی معنویت بھی اہم ہے اور اس سلسلہ میں میں صرف چند اشاروں پر اکتفا کروں گی۔

1) سب سے پہلے تو یہ کہ اسے اسٹیج پر پیش کیا جا سکتا ہے اور کیا جا چکا ہے یعنی خود میں اس کے چار مناظر کو ڈرامے کے طور پر اسٹیج پر پیش کر چکی ہوں اور اس پیشکش میں مریم کا رول بھی میں نے خود ہی ادا کیا تھا۔

2۔ دوسرے یہ کہ اس تخلیق کے اجزائے ترکیبی وہی ہیں جو ایک ڈرامے کے لیے لازمی ہیں۔ یعنی ایک مربوط کہانی اور ڈرامائی قسم کے مانوس کردار جن کی علامتی معنویت سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن وہ حقیقت کی کسوٹی پر بھی کھرے اترتے ہیں۔ اس ڈرامے کی کہانی جاوید اور مریم کی شادی اور رومانس سے شروع ہو کر مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی اور وسیع تر مسائل کو اپنے دامن میں سمیٹتی ہوئی جاوید کی شہادت پر ختم ہوتی ہے۔

3۔ اس ڈرامے میں چار ایسے کرداروں یعنی جاوید، مریم، فرنگی اور نامہ بر کے علاوہ جو ڈرامے کے ایکشن میں براہ

راست حصہ لیتے ہیں، چار نیم ڈرامائی کردار یعنی ''زندگی، موت، وقت، اور تاریخ بھی ہیں جو مجرد تصورات کی ڈرامائی تجسیم ہیں۔ یہ علامتی کردار ڈرامے کے ایکشن میں براہِ راست حصہ نہیں لیتے بلکہ اس کے بنیادی اور مرکزی تصورات پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں اور ان کے ترانے اور منظوم بیانات ڈرامے کے ایکشن کو ایک وسیع تر تناظر میں دیکھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے ان نیم ڈرامائی کرداروں کو بھی اس ڈرامے کے کورس سے تعبیر کر سکتے ہیں اور اس کو اس کی مناسب اور تخیل آفرین پیشکش ڈرامے کی معنویت اور اثر انگیزی میں اضافہ کر سکتی ہے۔ نئی دنیا کو سلام، کورس کی نوعیت سمجھنے کے لیے ہمیں جدید منظوم ڈرامے پر نظر ڈالنی ہوگی جس کا احیا انگلستان اور امریکہ میں بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ہوا۔ اس دور کے منظوم ڈراموں میں کورس کا استعمال کافی تخیل آفریں انداز سے کیا گیا جس کی ایک تابناک مثال ایلیٹ کے شہرہ آفاق ڈرامے 'مرڈران دی کیتھڈرل'' یعنی کلیسا میں قتل کا کورس ہے۔ مختصر یہ کہ نئی دنیا کو سلام میں کورس کی شمولیت اس کی ڈرامائیت میں حائل نہیں ہوتی بلکہ اسے جدید تجریدی ڈرامے کی صنف میں لا کھڑا کرتی ہے۔

4۔ اب رہا حرفِ اول اور حرف آخر کا سوال تو اسے انگریزی زبان میں Prologue اور Epilogue کہا جا سکتا ہے اور یہ اگر ڈرامے کا لازمی حصہ نہیں تو ایک جائز حصہ تو ضرور ہیں اور نئی دنیا کو سلام میں یہ دونوں منظوم بیانات خوبصورت اور معنی خیز ہیں۔ حرف اول ڈرامے کی پیشکش کے لیے ایک مناسب فضا تشکیل کرتا ہے اور حرف آخر اس کے مرکزی خیال کو نہایت اختصار اور قطعیت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

ان اشاروں کے بعد جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نئی دنیا کو سلام ایک جدید منظوم ڈراما ہے سردار جعفری نے اس ڈرامے کو چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جنھیں انھوں نے تصویر میں کہا ہے۔ مثلاً پہلی تصویر، دوسری تصویر وغیرہ۔ لیکن ہم انھیں منظر کہیں گے، اور کیوں کہ ڈرامے کی بنیادی اکائی ایک متحرک منظر ہے۔ حرف اول میں ڈرامے کے پس منظر اور صورت حال کے المناک پہلو ان کو ایک انوکھے انداز سے پیش کیا گیا ہے اور یہ ظلم، دہشت، بربریت، عوامی استحصال، بے بسی، بے کسی اور اخلاق کنفیوژن کا منظر نامہ ہے۔

5) میرے خیال کے مطابق اس ڈرامے کا طرز اظہار علامتی ہونے کے ساتھ ساتھ وضاحتی بھی ہے۔ ایک علامتی اور وژنری ڈرامے کی حیثیت سے اس کی معنویت کی کئی سطحیں ہیں جو اس کی ساخت میں پیوست اور شعری اسلوب میں منکشف ہیں۔ پہلی سطح پر یہ ڈرامے جاویداور مریم کی زندگی کی داستان ہے جو ان کی شادی سے شروع ہو کر جاوید کی موت پر ختم ہوتی ہے۔

دوسری سطح پر نئی دنیا کو سلام، ہندوستان کی جنگ آزادی کی کہانی ہے۔ جو شاعر کی انقلابی فکر کی تجسیم ہے اور اس تاریخی تناظر میں ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور معاشی صورتحال کی تصویر کشی کی گئی ہے اور انگریزوں کے ظلم، استحصال اور استبداد کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور عوامی بیداری اور انقلابی جدوجہد کے واضح اشارے بھی ملتے ہیں اور قانون، عدل، انصاف اور انسانی حقوق پر فکر انگیز مباحث بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اس سطح پر جاوید اور مریم جنگ آزادی کے سپاہی ہیں اور ان کی جدوجہد کا نقطۂ عروج جاوید کی شہادت ہے۔ معنویت کی اس سطح پر ان کا بچہ ہندوستان کے روشن مستقبل اور آزادی کے وسیع تر امکانات کا

استعارہ ہے۔تیسری اوراعلیٰ ترین سطح پر یہ ڈرامہ شاعر کی آفاقی وژن کی تجسیم ہے اور یہاں شاعر ڈرامہ نگار نے وقت کے تصور، زندگی کی تخلیقی توانائی اوراس کے نقوش کا مٹ مٹ کر ابھرتے رہنا انسان کی عظمت، سربلندی، تلاش، جستجو، انسان اور فطرت کے باہمی تعلق تہذیب، اور تمدن کی نوعیت، سربلندی، تلاش، جستجو، انسان اور فطرت کے باہمی تعلق تہذیب، اور تمدن کی نوعیت کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور اس سطح پر مرکزی ڈرامائی کردار یعنی جاوید اور مریم اور نیم ڈرامائی کردار یعنی زندگی، موت، تاریخ اور وقت سبھی علامتی اور تمثیلی نوعیت کے کردار ہیں اور جاوید اور مریم کا بچہ زندگی کی تڑپ، ذوق، نمو، تخلیقی توانائی، تسلسل حیات اور ارتقاء کے تصورات کا استعارہ ہے اور اس سطح پر اس کی علامتی معنویت بہت گہری اور ہمہ گیر ہے اور خود سردار جعفری کے الفاظ میں اس کی معصوم روح پوری نظم (ڈرامے) پر حاوی ہے اور معنویت کی ان تینوں سطحوں کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سردار جعفری نے ڈرامے کے تقریباً سبھی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے وسیع اور کثیر الجہت ورژن کو فن کے قالب میں ڈھالنے اور ڈرامے کی ساخت میں پیوست کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ سردار جعفری کو اردو میں جدید منظوم ڈرامے کا پیش رو بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔246

سردار جعفری نے 12 فروری 1952ء کو کرشن چندر کے ناول ''جب کھیت جاگے'' کا دیباچہ تحریر کیا۔ یہ دیباچہ دس صفحات پر محیط ہے۔ابتداء میں سردار جعفری نے لکھا ہے کہ کرشن چندر اردو کا سب سے بلند قامت افسانہ نگار ہے۔

کرشن چندر کے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

کرشن چندر کی نظر میں گہرائی اور تخیل میں بلا کی اڑان ہے۔تحریر میں سیلاب کا سا بہاؤ ہے اور اثر انگیزی بے پناہ ہے۔ دشمن اور نکتہ چیں بھی اس کے قائل ہیں۔میں اس کی تحریر کو ''سیلاب حسن'' کہتا ہوں۔جسے ڈاکٹر ملک راج آنند نے شاعرانہ حقیقت نگاری کا خوبصورت نام دیا ہے اس پر حیرت نہ ہونی چاہئے کہ جو حسن کرشن چندر کی کہانیوں میں ہے کہیں پایا نہیں جاتا۔

شاعرانہ تخلیق کے یہی معنی ہیں جیسے چاندنی ہر چیز کو پراسرار اور حسین بنادیتی ہے۔ویسے ہی کرشن اپنے تخیل کے نور سے حقیقت میں ایسا پراسرار حسن پیدا کردیتا ہے جس کا طلسم ٹوٹتا ہی نہیں۔فطرت کے حسن پر یہ اضافہ معمولی کارنامہ نہیں ہے۔247

افسانے میں شاعرانہ انداز کی اہمیت، شاعری اور افسانوں میں الفاظ کی الگ الگ اہمیت اور کرشن چندر نے الفاظ سے کیا کیا کام لیا ہے ان پر روشنی ڈالتے ہوئے سردار جعفری نے بتایا ہے:

میں اُن لوگوں سے متفق نہیں ہوں، جن کا یہ خیال ہے کہ کرشن کا شاعرانہ انداز بیان افسانے کو افسانہ نہیں رہنے دیتا۔میرا خیال یہ ہے کہ اس سے اثر آفرینی بڑھ جاتی ہے اور یہ انداز بیان اس کی کہانیوں کے مواد اور موضوع کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے جیسے پھول کے ساتھ رنگ، اور رنگ کے بغیر پھول کا کوئی تصور ممکن نہیں ہے۔یہ صحیح ہے کہ شاعری میں الفاظ کی اہمیت افسانے سے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ان کی موسیقی اور معنویت براہ راست جذبات کو متحرک کرتی ہے جب کہ افسانے میں الفاظ سے واقعات اور کرداروں کی تخلیق کی جاتی ہے اور پھر وہ واقعات اور کردار جذبات کو متحرک کرتے ہیں اس طرح افسانے میں الفاظ کی اہمیت ثانوی ہو جاتی ہے۔یعنی شاعری میں الفاظ کی ترتیب جذباتی ہوتی ہے اور افسانے اور نثر کی دوسری تحریروں میں

منطقی ،لیکن کرشن چندر الفاظ سے بہ یک وقت دونوں کام لیتا ہے اور افسانے کے منطقی تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے جذبات کے تاروں کو بھی چھیڑ جاتا ہے۔اس طرح کرداروں کی روح کی گہرائی نظر آجاتی ہے اور حقیقت ے دل کی دھڑکنیں سنائی دینے لگتی ہیں۔

کرشن چندر کے افسانوں میں عصری حسیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری رقمطراز ہیں:

''اس کی (کرشن چندر) افسانہ نگاری نے ہندوستان میں سامراجی تشدد، جاگیرداری، ظلم اور غلامانہ بربریت دیکھی، افلاس، جہالت وہم اور دیوانگی دیکھی، کہیں اس نے آنسو بہائے اور کہیں طنز کے تیز تیر چلائے اور کہیں زمین کے پھولوں اور آسمان کے ستاروں کو چنتی ہوئی گزر گئی۔اس نے لاہور، دہلی اور لکھنو کی گلیوں میں آوارہ گردی کی۔بمبئی کے کام گار میدان میں مزدوروں کے جلوسوں میں شرکت کی۔اس نے ہڑتالوں میں لاٹھیاں اور گولیاں کھائیں۔فرقہ وارانہ فسادات میں وہ چھروں سے زخمی ہوئی، قحط میں بھوکی مری، جیل خانوں میں بند رہی، پھانسی کے تختوں پر چڑھی اور افق دار کی اس بلندی سے اس نے ہمالیہ کے اسپارلینن اور راسٹالن اور گورکی اور ایلیا اہرن برگ کی وہ شفق رنگ سرزمین دیکھی جہاں انسان پہلی بار مکمل طور پر سے آزاد ہوا ہے۔اس نے تاریخ کے چہرے سے ماہ وسال کی نقابیں اٹھائیں، وقت کی رفتار کو پرکھا اور زمانے کے سینے میں انسان کے سینے کا سوز ڈھونڈ نکالا۔

کرشن کی کہانی میں ہندوستان کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہے جہاں سے اس نے اپنا خمیر حاصل کیا ہے۔اس کی رگوں میں وقت اور تاریخ کا خون ہے اور دل مین عوام کے دل کی دھڑکن۔اس طرح کرشن نے اس جمہوری حقیقت نگاری کو آگے بڑھایا ہے جس کی بنیاد پر پریم چند نے ڈالی تھی۔پریم چند کی جولاں گاہ ماضی سے حال تک تھی اور کرشن کی جولاں گاہ حال سے مستقبل تک ہے''۔248

صدیوں سے کسانوں کی بدحالی کی داستان بتاتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

''کسان صدیوں سے زمین میں بیج بو رہا ہے اور فصل اُگا رہا ہے۔جب چمکتی ہوئی تیز دھوپ پڑتی ہے اور زمین کے ہونٹ سوکھ جاتے ہیں۔جب اسمیں ہل چلایا جاتا ہے اور بیج بویا جاتا ہے جب پانی برستا ہے آندھی آتی ہے، طوفان اٹھتا ہے تو کسان کھیت یں اکیلا ہوتا ہے لیکن جب پودے بڑے ہوجاتے ہیں اور بالیاں پھلنے لگتی ہیں اور کھلیان لگ جاتے ہیں تو زمین دار، ساہوکار اور نہ جانے کون کون کہاں کہاں سے آجاتا ہے اور کھیت کی کوکھ اجڑ جاتی ہے اور کھلیانوں کے سینے ویران ہوجاتے ہیں اور بھوکا کسان اور اس کے بلکتے بچے اپنے افلاس میں منہ ڈھانپ کے سوجاتے ہیں۔249

1952ء میں لکھے گئے اس دیباچہ میں سردار جعفری نے ہندوستان کی معیشت اور سیاست میں زرعی مسئلہ کا حل پیش کیا ہے۔

ملاحظہ کیجیے:

آج ہندوستان کی معیشت اور سیاست میں زرعی مسئلہ نے مرکزی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔سارے ملک میں قحط اور بے روزگاری کی پرچھائیں منڈلا رہی ہیں۔زیادہ غذا پیدا کرنے کے لیے طرح طرح کے منصوبے بنائے ہیں جن پر کروڑوں

روپئے صرف کیا جارہا ہے لیکن یہ مسئلہ حل ہونے کے بجائے اور الجھتا جارہا ہے کیوں کہ مسئلے کی اصلی نوعیت یہ ہے کہ کسان کے پاس زمین نہیں ہے۔ پچاس سے پچھتّر فی صد تک کسان کھیت مزدور ہیں۔ جاگیرداری نظام معیشت نے ہندوستان کی زرخیز زمین کی وافر پیداوار کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں اور جب تک کسان کو زمین نہیں دی جاتی اس کے قرضے معاف نہیں کیے جاتے، لگان میں کمی نہیں کی جاتی اور اسے زراعت کے لیے سرکاری زمین نہیں دی جاتی اس وقت تک غذا، روزگار اور خوش حالی کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ بدحال کسان جو دو وقت پیٹ بھی نہیں بھر سکتا اور جو ملک کی آبادی کی سب سے بڑی اکثریت ہے، اگر بدحال رہے گا تو شہر سے سامان نہیں خرید سکتا، اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ تو تجارت چل سکتی ہے اور نہ کارخانے۔ جب مال بکے گا نہیں تو کارخانے مال تیار کر کے کیا کریں گے۔ جب کارخانے مال تیار نہیں کرتے تو چھٹی ہوتی ہے اور بے روزگاری پھیلتی ہے۔ پھر جرائم بڑھتے ہیں۔ بداخلاقی بڑھتی ہے اور ادب اور تہذیب و تمدن کو نقصان پہنچتا ہے۔ ادیب کی کتابیں نہیں بکتیں۔ وہ بھی بھوکے مرتے ہیں لیکن اس کے برعکس خوش حال کسان شہر کو غلہ اور غذا دے گا اور اس کے بدلے میں شہر سے مال خریدے گا جس سے تجارت کو فروغ ہوگا۔ کارخانوں کی پیداوار بڑھے گی۔ نئی صنعتیں ترقی کریں گی۔ بے روزگاری ختم ہوگی۔ تعلیم بڑھے گی۔ تہذیب و تمدن کا معیار اونچا ہوگا۔ ادیبوں کی کتابیں بکیں گی۔ ادب اور فن کا فروغ ہوگا۔ اس لیے آج ادیبوں کے ادبی اور فنی مسائل بھی کسانوں کے مسائل سے وابستہ ہو گئے ہیں اور زرعی سوال نے مرکزی حیثیت اختیار کر لی ہے جس کو حل کرنے کی کوشش کے ایک قدم کا نام تلنگانہ کی جدوجہد ہے۔..... یہ ایک بائیس سال کے کسان راگھو راؤ کی کہانی نہیں ہے، بلکہ تلنگانہ کی عظمت، آبرو اور وقار کی کہانی ہے۔ یہ ہندوستان کی موجودہ جمہوری تحریک آزادی کے حال و مستقبل کی کہانی ہے۔ کرشن نے اپنے ہیرو کی معصومیت اور پاکیزگی کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔250

آخر میں سردار جعفری نے کرشن چندر کی ناول جب کھیت جاگے کا ایک اقتباس پیش کیا جس کا ایک جملہ یہ ہے:

اگر ظلم سے مدافعت کرنا تشدد ہے، اگر اپنی جان کی حفاظت کرنا، اپنی ماؤں کی عزت بچانا، اپنے گاؤں کے کھیتوں کی سنہری بالیوں کی حفاظت کرنا تشدد ہے تو پھر خود جینا بھی تشدد ہے اور سانس لینا بھی تشدد ہے اور دل کا دھڑکنا بھی تشدد ہے۔251

مجروح سلطان پوری کا منتخب شعری مجموعہ ''غزل'' کے عنوان سے شائع ہوا جس کا تعارف جنوری 1953 میں سردار جعفری نے لکھا۔

اردو غزل کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اردو غزل محض فارسی کی نقالی ہے حالاں کہ نقالی کی گئی ہے لیکن اردو غزل نے بحیثیت مجموعی اپنا الگ راستہ بنایا ہے جس پر اساتذہ کلام شاہد ہے۔ میرؔ اور غالبؔ خصوصیت کے ساتھ۔ موجودہ زمانے میں جن شعرا نے خاص طور سے غزل کو سنوارا ہے ان میں اقبال، جوش، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، معین احسن جذبی، فیض احمد فیض اور مجروح سلطان پوری کے نام سب سے زیادہ روشن ہیں۔252

مجروح کی غزل پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

1۔ مجروح نے اپنی غزل کو نئے خیالات اور احساسات اور سماجی کشمکش اور انقلاب کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ سب

سے پہلے عشق ہی کے موضوع کو لیجیے جو ابدی سمجھا جاتا ہے۔مجروح کے یہاں اس کا روپ اس اعتبار سے نیا ہے کہ انھوں نے معشوق کو دوسرے ترقی پسند شعراء کی طرح رفیق زندگی اور رفیق سفر بنا کر پیش کیا ہے۔

اس تصویر کے پیچھے سماجی شعور کا ایک کارواں ہے۔اس طرح مجروح نے عشق کو اپنے ترقی پسند شعور کا رنگ دے کر مزید زندگی دی ہے۔

2۔مجروح نے اپنی چھوٹی چھوٹی ذاتی خوشیوں اور ذاتی غموں کو سماجی زندگی کی خوشیوں اور غموں کے سمندر میں ملا دیا ہے اور پھر اس سمندر سے اپنے شاعری کے جام بھرے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مجروح کا ہر شعر بیک وقت ان کے اپنے دل کی آواز بھی ہے اور زمانے کے دل کی دھڑکن بھی.....

3۔انھوں نے سماجی اور سیاسی موضوعات کو بڑی کامیابی کے ساتھ غزل کے پیرایہ میں ڈھال لیا۔253

مجروح کے منتخب شعری مجموعہ کا تعارف پیش کرتے ہوئے سردار جعفری نے مجروح کو مشوروں سے نوازا اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کی۔

سردار جعفری رقمطراز ہیں:

مجروح کو بڑا شاعر بننے کے لیے اس آہنگ کو اور زیادہ بلند کرنا ہے اور یہ ہو کے رہے گا۔کیوں کہ دور وسطی کے شعرا نے جس جنگ کی ابتداء کی تھی آج کے ترقی پسند شاعر اس کی انتہا کر رہے ہیں۔ان کی لڑائی جاگیردار ذہنیت کے خلاف تھی، ہماری لڑائی جاگیرداری اور سامراجی ذہنیت کے خلاف ہے۔اس لیے ہم کو اپنی نوا اور زیادہ تلخ و تیز کرنی پڑتی ہے۔اب نئی منزلیں ان کا انتظار کر رہی ہیں۔ان کے گرد و پیش بکھرے ہوئے ہزاروں موضوع مجروح کے تغزل کا لباس پہننے کے لیے بے تاب ہیں۔ ہزاروں ناآفریدہ نغمے تلوار بننے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔254

سردار جعفری نے یہ لکھا ہے کہ ”ہر اچھی شاعری کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں بات سب کی نکلتی ہو لیکن انداز شاعر کا ہونا یہی وہ انفرادیت اور اجتماعیت ہے جو شاعر کو عظمت بخشتی ہے۔255

علی سردار جعفری نے 23 نومبر 1955ء کو ساحر لدھیانوی کی نظم ”پرچھائیاں“ کا دیباچہ تحریر کیا ہے۔اسے ڈاکٹر محمد فیروز نے اپنی مرتبہ کتاب ”سردار جعفری کی نادر تحریریں، میں شامل کیا ہے۔

ابتداء میں سردار جعفری نے غالب کا حوالہ دیا کہ حسن کی کیفیت کے لیے سادگی و پرکاری، بے خودی اور ہوشیاری درکار ہے۔سردار جعفری نے غالب سے اتفاق کرتے ہوئے نظم کے مکمل پیکر حسن بننے کے لیے ان ہی چار کیفیات کے امتزاج کو ضروری قرار دیا۔

سردار جعفری نے ساحر لدھیانوی کی شاعری میں ان کیفیات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

ساحر نے ایک سادہ سی کہانی کو جو بارہا ہم نے سنی ہے اور دیکھی ہے اور محسوس کی ہے اور نظر انداز کی ہے، اپنی رنگین بیانی اور آتش بیانی سے پرکیف بنا دیا ہے۔اس کی سادگی، اس کے موضوع اور مواد میں ہے اور پرکاری اس تکنیک میں جو شاعر نے استعمال کی ہے۔بے خودی اس مکمل ہم آہنگی سے پیدا ہوئی ہے جو شاعر کو اپنے موضوع سے ہے اور اس بے خودی کے عالم میں

بھی اس کے سماجی شعور نے اسے ہوشیار رکھا ہے۔اگر یہ ہوشیاری نہ ہوتی تو رنگین بیانی میں آتش بیانی کی آمیزش نہ ہوسکتی اور نظم کا آخری حصہ نہ لکھا جاتا۔256

سردار جعفری نے بتایا کہ ساحر لدھیانوی کی اس نظم کی اثر آفرینی کسی ایک طبقے یا گروہ تک محدود نہیں جس کی دو وجہیں ہیں۔پہلی وجہ تو اس کا موضوع اس کا سب سے اہم سوال ہے۔دنیا کی نصف سے زائد آبادی نے امن عالم کے محضر پر اپنی مہر ثبت کی ہے۔دوسری وجہ نظم ''پرچھائیاں'' اپنی سادہ کہانی اور آسان بیانی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ وسیع حلقوں تک پہنچ سکے گی،اس کے نوے فی صد سے بھی زیادہ الفاظ ہماری روزمرہ گفتگو کے الفاظ ہیں۔

سردار جعفری نے اس کی تکنیک کے بارے میں لکھا ہے:

اس نظم میں کہانی کہنے کی تکنیک بھی نئی ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے اس سے پہلے یہ تکنیک کسی اردو شاعر نے استعمال نہیں کی اور میں جتنا غور کرتا ہوں اتنے ہی مجھے اس تکنیک کے وسیع تر امکانات نظر آتے ہیں۔یہ تکنیک ساحر نے براہ راست فلم سے لی ہے جس میں وہ کئی سال سے ایک کامیاب گیت لکھنے والے شاعر کی طرح کام کر رہا ہے۔وہ ایک طرف خوبصورت اور کامیاب گیت لکھ رہا تھا اور دوسری طرف غالباً غیر شعوری طور سے ایک نئی تکنیک کو آہستہ آہستہ پروان چڑھا رہا تھا جس نے اب ''پرچھائیاں'' نظم کا روپ اختیار کیا ہے۔257

نظم پرچھائیاں کے آخری حصے میں پچھلی جنگوں اور آنے والی جنگوں کا جو تقابل کیا گیا ہے

گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا:

''نظم کا یہ خاتمہ بے حد خوبصورت اور موثر ہے،ساحر لدھیانوی نے اس نظم کے ذریعہ اردو کی طویل نظموں اور امن عالم کے ادب میں ایک خوبصورت اضافہ کیا ہے۔مجھے یقین ہے کہ ساحر کی نظم امن عالم کی تحریک کو آگے بڑھانے میں مدد دے گی اور دلوں کو امن اور محبت کے چراغوں سے جگمگا دے گی۔258

ساحر لدھیانوی کی نظم ''پرچھائیاں'' کے دیباچہ میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

''اس منزل میں ساحر کی شاعری مکمل طور پر اجتماعی شعور کی حامل ہوئی ہے اور احساس تشکیک اور نا آسودگی حالات نے انقلاب کی راہیں ڈھونڈلی ہیں۔اس لیے انھوں نے محسوساتی کیفیات کا جرأت مندانہ اظہار بھی کیا ہے اور اس نظام کو بدلنے کے لیے جہد و پیکار کا ولولہ انگیز پیام بھی دیا ہے۔259

ڈاکٹر انور ظہیر خان نے لکھا ہے:

''ساحر چوں کہ نظریاتی طور پر انسانی عظمت،سماجی مساوات اور عدل و انصاف کے حامی ہیں لہٰذا امن و تہذیب کی بقاء

اور انسانی زندگی کے تحفظ کی خاطر متحد ہو کر غور و فکر کا پیغام بھی دیتے ہیں اور عالمی امن کے قیام کا احساس بھی جگاتے ہیں۔ان کی نظم۔

چلو کہ چل کے سیاسی مقاموں سے کہیں
کہ ہم کو جنگ و جدل کے چلن سے نفرت ہے
جسے لہو کے سوا کوئی رنگ راس نہ آئے
ہمیں حیات کے اس پیرہن سے نفرت ہے
کہو کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے
تو اس دمکتے ہوئے خاک داں کی خیر نہیں
جنوں کی ڈھالی ہوئی ایٹمی بلاؤں سے
زمیں کی خیر نہیں آسمان کی خیر نہیں
گذشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گذشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

مذکورہ نظم کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر انور ظہیر خان نے لکھا ہے کہ یہ نظم صرف دوسری عالمگیر جنگ کی قیامت خیزیوں اور تباہ کاریوں کا منظر نامہ ہی نہیں، جس میں گرد و پیش کی زندگی جنگ اور قحط اور افلاس کے سیلاب میں ڈوب جاتی ہے۔260

بلکہ اس دکھی دل کی پکار بھی ہے جس کے محبوب کی عصمت و عفت، جس کی فہم و فراست، جس کا سرمایۂ محبت اور جس کی عظمت و شہرت سب کچھ اس جنگ کی نذر ہو جاتا ہے لہٰذا اس نظم کے ذریعے ساحر نے ساری دنیا کو نہ صرف تیسری عالمی ایٹمی جنگ کے خطرات سے آگاہ کیا ہے بلکہ اس منحوس جنگ کے خلاف امن و آشتی کی بحالی کے لیے منظم ہونے کی تلقین بھی کی ہے۔261

سردار جعفری نے اچھی نظم کی خصوصیات بیان کی ہیں، ملاحظہ ہو:

''ایک اچھی نظم کی خصوصیات وہی ہیں جنھیں غالب نے حسن کی کیفیت کو چار لفظوں میں ادا کیا ہے: ''سادگی و پرکاری، بے خودی و ہوشیاری، ان چاروں کیفیات کا امتزاج مشکل ہے لیکن جب یہ مشکل آسان ہو جاتی ہے تو نظم ایک مکمل پیکر حسن بن کر سامنے آتی ہے اور دل کو موہ لیتی ہے''۔262

حرف آغاز: آتش تر: خمار بارہ بنکوی

خمار بارہ بنکوی کے شعری مجموعہ ''آتش تر'' کا حرف آغاز سردار جعفری نے اگست 1964 میں لکھا۔خمار کی غزل کے بارے میں سردار نے لکھا ''غزل جس کا ہر شعر ہوا کے نرم اور لطیف جھونکے کی طرح آئے اور گزر جائے اور دل میں تازگی کی

ایک کیفیت پیدا کر جائے ..... یہ ہے خمار کی شاعری"۔سردار جعفری نے خمار کے شعری مجموعہ سے چند اشعار کا انتخاب بغیر کاوش سے کیا اور اس کے بعد لکھا "محبوب کی دلبری اور عاشق کی غم آشنا دل نوازی دونوں کا امتزاج ہے۔محبوب پر طنز خمار کی فطرت میں نہیں ہے۔اس شاعری میں وہی محبوب نوازی ہے جو دکن کے ولی کی خصوصیت ہے ان کے یہاں زندہ رہنے کا حوصلہ ہے جس کا اظہار وہ بہت کھلے الفاظ میں نہیں کرتے ، یہ کیفیت بہت رچی ہوئی ہے اس مزاج کے شاعر کے لیے زندگی کبھی لطف سے خالی نہیں ہوسکتی۔خمار کی غزلوں کی ایک خصوصیت ان کی بے پناہ نغمگی ہے.....خمار کے ترنم میں ایک نشاط انگیز سوز ہے۔یہی نشاط انگیز سوز ان کے شعروں میں بھی ہے"۔263

علی سردار جعفری نے کیفی اعظمی کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس" کا پیش لفظ 1977ء میں لکھا۔اس میں انھوں نے بتایا کہ کیفی کی یہ نظم اور اقبال کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ"۔یہ دونوں نظمیں اپنی عصری معنویت اور تاریخی بلاغت کے اعتبار سے بے حد اہم ہیں۔سردار جعفری نے لکھا ہے کہ اقبال نے انقلاب روس کے بعد اشتراکیت میں بے انتہا کشش محسوس کی جس کا اظہار بھی ہوا جن سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال اشتراکیت کے بعض پہلو قبول کرنے سے جھجک رہے ہیں۔

ایسی کیفیات کی وضاحت کے لیے سردار جعفری نے شیکسپیئر کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ وہ کیفیت ہے جس کو شیکسپیئر نے ہیملٹ کے کردار میں مجسم کر دیا ہے یعنی صحیح اقدام کی بے پناہ خواہش بھی اور پھر اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے سے گریز بھی۔

اس کیفیت کو شیکسپیئر نے چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے

To be or not to be that is the question

شہزادہ ہیملٹ کی اس نفسیاتی کیفیت میں سیاسی سطح پر پنڈت جواہر لال نہرو اور شاعرانہ اور مفکرانہ سطح پر اقبال شریک ہیں۔یہ تذبذب ہی ابلیس کی مجلس شوریٰ کی تخلیق کا باعث ہے ورنہ وہ (اقبال) ابلیس کی مجلس شوریٰ کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا تھا۔"264

علی سردار جعفری نے اقبال اور کیفی اعظمی دونوں کی شاعری میں ابلیس کے کردار کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

اقبال کی پوری شاعری میں ابلیس کا کردار ایک انقلابی کردار ہے۔وہ فطرت کے جدلیاتی نظام میں اثبات کے مقابلے پر نفی کی طاقت ہے اور ان کے باہمی ردعمل سے ارتقا اور انقلاب کی منزلیں طے ہوتی ہیں۔یہ مولوی کے "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" والا ابلیس نہیں ہے بلکہ وہ ابلیس ہے جو "پیام مشرق" میں اس شان سے اظہار ہوتا ہے کہ آدم کو تخلیق خدا نے کیا ہے لیکن وہ جوان ابلیس کو کود میں ہوا ہے اور اس طرح ابلہ جنت، دانائے راز، بنا ہے اور نیک و بد میں تمیز کر کے اپنی انسانی صفات کو خدائی صفات میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے یہ ایک فلسفیانہ توجیہ ہے لیکن ابلیس کی مجلس شوریٰ کے دوسرے اجلاس کا ابلیس کی ایک رجعت پسند کردار ہے جو سامراج شاہی شہنشاہیت اور فاشزم کا خالق ہے اور اپنی آنکھوں سے اپنی شکست کا نظارہ کر رہا ہے۔اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ شکست اشتراکیت کے ہاتھوں ہوگی یا اسلام کے ہاتھوں یا دونوں کے انقلابی

اشتراک سے۔اقبال کی نظم کے بعد کیفی کی نظم اس صورت حال کی نشاندہی کرتی ہے۔265

پیش لفظ کے آخر میں علی سردار جعفری نے بتایا ہے کہ کیفی کی نظم، اقبال کی نظم کا جواب نہیں ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''لیکن اقبال کی نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ اس اعتبار سے بہت زیادہ اہم ہے کہ اقبال کی تاریخی بصیرت نے 1936ء کے آس پاس یہ محسوس کرلیا تھا کہ ایشیائی میں سرمایہ داری ملوکیت اور اشتراکیت کی جنگ میں اسلام کا شریک ہونا ضروری ہے اور آخری بات یہ ہوگی کہ اسلام اور اشتراکیت ایک دوسرے کے مقابل آئیں گے لیکن خود اقبال کی تعلیمات اور افکار میں یہ چیز موجود ہے کہ اشتراکیت کے معاشی نظام کا جواز اسلام کی تعلیمات میں موجود ہے۔دراصل کیفی کی نظم اقبال کی نظم کا جواب نہیں ہے بلکہ ان امکانات کا اظہار ہے جو اس تاریخی دور کے بطن میں پوشیدہ ہیں۔آج عالم اسلام اور اشتراکیت کے درمیان ایک نئی مفاہمت کی ضرورت ہے جو تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔سرمایہ داری ملوکیت کا خاتمہ صرف اشتراکیت کرے گی اور اسلام کی جمہوری اور انسانی روایات اس کا ساتھ دیں گی۔اقبال کی یہ بشارت پوری ہوگی۔

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

سردار جعفری نے پروین شاکر کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پروین کی شاعری کا محور عشق ہے۔اس کی تشبیہیں اور استعارے زیادہ تر فطرت سے لیے گئے ہیں۔دھوپ، سورج، چاند، روشنی، پھول، بادل، پانی، ہوائیں۔انھیں سے مل کر اس کی امیجری کی تعمیر ہوئی ہے لیکن اس کے عشق کے گرد شعور کا ایک خوبصورت ہالہ ہے۔سماجی اور سیاسی احساس کا پرتو ہے۔اسکی شاعری حسن صورت، حسن سیرت، حسن زبان اور حسن بیان سے آراستہ ہے۔اس لیے اس میں دور دور تک کہیں اس عہد کی مردم بیزاری نہیں ہے۔وہ بصیرت ہے جو زندگی کو شائستہ بناتی ہے اور انسانی تہذیب کو وقار بخشتی ہے۔لہجے کی تازگی میں بلا کی کشش ہے۔پروین آہستہ اور مہذب آواز میں پڑھتی ہے اور یہ آواز اس کی شاعری کے لیے ترنم سے زیادہ اثر انگیز ہے۔ہندوستان پاکستانی میں لتا منگیشکر پر بہت سی نظمیں لکھی گئی ہیں۔لیکن پروین شاکر نے اس کو امن کی علامت بنا دیا ہے۔ہند پاک دوستی کا سمبل .....وہ شاعری کے مستقبل کے لیے ایک خوبصورت بشارت ہے۔266

علی سردار جعفری نے رفعت سروش کے غنائیہ ''ساون بھادوں'' پر 7 ستمبر 1980ء کو دیباچہ لکھا:

راگ رنگ کا نیا غنایہ ''ساون بھادوں'' ایک خوشگوار تخلیق ہے جس میں رفعت سروش کی شاعرانہ اور فنی صلاحیت اپنے عروج پر ہیں۔بیان کی دلاویزی، شاعری کی رنگارنگی اور موسیقی کا تنوع مسرت اور انبساط کی کیفیت سے سرشار ہے۔جس طرح بارش کا پہلا چھینٹا مٹی کی سوندھی خوشبو کو بیدار کر دیتا ہے اور ساون کی جھڑی سوکھے کھیتوں کو سبز پیرہن عطا کرتی ہے اسی طرح یہ غنایہ اپنے رنگ اور نغموں کی بارش سے ایسی کیفیت پیدا کر دیتا ہے کہ دلوں میں کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔یہ نغمہ ہندوستان کی صدیوں کی روایت کے تانے بانے سے تیار کیا گیا ہے اور ایک مشترکہ تہذیب کا کارنامہ ہے۔اس وقت ہمارے ملک میں

محبت کی ندیاں سوکھ رہی ہیں اور باہمی رفاقت اور ہمدردی کی لہلہاتی ہوئی کھیتیاں ریگ زاروں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔اس عالم میں ساون بھادوں جیسا غنائیہ باران رحمت سے کم نہیں۔اس کا ہر بول، ہر سر، ہر گیت، ہر شعر یہ یاد دلاتا ہے کہ ہم ایک اور مشترکہ تہذیب کے وارث ہیں۔ہمارا آرٹ اور ادب کسی ایک فرقے کی جائیداد نہیں ہے اور جب تک ہم مل کر زندہ رہنے کا ہنر نہیں سیکھیں گے اس وقت تک ہمارے دل سرسبز و شاداب نہیں ہوں گے۔میری دلی تمنا ہے کہ راگ رنگ کا یہ غنائیہ ہمارے دیس کے کونے کونے میں جا کر اپنے ساون بھادوں، کی بارش کرے اور اپنے سیلاب میں نفرت اور عداوت کے خس و خاشاک کو بہا لے جائے۔267

سردار جعفری نے اختر سعید خان کی غزلوں کے مجموعہ ''نگاہ'' کا دیباچہ جون 1984ء کو لکھا۔علی سردار جعفری نے اختر سعید خان کی غزلوں کے اشعار کے آہنگ کو بلند آہنگ قرار دیا۔

ان کی شاعری کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

''اختر سعید خان کی شاعری میں بڑا تنوع ہے۔اس میں پرانی زمینیں بھی ہیں اور نئی زمینیں بھی۔اجتماعی غموں کے ساتھ ساتھ شاعری کے ذاتی غم بھی ہیں۔جمالیاتی کیفیات میں بڑی عاشقانہ معصومیت اور سادگی ہے''۔268

پاکستان کی نوعمر شاعرہ عشرت آفریں کے پہلے مجموعے ''کنج پیلے پھولوں کا'' کا دیباچہ سردار جعفری نے 15 اگست 1984ء کو لکھا۔اس شاعرہ سے سردار جعفری کی ملاقات 5 مئی 1984ء کو کراچی میں ہوئی۔یہ دیباچہ سردار کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز میں شامل کیا گیا ہے۔سردار جعفری نے لکھا ہے کہ اردو شاعری میں صرف بہار کا سرخ رنگ ہی نہیں ہے بلکہ زرد اور پیلے پھولوں کی بھی ایک روایت ہے۔سردار جعفری نے پیلے رنگ کی علامتوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ پیلا رنگ مسرت شادمانی ہے جیسے ہندو دلہن کے ہاتھ ہلدی سے پیلے کے جاتے ہیں، پیلا رنگ خوف کا بھی مظہر ہے۔ہجر و غم کی بھی یہ علامت ہے جیسے پریتم کی راہ تکتے تکتے گوری پیلی پڑ جاتی ہے۔خزاں کے رنگ کی حیثیت سے یہ تجدید بہار کا رنگ ہے۔ عشرت آفریں کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

1۔اس کا طبقاتی شعور بیدار ہوتا ہے اور اب اس کو کھیتوں میں کپاس چنتی ہوئی اور کرگھوں یا کارخانوں میں لباس بنتی ہوئی لڑکیاں فن کارہ کے روپ میں نظر آتی ہیں۔(نذرانہ) اور وہ نہایت سادگی سے محنت کی عظمت کا اعتراف کرتی ہے۔

2۔اس کی شاعری کی نادر شاعرانہ پیکر تشبیہوں استعارے کو بھی جو ترقی پسند عہد اور شاعری کا نہایت پامال موضوع بن چکا ہے۔تازہ اور اثر آفریں استعاروں میں شعر کا پیکر عطا کرتا ہے۔

3۔عشرت آفریں کی زبان ساقی، مینا، ساغر سے بے نیاز ہے۔اپنے موضوعات کے اعتبار سے اس میں جنگلی پھولوں کی سی تازگی ہے۔ابھی اس کی شاعری صرف محسوسات کی سطح پر ہے، تخیل اور فکر کی بلندی تک نہیں گئی ہے۔جب وہاں پہنچے گی تو اس میں نئی توانائی اور نئی دھار کی ضرورت ہوگی۔

4۔اس شاعری میں کوئی انفعالی کیفیت نہیں ہے۔زندگی کو اس کے تمام تضادوں کے ساتھ قبول کرنے اور زندگی سے محبت کرنے کا جذبہ ہے۔زندگی کی سختیوں سے آنکھ ملانے کا حوصلہ ہے۔اس کی تلوار اس کی سپر اس کی انا ہے۔جہاں تک میری

نگاہ ہے کسی شاعر نے اس طرح اپنی انا کا اظہار برملا اور فخریہ نہیں کیا ہے۔ یہ انا اپنی شاعری کا رشتہ روشن فکر کی روایت سے منقطع نہیں کرتی۔ شعور اور احساس کو ظلمت پسندی اور عقل دشمنی کے غاروں میں بند نہیں کرتی۔ اسی لیے انانیت میں تبدیل نہیں ہوتی جو ایک قبیح چیز ہے۔ عشرت آفریں کی انا اپنے آباء و اجداد کی انا سے مختلف ہے جس کے مدفن اجڑے باغات اور ٹوٹے کھنڈرات ہیں۔ یہ ایک باغیانہ رویہ ہے اور حفظ ذات کا حربہ، ورنہ اس انا کی کوئی فلسفیانہ سطح نہیں ہے لیکن اس کا رشتہ اقبال کی خودی سے ملتا ہے۔ اقبال کے ساتھ ساتھ ناظم حکمت اور پابلو نرودا اور اس عہد کے دوسرے مجاہد شعرا بھی اس کے شعور کا حصہ ہیں۔

5۔ نظم ''زہر'' میں استحصال کے خلاف خاموش احتجاج ہے لیکن بیک وقت دو استحصالی کیفیتیں موجود ہیں۔ ایک محنت کش کا استحصال اور دوسرے عورت کا استحصال، عورت ہمیشہ سے دوہرے مظالم کا شکار رہی ہے۔ سماجی نظام کا جبر اور مرد کا جبر۔

6۔ عشرت آفریں کی سب سے بڑی دولت محبت ہے۔ دھرتی سے محبت، زندگی سے محبت، انسان سے محبت، اس کی نظم ''میں مطمئن ہوں'' اسی محبت کی داستاں ہے۔

7۔ اردو ادب کی تاریخ میں کسی بڑی شاعرہ کا نام نہیں ملتا۔ گذشتہ پچاس سال میں آٹھ دس نام روشن امکانات کی بشارت لے کر ابھرے ہیں اور انھیں میں ایک نام عشرت آفریں کا ہے۔ 269

سردار جعفری نے قاضی جلیل عباسی کی تصنیف کیا دن تھے، کا پیش لفظ 22 اکتوبر 1984ء کو لکھا۔

اس میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

آپ کو اس کتاب میں وہ گذرا ہوا عہد سانس لیتا ہوا محسوس ہوگا، جلیل کی زندگی کے تجربات کی روشنی میں آپ اس گذرے ہوئے عہد کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھ سکیں گے اور یہ اس کتاب کی اہمیت ہے اور یہی اس کا جواز۔ 270

صنف ''رپورتاژ'' کی افادیت اجاگر کرتے ہوئے سردار جعفری لکھتے ہیں:

'یہ صنف ادب (رپورتاژ) بالکل نئی ہے لیکن بے انتہا اہم ہے۔ یہ صحافت اور افسانے کی درمیانی کڑی ہے اور اس سے ہمارے ادب کو بے انتہا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ رپورتاژ ہمارے مقاصد کے لیے بہت ضروری ہے اس کے ذریعے سے ہم بڑے بڑے کام لے سکتے ہیں۔ اردو میں اب تک جو اچھے رپورتاژ لکھے گئے ہیں ان میں خاص طور سے قابل ذکر سجاد ظہیر کا رپورتاژ ''یادیں'' اور کرشن چندر کا ''پودے'' ہے۔ 271

ڈاکٹر اس ام زیڈ کوہر نے مذکورہ بالا اقتباس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

سردار جعفری کا یہ خیال کہ رپورتاژ سے ہم بڑے بڑے کام لے سکتے ہیں اور یہ ہمارے مقاصد کی تکمیل کا ایک اہم وسیلہ بن سکتا ہے، اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ترقی پسند ادیبوں نے رپورتاژ کے صنفی ارتقا پر بطور خاص دھیان دیا۔ اس کے لیے ان کے پاس معقول اور واضح سبب بھی تھا۔ ترقی پسند ادبی تحریک کی ترویج و اشاعت کے سلسلہ میں رپورتاژ مفید و موثر ثابت ہوا۔ 272

قاضی جلیل عباسی کی تصنیف کیا دن تھے۔ (اشاعت دسمبر 1985) کا پیش لفظ سردار جعفری نے لکھا ہے۔

اس میں انھوں نے جلیل عباسی اور کتاب کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا:

وہ (قاضی جلیل عباسی) ہندوستان کی تحریک آزادی کے ایک نڈر اور بے باک سپاہی حوصلہ منداور پر جوش۔ان کا جوش و خروش جب جلال پر ہوتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت ان کو روک نہیں سکتی۔جلیل نے جس زمانے کی کہانی لکھی ہے وہ ہماری تاریخ کا سب سے زیادہ پر جوش اور طوفانی دور تھا۔تحریک آزادی اپنے شباب پر تھی اور ہم چھوٹے چھوٹے معمولی طالب علم مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسی تاریخ ساز شخصیتوں کے نابالغ ہم عصر تھے لیکن ہم عصر تھے اور ان کے قریب جاسکتے تھے اور ان سے بات کرسکتے تھے۔آپ کو اس کتاب میں وہ گزرا ہوا عہد سانس لیتا ہوا محسوس ہوگا۔جلیل کی زندگی کے تجربات کی روشنی میں آپ اس گذرے ہوئے عہد کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھ سکیں گے اور یہی اس کتاب کی اہمیت ہے اور یہی اس کا جواز۔273

شکیل الرحمٰن کی کتاب "مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات" کی ستائش کرتے ہوئے علی سردار جعفری رقمطراز ہیں:

"شکیل الرحمٰن کی تخلیق اور تحریر کی رفتار میرے پڑھنے کی رفتار سے زیادہ ہے۔اتفاق سے آج کل ان کی پرانی کتاب "مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات زیر مطالعہ ہے۔ان کا قلم نہایت خوبصورت الفاظ کا ایک آبشار نغمہ ہے۔جب دس پندرہ صفحات پڑھ کر بالکل شرابور ہو جاتا ہوں تو کتاب بند کر کے گوہر ہائے معانی کی تلاش شروع کرتا ہوں۔چند موتی ہاتھ آتے ہیں انھیں سنبھال کر رکھ لیتا ہوں۔یہ 1986 کی تصنیف ہے۔میرا خیال تھا کہ لندن میں منعقد ہونے والے غالب سمینار میں اسی کتاب پر مقالہ پیش کروں لیکن انگریزی میں لکھنا بہت دشوار ہے۔غالب کے شعر اور شکیل الرحمٰن کی نثر کا ترجمہ کرنا آسان کام نہیں۔نہایت اعلی درجے کی تخلیق ہے۔یہ کام شاعری کی طرح تخلیقی ہے جس میں خون جگر صرف ہوا۔"مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات" کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کو جس مقام سے پڑھئے دلکش ہے۔میں اس کو دیوان غالب اور دیوان حافظ کی طرح بھی پڑھتا ہوں۔(1987ء)۔274

مجاز کی نظم "آوارہ" پر سردار جعفری تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"مجاز کی نظم "آوارہ" کو میں اس عہد کی نہیں بلکہ پوری ترقی پسند تحریک کی بڑی نمائندہ نظم سمجھتا ہوں اور یہ بڑی نظم ہے۔ اس کا شمار بڑی شاعری میں ہوتا ہے.....مجاز کے ہاں سہولتِ اظہار کے ساتھ ساتھ ندرتِ اظہار کا بھی استعمال کیا گیا ہے اور اس میں فکر کی ایک نئی نہج ہے۔275

رفیعہ شبنم عابدی کے سات مضامین کا مجموعہ "نظر نظر کے چراغ" پر تبصرہ کرتے ہوئے علی سردار جعفری نے لکھا ہے:

"رفیعہ شبنم کے سات مضامین کا چھوٹا سا مجموعہ ہمارے تنقیدی ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔آج کے زمانے میں اردو کے زیادہ تر نقاد اساتذہ کی صفوں سے آتے ہیں۔دانش گاہوں سے تنقید کا ظہور اس اعتبار سے مبارک ہے لیکن کبھی کبھی اس پر درس و تدریس کی پرچھائیاں سی منڈلاتی نظر آتی ہیں۔رفیعہ شبنم کے مضامین ان پرچھائیوں سے پاک ہیں۔اس مجموعے کا سب سے اچھا اور سب سے طویل مضمون اتفاق سے میری شاعری کی پیکر تراشی پر ہے۔اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اکثر مضامین میں پیکر تراشی کا ذکر آجاتا ہے.....رفیعہ نقاد بھی ہیں اور شاعر بھی۔میں ادب کی محفل میں ان کا خیر مقدم کرتا ہوں۔(10 جولائی 1980)276

بکل اتساہی کے نظم نما گیتوں کی تکنیک کے عنوان سے علی سردار جعفری نے لکھا ہے:

بکل اتساہی میرے ہم وطن خوش کلام شاعر ہیں۔میرے دوست بھی اور میرے چھوٹے بھائی بھی ہیں: ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔خیال کتنا ہی مجرد (abstract) ہو، آدمی جب سوچتا ہے تو لفظوں اور الفاظ کا تعلق آواز کے ساتھ ہوتا ہے میں خود بکل کی طرح شعر نہیں کہہ سکتا۔ہم ترقی پسند ادیب رہے ہیں مگر بکل نے یہ کام ہم سے پہلے کر دیا۔ ہماری صفوں میں ساغر نظامی، حفیظ جالندھری گیت کو مشاعروں میں نظم کہہ کر سناتے رہے مگر یہ جرأت بکل کی ہے کہ انھوں نے مشاعرے میں گیتوں کا رواج تمام مخالفت کے باوجود قائم کیا اور آخر کار سے اردو شاعری میں ایک اہم اور لافانی مقام دلایا ہے۔تمام نظم نما گیتوں کو جن شاعروں نے انتہا سمجھا بکل اتساہی کی وہاں سے ابتداء ہوتی ہے۔بکل اتساہی نے گاؤں کے عوام کی زندگی اور دبی کچلی مظلوم انسانیت کے کرب سے اردو شاعری کو روشناس کرایا ہے۔یہ سب سے بڑا معیاری کام ہے۔آج کے ناقد بھلے ہی بکل اتساہی کو اپنی کج فہمی کی وجہ سے نظر انداز کر دیں مگر مستقبل کی نقد و نظر انہیں خسرو اور نظیر اکبر آبادی کی عوامی روایت کو عظیم علمبردار ماننے پر مجبور ہوگی۔277

سردار جعفری نے دیباچہ ''نگاہ: اختر سعید خان'' جون 1984ء میں لکھا۔

اچھا شعر اور اچھی شاعری کی وضاحت کرتے ہوئے سردار جعفری نے بتایا:

معنی اور مفہوم کے بغیر شعر کچھ بھی نہیں ہے۔لیکن شعر معنی و مفہوم سے کچھ زیادہ بھی ہے اور یہی اچھا شعر ہے۔اس کو بزرگوں نے ''ماورائے سخن بھی ہے اک بات'' کہہ کر واضح کیا ہے۔اس اچھے شعر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ لمحاتی کیفیت سے بلند ہو کر وقت کی قید سے بے نیاز ہو جاتا ہے جسے ہم ہر زمانہ کی سچائی کہیں اور اسی کے ساتھ آج کی سچائی میں ظاہر ہو۔278

بھوپال کے شاعر اختر سعید کی شاعرانہ تربیت میں سارے ہندوستان کے شاعروں کا حصہ ہے جو ان کے والد محترم حامد سعید خان صاحب کے گھر مہمان ہوتے تھے اور اختر کی روح شعروں کے پھولوں سے بھر جاتی تھی۔279

عبدالاحد ساز کے مجموعہ کلام ''خموشی بول اٹھی ہے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

ہمارے عبدالاحد ساز اچھے شاعر ہیں۔جب میں نے پہلی بار انھیں سنا تھا تو یہ توقع ظاہر کی تھی کہ وہ جلد ہی ایک اچھی کتاب اردو شاعری کے پڑھنے والوں کے لیے پیش کر سکیں گے۔آج یہ کتاب ''خموشی بول اٹھی ہے'' ہمارے سامنے ہے۔ساز کے یہاں لطافت ہے، نرمی ہے، جمالیاتی کیف بھی ہے اور تلخ کلامی بھی۔میں نے ساز کی کتاب اس عالم میں پڑھی کہ میں فردوسی پر کام کر رہا تھا اور درمیان میں جستہ جستہ ''خموشی بول اٹھی ہے'' دیکھ لیتا تھا۔لطف کی بات یہ ہے کہ فردوسی کو پڑھتے ہوئے ساز کو پڑھنا مجھے برا نہیں لگا۔280

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے لکھا ہے کہ جب ایک مشاعرے میں راحت اندوری نے اپنا معرکۃ الآرا یہ شعر پڑھا۔

پھر ایک بچے نے لاشوں کے ڈھیر پر چڑھ کر
یہ کہہ دیا کہ ابھی خاندان باقی ہے

تو علی سردار جعفری کی نگاہوں میں چمک پیدا ہوئی۔انھوں نے سراپا داد بن کر میری طرف دیکھا اور کاغذ کے ایک ٹکڑے پر یہ شعر نوٹ کرلیا۔281

جوشؔ نے کیا دیا، اس سلسلہ میں سردار جعفری نے بتایا ہے:

جوشؔ کی دین بہت بڑی ہے انھوں نے جمالیاتی اعتبار سے اردو کو بہت کچھ دیا ہے۔انھوں نے گری پڑی چیزوں کو بھی اس طرح شاعری میں جگہ دی ہے کہ حسن پیدا ہوگیا ہے اور یہ ان کا فنکارانہ اعجاز ہے۔ان کے ہاں کیسے کیسے لفظ آتے ہیں، کیسے استعارے اور علامتیں ہیں۔ان کے ہاں دونے کے پتے، جامن، اور جوہی کی کلیوں کا ذکر ملے گا ورنہ اس سے پہلے تو گل و لالہ ہی سے کام چل رہا تھا اور یہ نئے الفاظ، استعارے اور علامتیں جو آئی ہیں وہ جوش کے واسطے سے آئی ہیں اور انہیں جوش کی دین سمجھنا چاہئے۔ہم ترقی پسندوں نے شعوری طور پر جوش سے اکتساب کیا ہے اور اس کا اعتراف ضروری ہے۔جوش میرا جی سے پہلے تھے۔اختر الایمان سے پہلے تھے اور ان کے ہاں جوش کے اثرات موجود ہیں۔282

شکیل الرحمٰن کی تصنیف ''مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات'' عصمت پبلی کیشنز نے شائع کیا تھا۔

اس کتاب کو سردار جعفری نے بہت پسند کیا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

نہایت اعلیٰ درجے کی تخلیق ہے۔یہ کام شاعری کی طرح تخلیقی ہے جس میں خون جگر صرف ہوا ہے۔''مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات'' کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کو جس مقام سے پڑھئے، دلکش ہے۔میں اس کو دیوان غالب اور دیوان حافظ کی طرح بھی پڑھتا ہوں۔(بمبئی 3 جولائی 1987ء)283

ہندی کے کملیشور کے بارے میں سردار جعفری نے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے:

کملیشور ہندی زبان کے اعلیٰ درجے کے افسانہ نگار اور ادیب ہیں۔وہ روشن خیال ہیں، ترقی پسند ہیں اور فنی اعتبار سے ہندوستان کو ادیبوں کی صف اول میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ان کی تخلیقات اس قابل ہیں کہ ان کا ہندوستان کی ہر زبان میں ترجمہ کیا جائے۔اسی طرح دوسری زبانوں کے سربرآوردہ ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات ہندی اور اردو میں آنی چاہئیں۔ 284

جعفری صاحب نے ہندوستان کے ہر شہر میں اسٹیشنوں، شاہراہوں وغیرہ کو وہاں کے مشہور شاعروں کے نام سے منسوب کرنے کی تجویز پیش کی جنھوں نے ملک کے ثقافتی ورثے کی تعمیر میں اہم رول ادا کیا وہ لکھتے ہیں: ''ہندوستان کے ہر شہر سے کسی نہ کسی بڑے شاعر کا تعلق رہا ہے۔اگر مراد آباد کو جگر مراد آبادی پر اور گورکھپور کو فراق گورکھپوری پر ناز ہے تو دہلی کے پاس ایسے لجنڈری شعرا کی پوری فہرست ہے۔جنھوں نے ہندوستان کے ثقافتی ورثے کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا ہے۔دہلی کی اندرون و بیرون ملک شہرت یہاں کے بادشاہوں کی وجہ سے نہیں بلکہ غالب، میر، مومن اور ذوق سے ہے۔

محبت کاظمی نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

جعفری صاحب کی تجویز یہ ہے کہ تقریباً ایسے سو شہر جن سے معروف شعرا کے نام وابستہ ہیں، منتخب کر کے ان ریلوے

اسٹیشنوں، ایرپورٹوں، شاہراہوں اور چوراہوں کو ان شاعروں کے نام سے منسوب کیا جائے اور ان کے اشعار بھی عوامی مقبولیت کی غرض سے ایسی جگہوں پر درج کیے جائیں۔انھوں نے جگر مرادآبادی کے مشہور شعر کے حوالے سے کہا۔

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

جگر کے اس مشہور شعر مین آج کے پرآشوب دور میں ہر فرد کی شخصی ذمے داریوں کی بہترین نمائندگی ہے تو پھر یہ شعر مراد آباد کے ریلوے اسٹیشن پر جلی حروف میں کیوں نہ لکھا جائے؟

مقصد بالکل سادہ ہے: تیزی سے زوال آمادہ ماضی کی درخشندگی کے تحفظ کے ساتھ ساتھ وہ آئندہ نسلوں کو اس کی جڑوں سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ان کے خیال میں ماضی کی تردید ممکن نہیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم فوری طور پر اس کی بازیافت کریں۔285

مکاتیب:

ڈاکٹر محمد نسیم فریس نے سردار جعفری کے مکتوبات کے بارے میں لکھا:

سردار جعفری کے مکتوبات مختلف شخصیتوں پر ان کے Remarks مختلف سیاسی واقعات اور ادبی صورت حال پر ان کے comments مختلف موضوعات پر ان کے افکار اور مختلف مسائل پر ان کے موقف کا آئنہ ہیں اور ان میں جعفری صاحب کے وسیع علم و مطالعہ کے علاوہ عمیق غور و فکر اور برسوں کا تجربہ و مشاہدہ شامل ہے۔286

سردار جعفری کے دستیاب مکاتیب سے ایسے چند مکاتیب کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ملاحظہ کیجیے:

سلطانہ جعفری کے نام اپنے ایک خط مورخہ 6 اکتوبر 1949ء میں موضوع اور ہیت کے تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا:

''یونانی آرٹ کے موضوع (content) اور ہیئت (form) کو الگ الگ کر دیا گیا ہے حالاں کہ content اور form الگ الگ نہیں کیے جاسکتے۔form بغیر content کے اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا اور content بغیر form کے ظاہر نہیں ہوسکتا۔بغیر لفظوں کے ہم سوچ نہیں سکتے اور معنی کے بغیر کوئی لفظ زبان سے ادا نہیں ہوسکتا۔پھر وہ جانور کی آواز ہوگا، انسان کی زبان سے نکلا ہوا لفظ نہیں ہوگا۔287

سلطانہ جعفری کے نام اپنے مکتوب مورخہ 13 مارچ 1950ء میں سردار جعفری نے آزاد نظم کی تکنیک کی وضاحت کی۔

وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے بہت سے دوستوں نے ابھی آزاد نظم کی تکنیک کو سمجھا نہیں ہے۔مشق اور تجربے سے یہ تکنیک سمجھ میں آجائے گی۔آزاد نظم سے قافیہ اور ردیف نکل جاتا ہے۔مصرعے بھی نپے تلے برابر کے مصرعے نہیں رہ جاتے، شعر کی جگہ بند لے لیتا

ہے۔اس لیے نئے آہنگ اور ترنم، نئی تال اور نئے سر کی ضرورت ہے جو قافیہ کی جھنکار کا بدل بن سکے۔بند (stanza) چوں کہ شعر سے بہت زیادہ بڑا ہوتا ہے اس لیے معنوی وسعت اور تخیل کے پھیلاؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔معنوی وسعت اور تخئیل کے اس پھیلاؤ کو شاعر بہت اچھی اور بھرپور امیجری (imagery) کے بغیر نہیں سنبھال سکتا۔ورنہ پورا بند غارت ہو جائے گا۔اس طرح آزاد نظم کا ہر بند ایک مکمل تصویر ہوتا ہے (اور آزاد نظم ان تصویروں کا البم) جس کے خط و خال ہر مصرعے کے ساتھ زیادہ واضح اور روشن ہوتے جاتے ہیں اور آخری مصرعہ اسے مکمل کر کے climax پر پہنچا دیتا ہے۔پابند نظم کی طرح ایک مصرعے اور دوسرے مصرعے کی علیحدگی آزاد نظم برداشت نہیں کر سکتی۔ایک مصرعے اور دوسرے مصرعے کو زنجیر کی کڑیوں کی طرح جڑا ہونا چاہئے۔جہاں پر کڑی الگ ہونے کی بعد بھی دوسرے کڑی سے الگ نہیں ہوتی۔288

سلطانہ جعفری کے نام اپنے ایک خط مورخہ 17 مئی 1950ء میں

سردار جعفری نے رومانیت کے بارے میں وضاحت کی:

رومانیت کے بارے میں میرا جو نظریہ ہے وہ بھی ٹھیک سے نہیں سمجھا گیا ہے۔اسی وجہ سے یہ غلطی ہو رہی ہے کہ میرے سر یہ الزام آ گیا ہے کہ میں پچھلے پندرہ سلا کی ساری شاعری کو رومانی شاعری کہہ کر نظر انداز کر رہا ہوں۔میں رومانیت کے خلاف نہیں ہوں۔حقیقت یہ ہے کہ بغیر رومانیت کے شاعری ممکن نہیں۔خود میری شاعری میں بہت کافی رومانیت ہے۔میں دراصل obscore romantism کے خلاف ہوں۔289

علی سردار جعفری نے 16 اگست 1956 کو ماہنامہ صبا کو ایک خط لکھا جو سبا کے دسمبر 1956ء کے شمارے میں بازگشت کے عنوان سے شائع ہوا۔اس میں سردار جعفری نے ادبی مباحث کی رپورٹ لکھنے میں احتیاط کی ضرورت کو اجاگر کیا ہے اور غلطیوں کی صورت میں مفہوم کے مسخ ہونے اور نئی شکایتوں کے دفتر کھل جانے کے خدشہ کو ظاہر کیا گیا ہے۔خط کا متن اہمیت کا حامل ہے۔

ملاحظہ کیجیے:

''صبا کا تازہ شمارہ (جون، جولائی 1956) ملا۔شکریہ۔جہاں تک مجھے یاد ہے طے ہوا تھا کہ انجمن کی تنظیم کے مباحثے کی رپورٹ لکھتے وقت احتیاط سے کام لیا جائے گا اور بحث کے نکات پیش کیے جائیں گے۔ناموں کا حوالہ نہیں دیا جائے گا کیوں کہ رپورٹ لکھتے وقت بعض اوقات اصل فقرے یاد نہیں رہتے اور ان سے ملتے جلتے فرے ایک لفظ کی تبدیلی کی وجہ سے کچھ کے کچھ بن جاتے ہیں لیکن آپ نے جو رپورٹ شائع کی ہے اس میں یہ احتیاط نہیں برتی گئی۔میں صرف ایک مثال دوں گا۔میں نے اپنی تقریر میں یہ کہا تھا کہ ادیبوں کی شہرت اور مقبولتی میں بعض اوقات غیر ادبی عناصر ہی کام کرتے ہیں۔مثلاً سجاد ظہیر، مخدوم اور فیض کی شہرت اور مقبولیت میں ان کی ادبی کاوشوں کے ساتھ ان کے سیاسی مقام کو بھی دخل ہے۔آج سے پچاس یا سو برس بعد ان کے متعلق جو رائے قائم کی جائے گی وہ صرف اس کی ادبی تخلیقات پر مبنی ہوگی آج یہ ممکن نہیں ہے۔اس لیے نئے ادیبوں کو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ان کے ساتھ نا انصافی ہو رہی ہے۔وغیرہ لیکن آپ کی رپورٹ میں ''غیر ادبی عناصر'' کے بجائے لکھا ہے۔جھوٹے عناصر، جس سے سارا مفہوم مسخ ہو جاتا ہے۔اس قسم کی اور غلطیاں بھی ہیں۔ادبی مباحث کی

رپورٹ .....اگر شارٹ ہینڈ میں نہ لکھی گی ہواور چھپانے سے پہلے بولنے والوں سے اس کی تصدیق نہ کرالی گئی ہوتو بعض اوقات اس سے نقصان پہنچ جاتا ہےاوراصل بحث سے ہٹ کرنئی شکایتیں شروع ہوجاتی ہیں۔آپ آئندہ شمارے میں یہ بات صاف کردیں تو بہتر ہے۔290

پروفیسر گیان چند جین جب جموں یونیورسٹی میں صدر شعبہ تھےتو انھوں نے سردار جعفری کودوتوسیعی لیکچر کے لیے مدعو کیا تھا۔

جین صاحب کے بعض استفسارات کا جواب دیتے ہوئے ایک خط مورخہ 10دسمبر 1969ء میں لکھا ہے:

''توسیعی لیکچروں کے لیے.....اپنی شاعری کے بعض پہلو بھی لے سکتا ہون جن کی طرف ہمارے نقاداب تک توجہ نہیں کرسکتے ہیں مثلاً محنت کا عمل اور محنت کی عظمت۔اس کے لیے مجھے نئے امیج تراشنے پڑے ہیں۔مثلاً ہاتھوں کا ترانہ''میں۔

اعجاز ہے یہ ان ہاتھوں کا ریشم کو چھوئیں تو آنچل ہے
پتھر کو چھوئیں تو بت کردیں کالک کو چھوئیں تو کاجل ہے
مٹی کو چھوئیں تو سونا ہے چاندی کو چھوئیں تو پایل ہے
سمٹی ہوئی گنا کی لہریں، بہتے ہوئے بکلی کے دھارے
دھرتی کے مقدر کے مالک، محنت کے افق کے سیارے
یہ چارہ گران درد جہاں صدیوں سے مگر خود بے چارے

دوسرا پہلو میری شاعری میں وقت کا تصور ہے جو اقبال کے تصور وقت سے مختلف ہے۔مختلف کا عمل بھی میرے تصور وقت میں شامل ہے۔وقت کی حرکت میں مادے کی جنبش وحرکت شامل ہےاور خود انسان ایک مادی طاقت ہے لیکن باشعور۔یہ مارکسی نقطہ نگاہ ہے اس کے ابتدائی نقوش ہندو تصور وقت میں ملتے ہین۔اگر آپ ایک خواب اور، میں میری نظم ''میرا سفر'' دیکھیں نظم 'برہنہ فقیر'' یا ''شعور'' پر نظر ڈالیں تو میرے تصور وقت کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔مٹی دنیا کو سلام، میں میں نے پہلی بار اس تصور کو ذرا پھیلا کر پیش کیا تھا۔291

ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے لکھا ہے ''علی سردار جعفری کا شمار ترقی پسند تحریک کے نظریہ سازوں اور اساس گزاروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے اس تحریک کے اصولوں کے مطابق شاعری بھی کی اور تنقید بھی لکھی۔اپنی تنقیدی تحریروں میں انھوں نے ترقی پسند تحریک پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دیا اور پوری شدومد کے ساتھ ترقی پسند تحریک کی مدافعت کی۔وہ ترقی کے رنگ مین اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ مکتوبات میں بھی وہ حسب موقع اس تحریک کے وکیل دفاع کا رول انجام دیتے نظر اتے ہیں۔

ایک مرتبہ مظہر امام نے جعفری صاحب کو اپنے خط میں لکھا تھا کہ:

''میرے نزدیک ترقی پسند چند مخصوص سکہ بند موضوعات میں محصور ہونے کا نام نہیں۔

مظہر امام کے اشارے کی تہہ تک پہنچتے ہوئے جعفری صاحب انھیں جواب دیتے ہیں:

''مجھے آپ کے اس رویے سے بالکل اختلاف نہیں، لیکن اگر اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ ترقی پسند شعراء چند مخصوص سکہ بند موضوعات میں محصور ہیں تو مجھے شدید اختلاف ہے۔ کیا آپ کا خیال ہے مجاز، فیض، مخدوم، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی کی شاعری سکہ بند تصورات میں محصور ہے؟''

آگے وہ جدیدیت کے علمبرداروں کو ہدف تعریض بناتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''ذرا فرصت ملے تو میں اس پر ذرا تفصیل سے بات کروں گا اور ان سکہ بند تصورات کی فہرست پیش کروں گا جو ہر جدیدیت کے حامی شاعر کے یہاں دوہرائے جارہے ہیں اور بری اور کمزور شاعری کی شکل میں دوہرائے جارہے ہیں''۔292

مکتوب سردار جعفری بنام راج بہادر گوڑ مورخہ 9 جنوری 1975 میں جعفری صاحب نے اقبال اور سوامی وویکانند کی شخصیتوں اور ان کے افکار کا تقابل کیا ہے:

''سوامی وویکانند اور اقبال میں عجیب وغریب مماثلت ہے۔ وہ محترم (یعنی وویکانند) آزادی کے پروانے مگر ہندو احیاء پرست (hindu revivalist) تھے۔ اقبال مسلم احیاء پرست تھے۔ یہ احیاء پرستی انیسویں صدی میں راجہ رام موہن رائے میں بھی مل جائے گی اور سرسید میں بھی۔ پہلے کلکتہ میں ہندو کالج بنا پھر علی گڑھ میں مسلم اورینٹل کالج۔ پہلے بنارس میں ہندو یونیورسٹی قائم ہوئی پھر علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی اور بنارس کی یونیورسٹی کے ساتھ ہندو کے لفظ پر ٹیگور نے اصرار کیا لیکن مشکل یہ ہے کہ ہندو احیاء پرستی نیشنلزم کے لبادے میں چھپ جاتی ہے اور مسلم احیاء پرستی نمایاں ہوجاتی ہے۔ اقبال مسلم بیداری کا شاعر ہے۔ اشتراکیت کے معاشی نظام میں اسلامی رومانیت کی آمیزش کے ساتھ۔ سوامی وویکانند ہندو بیداری کے نقیب ہیں۔ ہندو روحانیت کی آمیزش کے ساتھ ہندوستان کی بیداری کے نقیب ہیں۔ حب الوطنی اور ماضی پرستی کے ساتھ جس میں مسلمان کی سمائی نہیں ہے اور عالمگیر انسانیت کی بیداری کے نقیب ہیں۔ ہندو روحانیت کی آمیزش کے ساتھ لیکن اشتراکیت یا معاشی نظام کا کوئی انقلابی پہلو ان کے یہاں نہیں ہے۔ لیکن ان کی یادگار آزاد ہندوستان میں بڑے شاندار طریقے سے قائم کی گئی ہے اور اقبال کو گزشتہ ستائیس سال سے راندۂ درگاہ بنا کر رکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس نے لکھا ہے:

مندرجہ بالا مکتوب میں سردار جعفری کا یہ تجزیہ کہ اکثریتی فرقہ پرستی نیشنلزم کے لبادے میں چھپ جاتی ہے اور اقلیتی احیاء پرستی نمایاں ہوجاتی ہے کس قدر صائب اور درست ہے! جعفری صاحب نے یہ رائے یوں ہی قائم نہیں کی ہے۔ اس کے پیچھے موجودہ تاریخی صورت حال اور دونوں فرقوں کی نفسیات سے گہری آگہی کارفرما ہے۔ 293

سردار جعفری جدیدیت اور جدیدیت سے متاثر فن کاروں سے ناراض رہتے تھے۔ وہ اپنی ناراضگی کا اظہار کھلے طور پر کردیا کرتے۔ اپنے مکتوب بنام پروفیسر سید محمد عقیل رضوی مورخہ 10 نومبر 1979ء کو جدید افسانہ نگاروں کے متعلق اپنی رائے سے مطلع کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''پنجرے کا آدمی (رتن سنگھ) چوراہے پر ٹنگا ہوا آدمی (انور قمر) سواری (خالدہ اصغر) دو بھیگے ہوئے لوگ (اقبال مجید) اور کالے ناگ کے پجاری (سلام بن رزاق) میرے نزدیک خراب افسانے ہیں۔ یہ جدیدیت کے اس نقطہ نگاہ کی ترجمانی

کرتے ہیں کہ انسان ازلی اورابدی طور پر بے بس ہے۔ظالم اور مظلوم کافرق نمایاں کرنا ترقی پسندی اور پروپگنڈہ ہے اور جدید افسانہ اس سے بے نیاز ہے۔زبان اور بیان کے اعتبار سے بھی یہ افسانے کمزور ہیں۔جہاں تک سمبالک افسانہ نگاری کا تعلق ہے اس کی بہترین مثالیں ہمارے انتخاب میں شامل ہیں جیسے کشتی (انتظار حسین) کونپل (انور سجاد) اور بجوکا (سریندر پرکاش) اس بات کی ابتداء کہ ظالم اور مظلوم کا فرق ضروری نہیں ہے حسن عسکری نے پاکستان بننے کے بعد کی تھی اور انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ قرآن کے اعتبار سے زمانہ ظالم اور جاہل ہے۔اس بیان کو میں قرآن کی غلط تاویل سمجھتا ہوں۔رتن سنگھ، انور قمر، خالدہ اصغر، اقبال مجید اور سلام بن رزاق نے جس ذہنیت کا اظہار ان افسانوں میں کیا ہے۔اس کی تشکیل 1930 کے بعد کالنگ ووڈ نے اپنی کتاب the principle of Art میں کی تھی۔جن افسانوں کا میں نے اوپر نام لیا ہے وہ اسی قسم کی ذہنیت کے ترجمان ہیں لیکن ن کے مصنف باشعور رجعت پرست نہیں ہیں وہ سب کے سب جدیدیت کے پروپگنڈے کا شکار ہیں۔فی الحال ان کو ترقی پسند ادب نمبر میں شامل کرنا مناسب نہیں ہے۔

ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے لکھا لطف یہ ہے کہ جدیدیت سے اس ابا اور جدیدیت پسندوں سے اس انکار کے باوجود سوائے خالدہ اصغر کے مذکورہ بالا تمام افسانہ نگاروں کے افسانے جعفری صاحب نے گفتگو کے ترقی پسند ادب نمبر میں شامل کیے ہیں۔

294

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے سردار جعفری کے نام اپنے خط میں فیض کی نظم ''آج بازار میں پابجولاں چلو'' کو رثائی ادب میں شامل کیا تھا۔

سردار جعفری نے فیض کو اپنے خط مورخہ 3 مئی 1991 میں لکھا:

''آپ نے فیض کی نظم ''آج بازار میں پابجولاں چلو'' کا ذکر کیا ہے۔میرے نزدیک وہ جدید مرثیہ نہیں ہے بلکہ مرثیہ ایک سرے سے ہے ہی نہیں۔اس میں مست، رقصاں اور دست افشاں قسم کے الفاظ بھی ہیں۔فیض کے آہنگ میں ان اشعار کا گانا اور گنگنانا ہوا رقص الفاظ نہیں ہے۔تالیاں بجانے کی آواز اچھی نظم ہے۔صرف ایک مصرعہ کھٹکتا ہے۔

دست ِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے
یہ غالب کے مصرعے کی نئی تشکیل ہے
مرنے کی دل اب اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایان دست و بازو سے قاتل نہیں رہا

غالب الفاظ کا بہتر مزاج داں ہے اس لیے شایان کا لفظ بغیر اضافت کے استعمال نہیں کیا ہے۔شایان دست و بازوے قاتل، کا ایک اپنا حسن ہے۔ 295

بقول ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس، اس خط میں اس فقرے، غالب الفاظ کا بہتر مزاج داں ہے کی بلاغت قابل داد ہے۔

سردار جعفری نے اپنے مکتوب مورخہ 23 اپریل 1996 بنام عادل اسیر دہلوی میں عادل اسیر کی کتاب 'بچوں کی رباعیات' پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

آپ کی چھوٹی سی کتاب ''بچوں کی رباعیاں'' ملی۔رباعیات اچھی ہیں۔زبان سادہ ہے لیکن تین رباعیوں کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔صفحہ 6 پر دوسری رباعی میں یہ مصرعہ ہے ؎

بہتر نہیں اسلام سے مذہب کوئی یقیناً مسلمان کے لیے اسلام سے بہتر کوئی مذہب نہیں ہے،لیکن عیسائی اور اہل ہنود اس عقیدے کو کیوں تسلیم کریں گے۔اس مصرعے کو بدل دیجئے تو بہتر ہے اور یہ اسلامی روح کے مطابق ہے ؎

اللہ نے پورا کیا اپنا انعام
قائم ہوا دنیا نظام اسلام

ہر قوم میں بھیجے ہیں پیمبر اس نے (یعنی خدا نے) قرآن نے دنیا کو دیا ہے۔پیغام اب یہ رباعی ہر مذہب کے بچے پڑھ سکتے ہیں۔پوری رباعی قرآن شریف کی آیات کے مطابق ہے پھر بھی سب کے لیے ہے۔اسی طرح صفحہ 7 کی دوسری رباعی کے آخری دو مصرعے بھی نظر ثانی کے محتاج ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ: ؎

اللہ کے حق سے جو رہے گا غافل
ہے انسان کے حق بھی نہ کرے گا پورے

اسے یوں لکھنا بہتر ہوگا۔ ؎

انسان کے حق سے جو رہے گا غافل
اللہ کے حق بھی نہ کرے گا پورے

ہمارے بزرگ صوفیائے کرام کا ارشاد ہیکہ دل کو نہ توڑیے یہ خدا کا مقام ہے یہ حق تعالیٰ اور حق العباد کا مسئلہ ہے۔ آٹھویں صفحے کی دوسری رباعی نشتر رگ جان کی ترکیب خوب صورت ہے لیکن زبان بچوں کے لیے مشکل ہے۔اسے درست کیجئے۔296

علی سردار جعفری نے جان نثار اختر کی شاعری کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

1۔ تمہاری شاعری (جاں نثار اختر کی شاعری) ہمعصر شعراء کی طرح چالیس سالوں کے طوفان سے گزری ہے۔مگر تمہاری آواز کی کھنک آج بھی باقی ہے تو یہ اس کا ثبوت ہے کہ تمہاری شاعری سچی ہے جیسے گنگا اپنی روانی میں ہر طرح کے ندی نالوں کا پانی سمیٹتی جاتی ہے لیکن اپنی پاکیزگی کو برقرار رکھتی ہے اسی طرح تمہاری شاعری نے ہر قسم کی نظریاتی اور غیر نظریاتی آلائشوں اور لطافتوں دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے اور اس کے بعد بھی پاکیزہ ہے۔یہ بہت بڑی بات ہے۔وہ شاعر جن کے پیش نظر کوئی نصب العین ہوتا ہے وہ ان طوفانوں سے گزرنے پر مجبور ہیں۔

2۔مجموعی طور سے تم نے اور میں نے ترقی پسند تحریک کے نظریہ ادب کو قبول کیا اور اپنی شاعری کو تحریک آزادی کے ایک ہتھیار کی طرح استعمال کیا۔اس کے بعد بھی داخلی طور سے میرے اور تمہارے نظریۂ شعر میں اختلاف مل جائے گا۔یہ اختلاف اس مزاج کی دین ہے جو ایک شاعر کو دوسرے شاعر سے الگ کرتا ہے۔تمہارے نظریۂ ادب میں عاشقانہ شاعری کا بھی ایک

بلند مقام ہے اور نظریاتی شاعری کا بھی، جس نے تمہاری شاعری کو شعلوں کی آغوش میں کھلے ہوئے پھلوں کی طرح بنا دیا ہے۔ اس میں لطافت بھی ہے اور حرارت بھی اور یہ امتزاج فن کو بلند تر سطح پر لے جاتا ہے۔تم نے ظلم اور غلامی کے خلاف احتجاج کیا اور انسان کی عظمت کی سربلندی کے لیے قربانیاں دیں۔اسکی آنچ تمہارے شعر میں ہے.....تم نے اپنی شاعری کو جس مقصد کے لیے نذر کیا اس کی تپش تم سے ایسے اشعار بھی کہلواتی رہی جن میں زمانے کے درد و غم کا مداوا تلاش کرنے کی کوشش ہے۔اس کی بڑی حسین مثال تمہاری نظم ''ایک زخم تمنا اور سہی ہے.....''ایک خاک دل، خاموش آواز، ان نظموں میں زندگی کا مثبت تصور ہے جو غم کو غم تو سمجھتا ہے لیکن دنیا کے مسائل سے چشم پوشی نہیں سکھاتا۔آخری لمحہ یہ ایسی نظم ہے کہ جس پر کوئی زبان ناز کر سکتی ہے۔297

شاعری کا ہمہ گیر نظریہ نہیں ہوتا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے علی سردار جعفری نے لکھا ہے،، میں برسوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاعری کا کوئی ایسا ہمہ گیر نظریہ نہیں ہے جو ہر طرح کی ترجمانی کر سکے مثلاً کارل مارکس نے لکھا 'ادیب اپنی تخلیق کو (کسی مقصد کا) ذریعہ ہرگز نہیں سمجھتا۔اس کی تخلیق بجائے خود (آخری) مقصد ہے''۔298

سردار جعفری نے اپنے مکاتب میں بعض ادیبوں اور موضوعات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

ذیل میں چند مثالیں پیش ہیں۔

1۔جوش صاحب توجہ کے مستحق ہیں۔ان کی عظمت سے انکار کر کے ترقی پسند ادب اور تحریک کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔

299

2۔ سجاد ظہیر کی خدمات یادگار اور بے مثال ہیں۔وہ ہمارے لیڈر رہتے اور بہت اچھے انسان اور دوست۔انھوں نے کئی اصناف میں بڑے کامیاب تجربے کیے۔تحریک کے لیے جو انھوں نے کیا اس کو سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔300

3۔غزل: اردو کا نظام شاعری غزل کا پروردہ ہے۔اس لیے شاعری کے نئے مزاج سے نا آشنائی عام ہے۔میں غزل کا عاشق ہوں لیکن غزل زدہ ہونے کو نیک فال نہیں سمجھتا''301

خطبات و تقاریر:

سردار جعفری کی تنقید کے سلسلہ میں ان کے خطبات اور تقاریر بھی اہم ذرائع ہیں۔چند دستیاب خطبات و تقاریر میں سردار جعفری کی تنقید پیش کی جا رہی ہے۔

ملاحظہ کیجیے:

ترقی پسند تحریک کی نصف صدی:

ترقی پسند تحریک کی نصف صدی دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی جانب سے منعقدہ نظام خطبات کے لیے لکھے گئے مقالوں پر مشتمل ہے۔اسے سردار جعفری نے اکتوبر 1984 میں پیش کیا تھا اور جنوری 1985ء میں نظر ثانی کے بعد اشاعت کے لیے از سر نو تیار کیا۔شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی نے اسے پہلی بار 1987 میں شائع کیا تھا۔اس کتاب میں دو خطبے شامل ہیں۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کا استقبالیہ۔ پروفیسر آباد احمد کے کلمات صدر، سردار جعفری کا بایو ڈاٹا اور علی سردار جعفری کا تحریر کردہ حرف آغاز میں انھوں نے خطبوں کے بارے میں لکھا ہے:

دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو نے مجھ سے نظام خطابت کی فرمائش کر کے میری عزت افزائی کی۔ میرے پاس فیض احمد فیض اور سبط حسن کے دو انٹرویو تھے۔ ان کے اہم اقتباسات دوسرے خطبے میں حواشی کے طور پر شامل کر لئے گئے ہیں۔

سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک کے وجود میں آنے کے قومی اور بین الاقوامی اسباب پر توجہ مرکوز کی گئی۔ مجاز کی شاعری کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ ترقی پسند تحریک کی مخالفت کا بھی ایک خاکہ کھینچا گیا۔

سردار جعفر نے ترقی پسند تحریک، تنظیم اور تخلیق کے باہمی رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

ترقی پسند تحریک بیسویں صدی کے انسان کے بیدار ضمیر کی صدائے بازگشت ہے۔

تنظیم تحریک کی کامیابی کے لیے آسانیاں فراہم کرتی ہے اور تخلیق تحریک کا حاصل ہے کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ تخلیق اور تھریک ساتھ ساتھ چلتی ہے اور تنظیم کے بغیر بھی کامیاب ہوتی ہیں۔ البتہ تنظیم بہتر کامیابیوں کی ضمانت فراہم کر سکتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ادبی اور فکری تحریکوں میں تنظیم وہ کردار ادا نہیں کرتی جو سیاسی تحریکوں میں ادا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ادبی تنظیمیں ڈھیلی ڈھالی رہی لیکن تنظیم کی کمی کو تحریک کے شباب کے زمانہ مین ادیبوں کے جوش وخروش نے پورا کیا ہے۔ تخلیق کی شدت اور حرارت نے کسی کمی کو محسوس نہیں ہونے دیا۔302

سردار جعفری نے اپنے اس واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے جس کے تحت وہ دسمبر 1936 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے نکالے جانے لگے اور اس شرط پر یونیورسٹی نے انھیں رہنے کی اجازت دینے کا وعدہ کیا کہ اگر یونیورسٹی کا کوئی استاد ان کے اخلاق و کردار کی ذمہ داری لے لے تو وہ یونیورسٹی میں رہ سکتے ہین۔ ان حالات میں سردار جعفری اگر چہ بڑے اعتماد کے ساتھ رشید صاحب کے پاس گئے لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔303

پہلے مقالے کے آخر میں رشید احمد صدیقی کے مئی 1953 میں منعقد بہار اردو کانفرنس (پٹنہ) کے خطبہ صدارت کے یہ کلمات درج کئے گئے جس میں انھوں نے ترقی پسند تحریک کی خدمات کی ستائش کی تھی۔

تقسیم ملک کے بعد جو قیامت مچی اس کو فرو کرنے اور رجعت پسند طاقتوں سے ٹکرا لینے میں ترقی پسند مصنفین کا قلمی جہاد صرف اردو ادب میں نہیں بلکہ اس دیس کی تاریخ میں شکر گذاری کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔ ان قلمی جہاد میں بعض ایسی تصانیف وجود مین آئی جن کا اردو ادب میں کلاسیکی درجہ ہے۔304

ترقی پسند تحریک کی نصف صدی، کے دوسرے خطبے میں سردار جعفری کے تنقیدی مطالعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے عمر رضا نے لکھا ہے:

1۔ 1980ء کے آتے آتے ان (سردار جعفری) پر یہی آشکار ہو گیا کہ ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کی انتہا پسندی ادب کے لیے مضر ہے۔ لیکن انھوں نے ترقی پسندی میں در آئی انتہا پسندی کو ختم کر کے معتدل اور متوازن ترقی پسندی کی بات کی۔ انھوں نے بنیادی طور پر ترقی پسند ادب ہی کو اعلیٰ ادب تصور کیا ہے۔ یہاں تک کہ مذکورہ کتاب میں اگر چہ ترقی پسند تحریک

میں درآئی انتاپسندی کا اعتراف کیا ہے لیکن اس پر عائد کیے گئے تمام الزامات کو انھوں نے بڑی خوبصورتی سے مدلل انداز میں رد بھی کیا ہے جس سے ترقی پسند تحریک سے ان کی گہری وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ البتہ اب وہ جمالیاتی اقدار کی اہمیت کو کھلے طور پر قبول کرنے لگے تھے۔305

ترقی پسند ادب ہندوستان کی تحریک آزادی اور سامراجی استحصال کے خلاف عالمگیر جدوجہد کا حصہ بتاتے ہوئے ایک انٹرویو میں سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک کے پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔

انھوں نے بتایا:

ترقی پسند ادب تحریک آزادی سے واضح وابستگی رکھتا تھا، سامراجی استحصال کے خلاف، اس میں جغرافیائی، نسلی اور قومی قیود کوئی معنی نہیں رکھتے تھے بلکہ ہماری ہمدردیاں، دنیا بھر میں برپا ہونے والی ہر اس جہاد کے ساتھ تھیں جن میں سامراجی شکنجے میں گرفتار سبھی مظلوم قومیں آزادی کا پرچم اٹھائے ہوئے تھیں۔ ایک طرف ملکی اور مقامی سطح پر ہندوستان میں ہونے والی تبدیلیوں سے بھی غافل نہیں رہا جاسکتا تھا اور دوسری طرف کرہ ارض پر ہونے والی تبدیلیوں سے اغماض ممکن نہ تھا۔ یہ تھا پس منظر جس میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تھا۔ اس میں دو عالمی جنگیں اور قحط بنگال کی ہولناکیاں بھی شامل ہیں، میں نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب میں اس صورت حال کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اس کے ثبوت فراہم کردیئے ہیں۔ 306

10 تا 12 جنوری 1992ء کو دہلی اردو اکادمی نے عصمت کی یاد میں بعنوان ''عصمت چغتائی اور نیا اردو افسانہ'' سہ روزہ سیمینار کا اہتمام کیا تھا۔ اس سیمینار کے اختتامی اجلاس میں سردار جعفری نے شرکت کی اور اپنی تقریر میں کہا:

''عصمت سے متعلق میرے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے''۔

میری ان کی دوستی اور رفاقت کا سلسلہ تقریباً پچاس سالوں پر محیط ہے۔ لیکن میں یہاں کوئی لمبی چوڑی تقریر نہیں کروں گا اور نہ ہی اختتامی اجلاس میں اس کا موقع ہے۔ میں صرف دو باتیں اٹھانا چاہوں گا جن کو پڑھ کر مجھے تکلیف پہنچتی ہے پہلی تو ان کی زبان کے بارے میں ایک بزرگ نے لکھا کہ وہ نقل کرتی ہیں۔ دہلی کی کرخنداری زبان کی دوسرا الزام ان پر جنس کے حوالے سے لگایا جاتا ہے۔ 1939ء میں ان کی پہلی کہانی گیندا، نیا ادب یا ساقی میں شائع ہوئی اور آخری کہانی تھی ننھی کی نانی۔ دونوں کے درمیان ان کے یہاں جو جنسی مسائل ہیں وہ محض چٹخارے کے لیے نہیں ہیں بلکہ پورا سماجی شعور کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اسکے پیچھے جو نظام اور خاص طور پر مردانہ نظام کام کرتا ہے، عصمت اس پر چوٹیں کستی ہیں۔

زبان کے متعلق انھوں نے کہا کہ ''آپ غالب کی نقل کرسکتے ہیں لیکن گھروں میں بولی جانے والی بولیوں کی نقل کرنا مشکل کام ہے اور عصمت نے یہ مشکل کام کر دکھایا ہے۔ انھوں نے گھریلوں زبان کو تخلیقی اعجاز عطا کیا۔ عصمت پر یہ بھی الزام ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر لکھتی ہیں۔ بڑے مسائل ان کی نظر میں نہیں تھے جو لوگ یہ الزام لگاتے ہیں انھیں نہیں معلوم کہ زندگی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ہی بڑی بنتی ہے۔ تاج محل اپنے آپ بڑا نہیں بن گیا۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے تراشا گیا تب جا کر فن کا ایک شاہکار بنا۔ عصمت کا وژن، سطح بہت بلند ہے اور بلند رہے گی۔ میں عصمت کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہا رکرتا ہوں۔ 307

23 نومبر 1993 کو اپنی ایک تقریر میں سردار جعفری نے میر، غالب کے بعد اقبال کا درجہ بتلایا ہے۔ سردار جعفری، اقبال کی شاعری میں انسانی عظمت کی بات سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اقبال کے اعتراف میں کوتاہیوں پر افسوس کا اظہار کیا۔

اردو میں میر، غالب کے بعد اقبال کو میں سب سے بڑا شاعر مانتا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ ابھی تک اقبال کا اعتراف نہیں کیا گیا ہے۔ حسرت، یگانہ، فانی وغیرہ سبھی اقبال کے اعتراف میں کوتاہی برتتے ہیں۔ پاکستان میں بھی اقبال کا اعتراف ایک عالمی ذہن کے شاعر کا اعتراف نہیں ہے۔ ہندوستان میں ان کا سارے جہاں سے اچھا تک کا ہی اعتراف ہے۔ پہلی بار ترقی پسندوں نے اقبال کا اعتراف کیا۔ اگر چہ وہ بھی محدود ہے۔ مجھے یاد ہے غالباً پہلی بار 1964 میں اقبال پر پہلا عالمی سمینار کیا گیا۔ اس میں میں نے صاف محسوس کیا کہ پروفیسر نورالحسن اور بنے بھائی جیسے ترقی پسند حضرات بھی اقبال کے بارے میں اپنے تحفظات رکھتے تھے۔ اصل میں یہ حضرات لکھنوی تہذیب کے تربیت یافتہ تھے اور مشکل سے اقبال کو قبول کر پاتے تھے لیکن آہست آہستہ تبدیلی آرہی ہے۔ بڑا شاعر کئی طرح کے تجربے کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کی تمام شاعری ایک طرح کی ہو۔ اقبال کے ہزاروں اشعار ایسے ہیں جن میں آہنگ نہیں ہے شکوہ میں بھی زیادہ آہنگ نہیں ہے لیکن یہ ایک ایسی نظم ہے جس میں انسانی عظمت کو للکارا ہے۔ 308

اردو اور غالب کو گھر چاہئے۔ اس عنوان کے تحت علی سردار جعفری کا خطبہ کتاب نما جولائی 1998ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کی ابتداء میں ادارہ کتاب نما نے یہ نوٹ درج کیا ہے۔ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے 5 جون 1998 کو مشہور و معروف اردو شاعر علی سردار جعفری کو 1997 کا گیان پیٹھ انعام پیش کیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جعفری صاحب کو یہ انعام دے کر ہم خود اپنی عزت بڑھا رہے ہیں۔ جعفری صاحب نے اپنے خطبے میں اردو شاعری کی سیکولر سرشت ہند اسلامی تہذیب کی تشکیل میں اردو کے کردار، تقسیم ہند کے ہاتھوں اردو کو پہنچنے والے نقصان، فرقہ وارانہ اتحاد کی اہمیت، اردو اور غالب کی بے گھری اور نیوکلیر جنگ کے خطرات جیسے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس خطبے کی اہمیت کے پیش نظر اسے یہاں پیش کیا جارہا ہے:

اردو زبان کی وسعت کے بارے میں سردار جعفری نے بتایا:

اردو نہایت خوب صورت اور دل آویز زبان ہے۔ اس کے ہزار بارہ سو کلاسیکی استعاروں میں اتنی وسعت ہے کہ ان کے اندر ایک دنیائے معنی آباد ہے اور وقت ضرورت ہر موقع، ہر محل، ہر کیفیت، ہر مزاج کا شعر زبان پر آہی جاتا ہے اور انسانی جذبات کی کہکشاں میں ایک ہی لفظ طرح طرح کے معنی اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے دو عاشقانہ شعر میری گرفتاری (دسمبر 1945 میں جنگ کے خلاف شاعری کرنے کے جرم میں) پر اسی طرح صادق آئے جیسے اسی موقع کے لیے کہے گئے ہوں۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرادیں گے کیا

اردو شاعری نے اپنے جمالیاتی سفر میں ملک اور قوم کے سیاسی سفر سے بے نیازی اور بیگانگی کا انداز ہ کبھی اختیار نہیں کیا۔ اس کے پاس صوفیانہ روایت کا جو ورثہ ہے اس میں مذہبی بیوروکریسی اور دنیوی بیوروکریسی دونوں سے اجتناب شامل ہے۔ شیخ، ناصح، واعظ، زاہد، محتسب، ملا اور اسی قبیل کے دوسرے کردار اردو شاعری کے ہدف ملامت ہیں۔ ان کی تنگ نظری، انتہاپسندی، ظاہرداری، مکاری اور خودپسندی پر خوب طنز کیا گیا ہے۔ ان کے تصور مذہب اور تصور جنت و دوزخ، عذاب و ثواب سب کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ ان کے مقابلے میں رندوں اور عاشقوں کی دنیا ہے جس کے دل انسانی ہمدردی سے سرشار ہیں۔ خدا تک پہنچنے کے لیے انسان سے محبت کرنا ضروری ہے۔ سب سے بڑا گناہ دل توڑنا ہے۔ اس میں مومن اور کافر کی تفریق نہیں ہے۔ اللہ حسین ہے اور حسن سے محبت کرتا ہے اور حسن کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ یہ ساری کائنات حسن کی جلوہ گری ہے اور اس جلوہ گری کے بے شمار رنگ ہیں۔309

جدید دور کی ابتداء ہندوستان کے دور غلامی میں اردو کا سیاسی کردار، اردو کے مجاہد آزادی کے بارے میں سردار جعفری رقمطراز ہیں:

میرے نزدیک جدید دور کی ابتداء غالب کی پیدائش سے چالیس سال پہلے 1757ء تھی جب کہ پٹنہ کے شاعر راجا رام موزوںؔ نے جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کی شکست کے بعد ایک شعر میں نہایت دل سوز مرثیہ کہا تھا۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

یہ ہندوستان کی غلامی کی ابتداء تھی جس کی تکمیل 1857 میں پہلی جنگ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد ہوئی اور ملکہ وکٹوریا قیصر ہند کا لقب اختیار کرتے ہوئے ہندوستان کی مہارانی بن گئی۔ 1757ء سے 1947ء تک 190 برس اردو شعر و ادب کے سب سے زیادہ زریں سال ہیں۔ اس زمانے میں اردو نے اپنا جمالیاتی کردار بھی ادا کیا ہے اور سیاسی کردار بھی۔ اردو کے بے شمار ادیب اور شاعر جنگ آزادی کے سپاہی رہے ہیں۔ ان میں بعض ایسے ادیب اور عالم بھی شامل ہیں جنھیں اخبار شائع کرنے کے جرم میں قتل کردیا گیا یا جلاوطنی کی سزا دی گئی۔ ان میں سب سے نمایاں مولانا فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ کے نام ہیں جو اپنے وقت کے بڑے عالم اور غالب کے گہرے دوست تھے۔

تقسیم ہند کے ہاتھوں اردو کو پہنچنے والے نقصان اور اردو اور غالبؔ کی بے گھری، فرقہ وارانہ اتحاد کی اہمیت اور نیوکلیر جنگ کے خطرات پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری کہتے ہیں:

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آزادی کے پچاس سال بعد بھی غالب اور اردو دونوں بے گھر ہیں۔ اردو فرقہ وارانہ سیاست کا شکار ہوگئی۔ تقسیم ہند نے سب سے زیادہ نقصان اردو زبان کو پہنچایا ہے۔ اگر اس وقت غالب کے دوسو سالہ جشن اور آزادی کے پچاس سالہ جشن کے موقع پر غالب کو گلی قاسم جان میں اپنا گھر مل جائے اور اردو کو شمالی ہندوستان میں اپنا علاقہ جہاں سے وہ

ہندی کے ساتھ دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے زندہ رہ کر ترقی کر سکے تو بہت بڑے نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔اس کی مثال بہار کی ریاست میں موجود ہے جہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ہندو مسلم اتحاد ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔اس کے بعد ہی ہم وسیع تر قومی اتحاد کا تصور کر سکتے ہیں اور حب الوطن کے چمن میں مختلف تہذیبوں مختلف مذہبوں کے پھول کھل سکتے ہیں۔میرے ذہن میں اتحاد اور دوستی کا جو تصور ہے وہ بہت حسین ہے۔میں اس خیال سے خوف زدہ ہوں کہ اگر خدانخواستہ نیوکلیر جنگ ہوئی تو کیا ہوگا۔میری پرورش اور تربیت ایسے ماحول میں ہوئی ہے جس میں روز قیامت اور یوم حساب پر یقین ایمان کا جزو سمجھا جاتا ہے۔کسی کو نہیں معلوم کہ قیام کب آئے گی۔مگر جب آئے گی تو پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑ جائیں گے اور سورج اپنی بلندی سے نیچے اتر کر سوا نیزے کے فاصلہ پر آجائے گا۔میں سوچتا ہوں کہ کیا نیوکلیر جنگ اس سے کم بھیانک ہوگی۔310

سردار جعفری نے اپنے ایک خطبہ میں غالب کی عظمت اجاگر کرتے ہوئے بتایا کہ غالب کا کلام اداسی مایوسی، دکھوں سے نکلنے اور نشاط و مسرت پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔غالب پورے عہد پر حاوی تھے اور ان کے مختصر دیوان میں ساری کائنات کی جھلکیاں موجود ہیں:

1۔ہم نے موضوع سخن آج کی شام کے لیے یہ رکھا تھا کہ غالب کی کہانی سردار جعفری کی زبانی،اس میں یہ بات پوشیدہ تھی کہ میں غالب کو کس نقطہ نگاہ سے آپ سب کے سامنے پیش کروں کیوں کہ یہ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا علم اور الہام پورے عہد پر حاوی ہوتا ہے اور عہد ماضی حال اور مستقبل میں تبدیل نہیں ہوتا ہے۔تقسیم بھی نہیں ہوتا ہے وہ تقسیم ہم کر لیتے ہیں، اپنی سہولت کے لیے ورنہ وہ پورے عہد پر حاوی ہوتے ہیں۔غالب پورے عہد پر حاوی ہیں۔وہ عہد جوان کے زمانے میں ختم ہو رہا تھا۔وہ ایک پوری تہذیب تھی۔کئی ہزار سال کی پرانی تہذیب جس کے پاس علم کی، سائنس کی فلسفہ کی، شاعری کی بہت بڑی دولت تھی۔اس دولت سے استفادہ کرنا، اس کو پہچاننا بھی ضروری تھا۔اس عہد کے انسانوں کے لیے اور بعد کے انسانوں کے لیے ہم لوگوں کے لیے بھی اس عہد کو سمجھنا بہت ضروری تھا۔آج ہم جس عہد سے گزر رہے ہیں اس میں پرانی قدریں یا تو پامال کر دی گئی ہیں یا پامال ہو گئی ہیں یا فرسودہ ہو گئی ہیں لیکن ہم ان قدروں کے لیے ترستے ہیں۔غالب کے عہد میں جو تہذیب ختم ہو رہی تھی اس کا غالب نے ماتم کیا ہے اور وہ تہذیب جو غالب کے شعور و احساس کا حصہ تھی جس کو غالب چاہتے تھے کہ وہ آئے اور ہندوستان کی برکت کا باعث بنے۔غالب آج زندہ اس لیے بھی ہیں کہ وہ ہماری زندگی کے ہر لمحہ میں شریک ہیں۔ہم لوگ اردو والے ہمارے یہاں کی ایک تہذیب ہے۔ہم لوگ اسکا حصہ ہیں اور وہ تہذیب یہ ہے کہ ہمارے سینہ میں ہمارے شاعر زندہ ہیں۔ہم اپنے تمام گزرے ہوئے شاعروں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کی شاعری سے کام لیتے ہیں اور لذت بھی حاصل کرتے ہوئے شاعروں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کی شاعری سے کام لیتے ہیں اور لذت بھی حاصل کرتے ہیں، سکون بھی حاصل کرتے ہیں اور نجات بھی حاصل کرتے ہیں۔کوئی بہت ہی ظالم اور سفاک آدمی ہو اس کے لیے ہم کافر کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔کافر کا مطلب ہے سچائی اور حقیقت سے انکار کرنے والا اور کلام مجید میں کافر کا لفظ جب آیا ہے تو وہاں کے حالات کے مطابق تھا۔ہندوستان کے بارے میں نہیں تھا۔یہ فتویٰ میں دے سکتا ہوں بغیر عربی پڑھے

ہوئے لیکن ہم اب اپنے محبوب کو بھی کافر کہتے ہیں۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

یہاں اس منزل پر پہنچ کر کوئی شاعر ہمیں غالب کے قریب کھڑا نظر نہیں آتا کہ جس کے یہاں وسعت اتنی زیادہ ہو اور دس بارہ سو شعر میں یا چودہ پندرہ سو شعر سولہ سو شعر دیوان غالب جو مرتبہ دیوان غالب ہے اس میں یہ ساری کائنات موجود ہے۔

2۔ ہمیں غالب کی شاعری میں بھی پست اور خشک اور تر اشعار ملیں گے جو بے شمار ہیں اور ہماری زندگی میں کام کرتے ہیں رہنمائی کا۔ اداسی کی گھڑیوں سے باہر نکلنے میں مدد دیتے ہیں۔ مایوسی سے نکالنے میں مدد دیتے ہیں اور نشاط و مسرت پیدا کرنے میں مدد دیتے ہیں اور ہمیں ان دکھوں سے بھی نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس کا علاج نہ تو اس شاعر کے پاس ہے اور نہ ہمارے پاس اور نہ کسی اور کے پاس۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اس کے علاوہ غالب کی زندگی میں ہمیں اور بہت سارے سبق ملتے ہیں کہ بدی کے اس عالم میں زندگی کیسے بسر کی جائے"۔311

اپنی ایک ریڈیائی تقریر میں سردار جعفری نے بتایا کہ شاعری نہ صرف سامع اور قاری کے لیے باعث تسکین ہے بلکہ شاعر کے لیے بھی۔

سردار جعفری نے کہا: میں شاعری کو بنیادی طور سے گانے کی چیز یا بلند آواز میں پڑھنے اور سنانے کی چیز سمجھتا ہوں۔ شاعری کے جوہر اس کے بغیر نہیں کھل سکتے۔لیلکن اس کے باوجود شاعری کو اس قدر ہونا چاہئے کہ کاغذ کے صفحہ پر چھپ سکے اور خاموشی سے پڑھی جا سکے اور صدیوں کا سفر طے کر سکے لیکن کاغذ پر پڑھنے میں بھی الفاظ کا آہنگ اور لحن تخلیق کا صوتی تلاطم اور ترنم روح کو محسوس ہوتا ہے۔خاموشی سے پڑھنے پر بھی انسان کے دل و دماغ لفظ کی آواز کو سنتے ہیں۔شاعری اس حد تک مقصود بالذات ہے کہ اس کی تخلیق میں کرب کے باوجود ایک لذت ہے اور یہ لذت شاعر کے لیے تسکین کا باعث ہے اور اسے معاوضے اور انعام سے بے نیاز کر دیتی ہے۔312

شاعر کی ذات اور معاشرے اور کائنات میں تعلق کے بارے میں سردار جعفری نے کہا:

"الفاظ معنی کی علامتیں ہوتے ہیں۔یہ معنی لغوی بھی ہو سکتے ہیں اور خلاقانہ بھی جنھیں شاعری کی شاعرانہ بصیرت نے نیا رنگ دیا ہے۔اس سے شاعر اور قاری شاعر اور سامعین کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔اس کی وجہ سے شاعری سماجی کردار حاصل کر لیتی ہے اور اس میں ایک مقصد شامل ہو جاتا ہے۔اس طرح شاعر کی ذات تنہا نہیں رہ جاتی بلکہ معاشرے اور کائنات کا ایک حصہ بن کر ابھرتی ہے۔شاعر کا موضوع زندگی کا کرب و نشاط ہے۔انسانی دکھ اور سکھ ہیں۔اسکی ذاتی خوشیاں اور محرومیاں بھی عام عالم انسانی کی خوشیوں اور محرومیوں سے الگ کوئی چیز نہیں ہیں۔وصل کی لذت اور ہجر کا درد بھی محسوس کرتے ہیں۔ظلم سے

نفرت اور نیکیوں سے محبت کا جذبہ ہر دل میں ہوتا ہے لیکن شاعر اپنے انفرادی تجربے کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہر شخص کو وہ بات اپنی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ ہر شخص اس میں شریک ہوسکتا ہے۔ لحن و آہنگ الفاظ کو نئی خوبصورتی عطا کرتے ہیں جو سامع اور قاری کے لیے دلکشی کا باعث ہوتی ہے۔ تشبیہ اور استعارے نئی معنوی تہیں پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح شعر کی معنوی کیفیت سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ پڑھنے اور سننے والے شعر کی فنی خصوصیات سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ شعر کہنے کی طرح شعر کو سمجھنا اور اس سے لطف اندوز ہونا بھی ایک تخلیقی عمل ہے۔ اس طرح دونوں اس تخلیقی عمل میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ شاعر اور معاشرے کا رشتہ ہے۔313

حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی پچیسویں کل ہند کانفرنس 10 مارچ سے 12 مارچ منعقد ہوئی۔ اس کے تحت یک کل ہند انجمن ترقی پسند مصنّفین سمینار ہوا جس کا موضوع ادب، زندگی اور نظریہ تھا۔ اس میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے ایک مقالہ ادیب کا منصب اور ترقی پسند احساس پیش کیا۔ اس پر رضی الرحمٰن اور حفیظ اللہ نے ایک سوال نظریہ سے سے متعلق کیا۔ مقالہ نگار نے جواب دیا۔ سردار جعفری نے مداخلت کی اور نظریہ کیا ہے،۔ اس پر مختصر اُروشنی ڈالی۔ اس کے بعد کمال احمد صدیقی نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس مقالہ پر فرزان کیفی نے ایک سوال پوچھا ''آپ نے اپنے مقالے میں بار بار بنیاد پرستی کا لفظ استعمال کیا تو آپ بنیاد پرستی سے کیا مراد لیتے ہیں؟ وضاحت فرمایئے۔ کمال صاحب کے جواب سے فرزان صاحب مطمئن نہیں ہوئے اور کچھ اور پوچھنے لگے۔ سردار جعفری نے پھر مداخلت کی اور لفظ بنیاد پرستی پر روشنی ڈالی۔ ساجدہ زیدی کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے سردار جعفری نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی اہمیت اور حفاظت کی ضرورت پر زور دیا۔ سردار جعفری کی وضاحتیں پیش ہیں:

1)نظریہ:

سردار جعفری نے کہا:نظریہ تو دراصل فلسفہ حیات ہوتا ہے۔ جو ادب میں داخل ہوتا ہے اور ہر ادیب کا ہوتا ہے۔

2فن:

فن کیا ہوتا ہے اس کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ اس کا جواب تو ارسطو سے آج تک کوئی نہ لے سکا۔ فن وہ ہے جو دل کو چھو لے۔ بس اس کے علاوہ کوئی بھی جواب مشکل ہے۔

3۔بنیاد پرستی:

یہ بنیاد پرستی کا لفظ جو ان دنوں کثرت سے استعمال ہو رہا ہے، یہ دراصل ہمارا لفظ نہیں ہے۔ یہ امریکہ کا دیا ہوا لفظ ہے ا س سے مراد انتہاپسندی ہے۔ مذہب خواہ کوئی بھی ہو اس کی انتہاپسندی خود اس مذہب کو نقصان پہنچاتی ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ جو مذہبی ہے یا جس نے مارکس کو نہیں پڑھا ہے وہ اچھا ادب نہیں پیش کرسکتا۔ ٹیگور، قرۃ العین حیدر وغیرہ مارکسٹ نہیں ہیں لیکن انھوں نے بہت اچھا لکھا۔ اصل مسئلہ تو اقدار کا ہے۔ ترقی پسند اقدار تو صوفیوں میں بھی تھے۔ مارکس نے ان اقدار کو ایک سائنسی نظر دے دی۔ بس اتنا ہی ہوا اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایک چیچنیا کیا اور بھی مثالیں ہیں۔ اس سوال کو مذہب کے حوالے سے نہیں لینا چاہئے۔ عالم انسانیت پر جہاں بھی ظلم ہو رہا ہے اس کے خلاف آواز اٹھنی چاہئے۔ ہم میں سے مارکس کے

ماننے والے ہوسکتے ہیں اور نہ ماننے والے بھی۔آپ اسلام کے راستہ سے آیئے یا مارکسزم کے راستہ سے اچھا ادب تخلیق کیجئے۔اچھے ادب کو کسی ایک نام سے منسوب کرنا مناسب نہیں۔میں مارکسسٹ ہوں۔میرا عقیدہ ہے کہ مارکس نے اچھا نظریہ دیا ہے۔آپ یقین نہیں رکھتے نہ رکھیئے لیکن خدارا اسے جذباتی نہ لیجئے۔

(4)مشترکہ تہذیب:

یہاں ابھی ساجدہ زیدی نے مغربی کلچر کے یلغار کی بات کی۔یقیناً یہ بہت خطرناک بات ہے لیکن آپ ذرا غور کیجئے خود ہمارے ملک میں کیا کم قیامت برپا ہے۔گزشتہ دنوں بابری مسجد پر حملہ ہوا تو کیا یہ محض اینٹ گارے کی مسجد پر حملہ تھا۔دراصل یہ ایک مخصوص تہذیبی دین پر حملہ ہے جسے مغلوں نے دیا ہے۔خود اردو زبان پر بھی حملے ہورہے ہیں۔وہ اسی تہذیب پر حملے ہیں لیکن یہ لوگ بھول رہے ہیں کہ اگر یہ تہذیبیں ختم ہوگئیں تو ہندوستان ویران ہوکر رہ جائے گا۔یہ ہماری ذہنی لڑائی ہے۔روحانی لڑائی ہے۔یہ ایک طویل جنگ ہے جو چلے گی۔ہم ہندوستانی تہذیب میں جیتے ہیں۔میں اس کی مثال کنول کے پھول سے دینا چاہتا ہوں جسے غلطی سے ہندو پھول سمجھ لیا گیا ہے۔کنول کا پھول سب سے پہلے بدھزم میں آیا۔یہیں سے وہ اجنتا کی آرٹ میں پہنچا۔پھر ہندوستان سے مشرق کی طرف چلا گیا۔ادب میں مصوری میں استعاروں میں رچ بس گیا اور پھر سفر کرتے ہوئے مسجدوں کے مینار ومحراب میں پہنچ گیا۔گولکنڈہ کی مسجدوں میں آپ کو کنول کا پھول ملے گا۔یہ ہے ہماری مشترکہ تہذیب کی دین جو پانچ ہزار سال کی دین ہے۔آخر میں انہوں نے کہا:

''تو یہ ہے ہماری تہذیب جس کی ہم کو حفاظت کرنی ہے اور اس یلغار کو روکنا ہے اور اس روک میں سب سے بڑے سپاہی ہیں ادیب اور ترقی پسند ادیب،ادیبوں کا نام آتے ہی سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔پورے ماحول میں ایک حرارت سی دوڑ گئی۔تالیوں کی گونج میں بھی ان کی آواز گونج رہی تھی۔ہم ہندوستانی ہیں ہم ہندوستانی مسلمان ہیں اور ہمارا حق اس تہذیب کی حفاظت ہے جو ہندوستان کی تہذیب ہے اور ہماری تہذیب بھی ہے۔314

نئی تشبیہات،نئے استعارے،نئی امیجری کو عصری ضرورت بتاتے ہوئے سردار جعفری نے کہا:

''پرانی علامتیں ایک بہت بڑا خزانہ ضرور ہیں لیکن اس خزانے پر قناعت کرلینا نادانی ہے کبھی تو ان کے استعمال سے بڑا حسن پیدا ہوجاتا ہے،،لیکن وہ خیالات اور احساسات کو جکڑ بھی لیتے ہیں اور اصلیت پر پردہ ڈال دیتے ہیں کیوں کہ زندگی کی نئی حقیقتیں نئے طریق اظہار اور انداز بیان کا مطالبہ کرتی ہیں۔اس لیے میں بغیر کسی جھجک کے نئی تشبیہ اور استعارے بھی استعمال کرتا ہوں اور نئی امیجری بھی۔میں نے اس اصول کو بہت مفید پایا ہے کہ تشبیہ اور استعارے اور امیجری موضوع کے ماحول سے حاصل کرنے چاہئیں۔یہی وجہ ہے کہ میری شاعری میں گل وبلبل،شمع،پروانہ،دریا،ساحل،کشتی،.....رہزن،منزل،جادہ، سینا،ساغر،تیغ تفنگ ہی نہیں ملتے بلکہ روٹی،چاول،دنے،گیہوں،.....ریل،مشین،مزدور،رائفل،ٹینک،بمبار،چولہا،پتیلی اور اس قسم کے دوسرے عام الفاظ کی بہتات ہے۔315

انٹرویو اور ملاقاتیں

انٹرویو میں پوچھے گئے سوالات کے جوابات میں سردار جعفری کی تنقید کی جھلکیاں ملتی ہیں۔یہی چیز ملاقاتوں اور بات چیت میں بھی نظر آتی ہیں۔دستیاب انٹرویو اور ملاقاتوں کے حوالوں سے سردار جعفری کی تنقیدی آرا،تبصرے،وضاحتیں اور افکار ،وغیرہ پیش کیے جارہے ہیں۔

ملاحظہ کیجیے:

اگست 1985ء میں ایک انٹرویو میں سردار جعفری نے عصری آگہی کو تخلیق کی طاقت اور بنیاد بتلایا ہے۔

حسن عابدی نے اگست 1985ء میں سردار جعفری سے انٹرویو لیتے ہوئے ایک سوال یہ بھی کیا ''جعفری صاحب ترقی پسند تحریک نے جو منشور دیا تھا کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آج کے مختلف حالات میں وہ کافی ہے یا ہمیں کسی نئے منشور کی ضرورت ہوگی .....''سردار جعفری نے جواب دیا:

برنارڈ شاہ نے ایک مرتبہ بڑی دلچسپ بات کہی تھی کہ ''میرا درزی ہر سال آکے میرا ناپ لے جاتا ہے''تو یہ بات حالات اور ہمارے باہمی رشتے پر بھی منطبق ہوتی ہے۔یہ بات تو یقیناً غیر متنازعہ ہے کہ ہمیں یعنی لکھنے والوں کو اپنے معروضی حالات کو جانچتے پرکھتے رہنا چاہئے کہ یہی عصری شعور کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے''۔اب جہاں تک 1936ء کے منشور کا حوالہ ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی طور پر اس منشور میں جو باتیں کہی گئی تھیں وہ بڑی حد تک اب بھی باقی ہیں لیکن جزئیات میں نئے رویے ہمارے متعین ہوئے اور ہو رہے ہیں۔کم از کم ہندوستان میں اس بات کو محسوس کرلیا گیا ہے اگر حالات سے بے بہرہ اور لاتعلق رہ کر کوئی ادب تخلیق کیا گیا تو وہ یقیناً نہ صرف اپنی طاقت سے محروم ہوگا بلکہ اپنی بنیاد سے بھی،اب جو عالمی صورت حال ہے اور دنیا کا دائرہ جس تیزی سے تنگ ہوتا جارہا ہے اور فاصلے جس سرعت سے اپنی طنابیں کھینچے جاتے ہیں تو یہ صورت حال بھی ہمارے لیے معروضی حالات کا حصہ بن جاتی ہے اور ان سب کا اپنے اپنے طور پر جائزہ لیا جاتا رہنا چاہئے .....اپنے ماحول اور اپنے عصری حالات سے لاتعلق ہوکر کوئی زندہ اور متحرک ادب پیدا نہیں ہوسکتا''۔316

حلقہ ارباب ذوق کے بارے میں سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک سے متعلق مشاہیرین ادب سے بات چیت میں کہا:

(1)''حلقہ ارباب ذوق کے ساتھیوں نے اردو نظم کو ہیتی اعتبار سے بہت کچھ دیا ہے۔نئی نئی فارمز کے تجربے جوان لوگوں نے کیے ہیں ترقی پسندوں نے کم کیے ہیں۔نئی لفظیات کے سلسلہ میں بھی ان احباب کا کام زیادہ وقیع اور قابل تحسین رہا ہے''۔ 317

(2)''حلقہ ارباب ذوق کے لکھنے والوں سے فکری اعتبار سے نہ سہی تو اسلوبی اعتبار سے ترقی پسندوں نے اثرات یقیناً قبول کیے ہیں اور ترقی پسندوں کے اثرات بھی ان کے ہاں موجود ہیں جن کا اعتراف ہر دو جانب سے کھلے طور پر ہونا چاہئے''۔318

ہندوستان اور پاکستان کی اردو شاعری کے اسلوب اور لہجے میں فرق کے سلسلہ میں ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے جہاں اپنے خیالات کا اظہار کیا وہیں سردار جعفری سے بھی ان کی رائے جاننے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر رہی معصوم رضا نے سردار جعفری سے 18/اپریل 1990ء کو انٹرویو لیتے ہوئے سوال کیا ''پاکستان میں جو اردو شاعری ہو رہی ہے اور ہندوستان میں جو اردو شاعری ہو رہی ہے اس میں میں دیکھ رہا ہوں کہ پاکستان میں لہجے، زبان یا استعارے کی بنیاد میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ وہ انہیں استعاروں کو جو 1936ء سے چلے آ رہے ہیں اور لگ بھگ اسی زبان کو جو 1936ء سے چلی آ رہی تھی استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں، مگر ہماری شاعری میں بہت بڑی تبدیلی ہوئی ہے .....ہمارے شاعر نئے طریقے کی زبان بنانے کی کوشش، نئے استعارے تلاش کرنے کی کوشش، اور نئے موضوعات کو چھونے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ یہ کوشش ہمارے ہاں جاری ہیں۔ یہ جو فرق ہے ہندوستان اور پاکستان کے اسلوب اور لہجے میں یہ فرق کیوں ہے؟

اس سوال کے جواب میں سردار جعفری نے کہا:

''میرا خیال یہ ہے کہ فیض کو الگ کر دیجئے کیوں کہ وہ ایک طرز ہی الگ ہے لیکن ان کے بعد کے جو شعرا ہیں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں .....پاکستان کے .....ان کے لہجے میں ایک غم کی لہر ہے۔ ہمارے ہاں ایک نشاط کی لہر ہے جواب بھی باقی ہے۔ یہ چیز پاکستان کی شاعری میں مفقود ہے.....اس کی وجہ وہاں کے حالات ہیں۔ آزادی سے پہلے تو روایت ایک ہی تھی۔ آزادی کے بعد ہمارے ہاں باوجود تمام باتوں کے جمہوری مزاج ہے جو پاکستان کے ہاں نہیں مل سکتا۔ اس لیے ان کے ہاں غم اور احتجاج ہے۔ یہ ابھی تک چل رہا ہے۔ ایک اور چیز پاکستان کی شاعری میں در آتی ہے وہ ہے ہجرت۔ اور وہ اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اب جو لوگ اپنے پیٹ کی خاطر امریکہ اور دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں تو مہاجر کہلاتے ہیں .....اور اب تو ان کے ہاں یہ تین چیزیں ہیں غم کا لہجہ، احتجاج اور ہجرت کا تصور ہمارے ہاں احتجاج بہت ہے لیکن غم کے لہجے کے ساتھ نہیں اور ہجرت بھی نہیں ہے۔ راہی صاحب نے کہا ہم اپنے گھر میں بیٹھے ہیں .....لیکن یہ شعراء ہندوستان اور پاکستان کے لڑکے جو اس وقت امریکہ اور کنیڈا میں جا کے بس گئے ہیں اور جو شاعری کر رہے ہیں اور صاحب دیوان شاعر بھی ہو گئے ہیں۔.....وہ پاکستان کی شاعری کی زبان سے آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ اس پر جعفری صاحب نے کہا۔ ظاہر ہے کیوں کہ وہ پاکستانی ہیں اور ان کا مسئلہ پاکستان ہی ہے۔ آتے جاتے بھی رہتے ہیں تو وہ اس سے آزاد ہو بھی نہیں سکتے۔ البتہ اب ان کے ہاں کچھ تازہ کاری بھی آئی ہے۔ ایک اچھی شاعرہ ہے، عرفانہ عزیز۔ ایک تو وہ فیضؔ سے متاثر ہے۔ ترقی پسند شعرا سے متاثر ہے۔ اس کے پاس اپنی ایک آواز ہے۔ لہجہ ہے اور دانشوری ہے۔ اور یہ جو دانشوری ہے یہ نہ تو ہندوستان ابھی قبول کر رہا ہے۔ شاعری میں اور نہ پاکستان .....اس وقت پاکستان کی شاعری ذاتی کوائف میں مبتلا ہو گئی ہے۔ ہندوستان میں بھی کیفیات کے ساتھ کہیے تو قبول کرتے ہیں اور جہاں دانشوری آئی اور ذاتی سطح سے جہاں ذرا بلند ہوئے، اس کو وہ نا قبول کرتے ہیں۔ ایک دوسری شاعرہ ہیں پاکستان کی عشرت آفریں۔ اس کے ہاں بھی بڑی نئی چیزیں ہیں .....اس میں دانشوری بھی ہے''۔ 319

راہی صاحب نے 18/اپریل 1990ء کو سردار جعفری سے انٹرویو لیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ہماری شاعری بڑی اچھی ہے۔

اس کی تائید کرتے ہوئے سردار جعفری نے کہا تھا:

''بڑی اچھی ہے اور بہت بلند ہے۔ میں اس کی داد بھی دوں گا۔ تو بھئی ہم تو اپنے ادب سے مطمئن ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ اصناف جو ہیں کسی زبان میں ایک صنف ترقی کرتی ہے کسی میں دوسری۔ کہوں کہ کلچر کی جو فضا ہوتی ہے وہ اس کے لیے ہموار نہیں ہوتی۔ شاعری میں انگلستان کو جو درجہ حاصل ہے وہ یورپ کی کسی زبان کو حاصل نہیں۔ جو درجہ ناول میں روس کو حاصل ہے وہ کسی کو حاصل نہیں۔ موسیقی میں جو درجہ جرمنی کو حاصل ہے وہ کسی کو نہیں۔ اسی طرح جو مقام اردو شاعری کو حاصل ہے وہ کسی زبان کی شاعری کو حاصل نہیں۔ ناول میں ہم ان سے پیچھے ہیں۔ افسانے میں ہم بہت ترقی کر گئے تھے، مگر اب جو یہ زوال آیا ہے تو یہ آیا نہیں، لایا گیا''۔320

18/اپریل 1990ء کو راہی معصوم رضا کو دیے گئے انٹرویو میں سردار جعفری نے اچھے شاعر کی پہچان بتائی ہے:

''علی سردار جعفری نے کہا ''اچھے شاعر یا اچھے ادیب کا کام داد حاصل کرنا نہیں ہے۔ اس کا کام ہے، راستے بنانا''..... اچھے شاعر کے ہاں دو چیزیں ضرور ہوتی ہیں ایک تو اس کا مجموعی تاثر اور ایک آہنگ۔ یہ دونوں برابر رہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ متفرق شعر کے ساتھ آہنگ بدل گیا یا اس کا تاثر بدل گیا''۔ 321

ادب زندہ کب رہتا ہے:

سردار جعفری نے بتایا کہ جو شاعری اپنے عہد کی پوری بصیرت کے لیے ہو اور جس میں ماضی و حال کے ساتھ ساتھ آنے والے زمانے کی دھمک بھی سنائی دیتی ہے وہ زندہ رہتی ہے۔ 322

نثری نظم کے بارے میں سردار جعفری نے بتایا ہے:

''اس سلسلہ میں صرف ایک جملے میں یہ بات کہوں گا کہ نثری نظم کے امکان ہو سکتے ہیں شرط یہ کہ لکھنے والا اتنا ہی بڑا شاعر ہو جتنا Walt Whitman تھا کیوں کہ اس میں دراصل فکر کا Raythem ہوتا ہے محض فارمز کے ذریعے نثری نظم کا حقیقی ردھم (Rhythm) پیدا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے نئی زبان اور استعارے کی تخلیق بھی ضروری ہوگی۔ ایک مرتبہ ناظم حکمت نے فیض سے گفتگو کرتے ہوئے .....کہا تھا کہ ''بری شاعری زبان کے مروجہ ردم Rhythm کو توڑ کر پیدا ہوتی ہے آپ عربی زبان کے اوزان کیوں استعمال کرتے ہیں؟ عربی اوزان تو عربی مزاج کو پیش کرتے ہیں۔ ہماری اپنی زبان کا ایک ردم ہے جسے میں نے اکثر و بیشتر توڑنے کی کوشش کی ہے''۔ اب یہ کوشش آپ کو فیض کے آخری زمانے کی بعض نظموں میں بھی ملے گی''۔323

1857ء کے بعد کے ادب کے بارے میں سردار جعفری نے بتایا ہے:

''جدید اردو ادب جس کا آغاز 1857ء کے بعد ہوا، عقل پسندی، حب الوطنی، انسان دوستی اور سامراج دشمنی کی منزلوں سے گزرتا ہوا جب پہلی جنگ عظیم کے بعد انقلاب کے موڑ پر آیا تو اس میں بحران پیدا ہو گیا۔ اس عقل پسندی پر مذہب کی پرچھائیں تھی۔ حب الوطنی پر ماضی پرستی چھائی ہوئی تھی۔ انسان دوستی طبقاتی حدوں میں اسیر تھی اور سامراج دشمنی میں سمجھوتے بازی کی آمیزش تھی زنجیروں نے انقلاب کی منزل پر جدید ادب کو جکڑ لیا''۔ 324

استعارہ دار و رسن غالب کے ہاں سے ترقی پسندوں کے ہاں جو آتا ہے اس کی مثالیں فیض، مخدوم کے اشعار سے دینے

کے بعد سردار جعفری ایک دوسرے موقع پر کہتے ہیں:

''اس طرح کے سیکڑوں شعر ہیں جنہیں آپ آج کے عہد کیساتھ رکھ کر دیکھ سکتے ہیں اور وہ بھی عالمی پس منظر میں ،..... یہ اشعار ہندوستان کے لیے ہیں، پاکستان کے لیے ہیں، ترکی کے لیے ہیں یا فلسطین کے لیے ہیں۔ جہاں جہاں صورت حال تظلم و تشدد سے دوچار ہے وہاں وہاں یہ اشعار اپنی پوری معنی آفرینی کے ساتھ جلوہ سامان ہوتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ شاعر کے کلام کا پرتو مستقبل پر بھی پڑ رہا ہے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ غزل اپنے تمام تر امکانات غالب کے ہاں ختم کر چلی تھی اور اسی لیے آنے والے شعرا کو جن میں آزاد، حالی اور شبلی شامل تھے غزل سے گریز اختیار کرنے کی ضرورت پیش آئی''۔ 325

تشبیہ و استعارات سے سماجی تنقید کا کام کے تعلق سے سردار جعفری نے کہا:

''تشبیہ اور استعاروں سے ہم نے سماجی تنقید کا کام لیا ہے..... جوش کا ایک شعر ؎

تیز کرنیں جیسے بوڑھے سود خوروں کی نگاہ
دھوپ کی تیزی کہ جیسے روح پر عکس گناہ

''روح پر عکس گناہ'' اور ''بوڑھے سود خوروں کی نگاہ'' اس میں پوری سماجی تنقید ہے مجاز کی نظم ''آوارہ'' میں ؎

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملّا کا عمامہ جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب

ان تشبیہوں میں پورا سماجی شعور جلوہ گر ہے اور محل اور اس کا جو پورا رشتہ ہے بنیے کے ساتھ، بیوہ کے ساتھ اور مفلس کے ساتھ۔ 326

شاعری میں لب و لہجہ کی اہمیت پر پوچھے گئے ایک سوال پر سردار جعفری نے ندا فاضلی کو جواب دیا اور لب و لہجہ کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

''جعفری صاحب! اس سوال کے پوچھنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں مواد کی اہمیت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اور ہیئت پرستی پر کڑی تنقید بھی کی ہے اور مواد کی بھی آپ کے یہاں ایک بندھی ٹکی تعریف ہے.....''

''میں مواد کو ہیئت سے الگ نہیں سمجھتا۔ ہر خیال اپنا لباس ساتھ لے کر آتا ہے.....''۔

لب و لہجہ عہد بہ عہد بھی بدلتا ہے اور موضوع سے بھی اس کا گہرا تعلق ہوتا ہے''۔ 327

آج کے دور میں غالب کی اہمیت کیا ہے؟

اس سوال کے پوچھے جانے پر سردار جعفری نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے:

''غالب آج بھی اتنے ہی عظیم شاعر ہیں جتنے اپنے دور میں تھے۔ غالب کو ہم اردو کا گوئٹے کہہ سکتے ہیں۔ ان کی شاعری

میں ایک طرف پیار کی مہک ہے تو دوسری جانب فلسفہ ہے۔بالکل ایسے ہی جیسے کرشن کے ساتھ گیتا اور رادھا دونوں ہیں"۔

328

سردار جعفری نے بتایا کہ استعارہ "دار و رسن" کس کس انداز میں استعمال ہوا ہے۔

غالب کے ہاں دار و رسن کا استعارہ پہلی بار نئے معنوں اور نئی امیج کے ساتھ آتا ہے۔میر تک تو یہ استعارہ یعنی صوفیانہ انداز میں آتا ہے.....میر کا شعر ؎

فصل آئی کو نخلِ دار پہ میر
سرِ منصور ہی کا بار آیا

یہ بھی صوفیانہ انداز ہے۔غالب کے یہاں کس انداز میں جدید عہد جھلکتا ہے ؎

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

یہ صرف 1857ء کے قتل و غارت گری کا ہی نوحہ نہیں ہے بلکہ پوری انیسویں صدی کے قتل و غارت گری کا اشارہ ہے۔ اس میں ایک باریک نکتہ اور بھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ قد و گیسو میں تو قیس و کوہکن کی آزمائش ہو رہی ہے لیکن جہان دار و رسن کا معاملہ ہے وہاں مجاہد و شہید کی آزمائش درپیش نہیں ہے بلکہ خود دار و رسن آزمائش سے دوچار ہیں یہ غالب کی بلاغت کی مثال ہے.....یہ دار و رسن کا استعارہ غالب کے ہاں سے ترقی پسندوں کے ہاں آتا ہے.....مجروحؔ نے کہا ہے ؎

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

تو یہاں دوئی ختم ہو جاتی ہے۔یہ امیج Image ہر ترقی پسند شاعر کے ہاں اس کے اپنے انداز میں موجود ہے۔فیض کے ہاں، مخدوم کے ہاں، مجروح کے ہاں اور میرے ہاں ؎

حکایت دل کی کیا دار و رسن کی اک کہانی ہے
قد و گیسو کی لیکن داستاں معلوم ہوتی ہے

سب کے ہاں الگ الگ انداز میں یہ بات ملے گی.....اس طرح سیکڑوں شعر ہیں جنہیں آپ آج کے عہد کے ساتھ رکھ کر دیکھ سکتے ہیں اور وہ بھی عالمی پس منظر میں..... یہ اشعار ہندوستان کے لیے ہیں، پاکستان کے لیے ہیں یا فلسطین کے لیے ہیں۔جہاں جہاں صورت حال تظلم و تشدد سے دوچار ہے وہاں وہاں یہ اشعار اپنی پوری معنی آفرینی کے ساتھ جلوہ سامان ہوتے ہیں"۔329

لمحاتی، وقتی ہنگامی نوعیت یا فوری ردعمل کے طور پر جو شاعری کی جاتی ہے اس کی بھی اپنی اہمیت ہے۔

سردار جعفری نے ایسی شاعری کی ضرورت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے:

"ہمیں اس شاعری کی بھی ضرورت ہے جو ایک وقتی لمحہ کی ضرورت کو پورا کر رہی ہو اور اس شاعری کی بھی جو لمحاتی اور وقتی

سطح سے بلند ہو کر دائمی قدر کی حیثیت حاصل کر سکے۔ میں اب بھی یہ بات کہتا ہوں کہ فوری ردعمل کے طور پر جو شاعری پیدا ہوتی ہے وہ بالکل ہی بے معنی نہیں ہوتی ..... اس وقت ہم ایک ہیجانی صورت حال سے دوچار تھے، ایک طرف ہندوستان کی آزادی کی جنگ تھی، بنگال کے قحط کی ہولناکیاں تھیں، بحریہ کی ہڑتال تھی۔ کسانوں، مزدوروں اور نچلے طبقوں کی جدوجہد تھی، غرض حوادث و واقعات کا ایک سیل تھا، جو ہمارے چاروں طرف امڈا ہوا تھا۔ کیا ترقی پسند ادیب کے لیے جو اپنا راستہ عوام سے استوار رکھتا ہو اور جو تخلیق ادب کو ایک سماجی ذمہ داری بھی جانتا ہو، ان بدلتے ہوئے حالات سے چشم پوشی ممکن ہو سکتی تھی؟ ظاہر ہے نہیں۔ لہٰذا انہوں نے وقت کے تقاضوں کے تحت بھی شاعری کی ہے اور اردگرد ہونے والے واقعات پر بے شمار نظمیں بھی لکھی ہیں۔ میں نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب میں بیشتر مثالیں مجروح کی شاعری سے پیش کی تھیں .....''۔

(2) ''..... اگر کوئی نظم ہزاروں مزدوروں کے سامنے پڑھی جائے اور وہ ان کے خون میں شامل ہو کر ان کی جدوجہد میں تعاون کرے تو اس میں قباحت کیا ہے ..... ٹیگور کو جن کی عظمت سے شاید ہی کسی صحیح الدماغ شخص کو انکار ہو، کیا انہوں نے پارٹیشن آف بنگال کے سلسلہ میں چلنے والی تحریک اور جلوس میں شامل ہو کر نظمیں نہیں پڑھیں؟ ..... کیا پابلو نرودا نے ہنگامی نوعیت کی نظمیں نہیں لکھیں اور بڑے بڑے مجمعوں کے سامنے نہیں پڑھی ہیں؟ اور کیا ایسا کرنے سے ان حضرات کا اثاثہ شعری کیا قابل دریا برد ٹھہرے گا؟ بات دراصل یہ ہے کہ مخدوم محی الدین، کیفی اعظمی، سردار جعفری، وامق جونپوری، نیاز حیدر جذبی اور اس قسم کے دوسرے ..... نے ایجی ٹیشنل Agitational احتجاجی شاعری دانستہ اور شعوری طور پر کی تھی کیوں کہ ہم اس قسم کی شاعری کی ضرورت اور اہمیت کا احساس رکھتے تھے۔ اور آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ شاعری بے اثر تھی اور اس نے کوئی کام سرانجام نہیں دیا ..... ہم نے احتجاجی شاعر ضرور کی ہے لیکن ساتھ ہی ہم نے دائمی قدروں کی شاعری ..... کی ہے .....''۔

(3) وہ لمحاتی اور وقتی شاعری تھی اور اس قسم کی شاعری کی افادیت سے یکسر انکار نہیں کیا جا سکتا ..... ایک ضروری بات یہ بھی ہے کہ لمحاتی اور وقتی شاعری میں بھی اکثر ایسی لافانی چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں جو ہاید و شاید ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ میں آپ کو اقبال کے طلوع اسلام سے مثال دے کر سمجھاتا ہوں، شعر ہے۔

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے

یہ مصرع ایک وقتی ضرورت کے تحت لکھا گیا تھا لیکن اس کے ساتھ جو دوسرا مصرع آیا ہے وہ اپنے حسن اور قوت کے اعتبار سے دائمی چیز بن گیا ہے۔

کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

دوسری مثال۔ مظفر شاہجہاں پوری کے ہاں سے ..... پہلا مصرع ہے۔

اس طرف روس ادھر چین ملایا برما
اب اجالے مری دیوار تک آپہنچے ہیں

میراجی، ن م راشد اور حلقہ ارباب ذوق کے کاموں کے بارے میں سردار جعفری نے بتایا:

''میراجی جو ایک بہت پڑھے لکھے آدمی تھے اور خلاقانہ ذہن رکھتے تھے اس وقت ترقی پسندوں کے اجلاس میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے اور اسی طرح ''حلقہ'' کے اجلاس میں شرکت سے ترقی پسندوں کو کوئی عار نہ تھا۔ میراجی کا یک بہت بڑا Contribution اس عہد میں جو تھا وہ یہ تھا کہ انہوں نے مغربی ادب خصوصاً مغربی شاعری سے بہت خوبصورت ترجمے اردو میں کیے۔ ان ترجموں کی صورت میں اردو میں نئی فارم آئی، نئی ہوا آئی.....

ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ آزاد شاعری کا جو نمونہ راشد اور میراجی نے قائم کیا تھا وہ آگے چلا نہیں۔ ان کے مقابلے میں ترقی پسندوں نے بھی آزاد شاعری کی جو آج بھی چل رہی ہے.....لیکن راشد اور میراجی کی شاعری اپنی شناخت کھو چکی ہے بات یوں ہے کہ فارم بغیر فکر اچھی اور زندہ رہنے والی شاعری پیدا نہیں کر سکتی اور وقت نے اس کلیہ کو ثابت کر دیا.....

میراجی شعور اور ادراک کو ادب کے لیے غیر ضروری عنصر جانتے تھے۔ انہوں نے شعر کا تعلق شعور سے کاٹا اور یہی ہمارے اور ان کے درمیان بنیادی اختلاف رہا ہے۔ شعور کو شعر سے کاٹنے کی کوشش میں میراجی نے انتہائی گنجلک، مبہم اور بے مقصد شاعری کو فروغ دیا جس کا اثر حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ بہت سے لوگوں پر پڑا لیکن اس حلقے میں اور لوگ بھی تھے جن کے ہاں ابہام اور گنجلک فضا کو نسبتاً کم ہے لیکن مقصدیت پھر بھی عنقا رہی کیونکہ وہ لوگ ادب میں مقصدیت کے بھی قائل نہیں ہوئے تھے لیکن ان سب اعتراضات کے باوجود ہمیں اس بات کا اقرار ہے کہ حلقہ ارباب کے ساتھیوں نے اردو نظم کو فنی اعتبار سے بہت کچھ دیا ہے۔ نئی نئی فارم کے تجربے جوان لوگوں نے کیے ہیں، ترقی پسندوں نے کم کیے ہیں۔ نئی لفظیات کے سلسلہ میں بھی ان احباب کا کام زیادہ وقیع اور قابل تحسین رہا ہے۔ ان میں سب سے بڑا نام جو سامنے آیا ہے وہ ن۔م۔راشد ہیں جن کی شاعری مختلف مراحل سے گزرتی رہی.....اردو نظم میں ہیئتی تجربوں کا کام حلقۂ ارباب ذوق کے لوگوں نے خاصا کیا ہے ترقی پسندوں کے مقابلے میں''۔ 331

1857ء کو جدید ادب کا نقطۂ آغاز بتاتے ہوئے سردار جعفری نے کہا:

''ہمارے ہاں جدید ادب ایک واضح رجحان کے طور پر 1957ء کے لگ بھگ شروع ہوتا ہے اور یہ صورت حال صرف ہمارے اردو ادب میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی کم و بیش تمام بڑی زبانوں میں ایسا ہی ہوا ہے..... 1957ء کے بعد ادبی تنقید کا ایک باقاعدہ نظام کے طور پر رواج پانا.....دوسری تبدیلی جو 1857ء کے لگ بھگ ہمارے ہاں محسوس ہوتی ہے وہ ہے غزل کے تعلق سے.....غزل اپنے تمام تر کلاسیکل امکانات غالب کی شکل میں پورے کر چکی تھی اور جب میں یہ بات کہتا ہوں تو میری مراد یہ ہوتی ہے کہ غالب اپنی پیش رو غزل کی روایت کو سمیٹتے ہوئے ایک ایسا منفرد لہجہ اور صرف لہجہ ہی نہیں بلکہ انداز نظر دیتے ہیں جو اردو ادب میں قطعی نیا تھا اور جسے میں جدید ادب کے لیے ایک نقطۂ آغاز خیال کرتا ہوں''۔ 332

اقبال سے ترقی پسندوں نے کیا لیا ہے اس تعلق سے سردار جعفری نے لکھا ہے:

1)۔ہم نے اقبال سے تصور انسانیت لیا ہے اور انسانی خلاقی، انسان کی تخلیقی قوت اور انسانی ہاتھوں کی عظمت کا تصور لیا ہے ''دستِ دولت آفریں'' اقبال ہی کے ہاں آیا''۔

2)۔''پھر ہم نے اقبال کے ہاں سے نظریہ کائنات لیا ہے کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون''یعنی تخلیق کا عمل ایک جاری وساری عمل ہے۔ہر دم ایک نئی دنیا تخلیق پا رہی ہے جس میں لمحہ گزشتہ کا عکس بھی شامل ہوتا ہے تو اس طرح ادب کی تخلیق کا عمل بھی ایک مسلسل جاری وساری عمل ہے''۔

3) کلاسیکیت کی تخلیق بھی ایک مسلسل عمل ہے۔ہر دور اپنی قدریں ساتھ لاتا ہے اور اس طرح روایت کی تخلیق کا عمل بھی جاری رہتا ہے.....ترقی پسند ادب یا ترقی پسند ادیب کوئی آسمان سے نہیں اتر آیا بلکہ اس کے پیچھے روایت کا ایک عظیم سلسلہ ہے اور اب خود ترقی پسندانہ نقطۂ نظر ہماری ادبی روایت کا ایک زندہ اور فعال حصہ بن چکا ہے.....میں روایت کو ایک جاری وساری عمل سمجھتا ہوں۔آج جو ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ کل روایت کا حصہ بن جائے گا بشرط یہ کہ اس میں زندہ رہنے کی قوت ہوئی ورنہ اپنا وقتی کردار ادا کر کے ختم ہو جائے گا''۔

4)۔''ہم نے اقبال سے آہنگ بھی لیا ہے.....اقبال کے آہنگ سے کوئی باشعور شاعر بچا ہی نہیں۔وہ بھی جو مخالفین تھے وہ بھی نہیں بچے کیوں کہ میں اقبال کے آہنگ کو بیسویں صدی کا آہنگ سمجھتا ہوں اور بیسویں صدی دراصل اقبال کی صدی ہے''۔

5)۔''نظم جدید کی جو عظیم الشان عمارت اقبال اور جوش نے تعمیر کر دی تھی وہ ترقی پسندوں تک پہنچتی ہے اور ترقی پسند شعرا نے اس کو نہ صرف استحکام دیا ہے بلکہ مقدور بھر اسے آگے بڑھانے کا فریضہ بھی ادا کیا۔333

اقبال پر علی سردار جعفری کے مطالعے پر قمر رئیس نے اظہار خیال کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''جشن اقبال کے موقع پر سردار جعفری نے اقبال کے بارے میں اردو اور انگریزی میں کئی مضامین لکھے.....جعفری نے اقبال کی بین الاقوامیت پر اپنے مضامین میں خاص طور پر زور دیا ہے۔اقبال نے تیسری دنیا اور خاص کر اردو اور فارسی بولنے والی اقوام کو استعماری طاقتوں کی سازشوں سے خبردار اور بیدار ہونے کا جو پیغام دیا تھا اس کی معنویت اور ہمہ گیر اثرات کا اعتراف جعفری نے کھل کر کیا ہے''۔ 334

اعلیٰ تعلیم کی زبان کے سلسلہ میں سردار جعفری نے کہا:

''حسن عابدی نے اپنے انٹرویو میں سردار جعفری سے کہا''میرا خیال تو یہ ہے کہ درس وتدریس میں اولیت مادری زبان کو ملنی چاہیے۔جعفری صاحب نے برجستہ جواب دیا''کوئی ضروری نہیں۔ٹھیک ہے اگر کسی کو اس کی مادری زبان میں تعلیم دی جا رہی ہے تو یہ بہت اچھا ہے،لیکن اعلیٰ تعلیم کا نقصان کر کے مادری زبان کو استعمال میں لانا درست نہیں ہوگا۔میں اس سلسلے میں اپنے زمانے کے چند اعلیٰ ترین دانشوروں اور عالموں کی مثالیں پیش کروں گا جنہوں نے تعلیم اپنی مادری زبان میں نہیں بلکہ اجنبی زبانوں میں حاصل کی۔میں اور بہت سے لوگوں کے نام لے سکتا ہوں۔علامہ اقبال کی ہی مثال ہے جو ایک بڑے شاعر اور مفکر تھے لیکن ان کی ساری ذہنی نشو ونما اور روحانی تہذیب وتعلیم ان کی اپنی مادری زبان میں نہیں بلکہ فارسی،عربی اور بعد ازاں انگریزی میں ہوئی''۔ 335

ادیب وشاعر کی تخلیقات میں تکرار کے بارے میں سردار نے کہا:

حسن عابدی نے اپنے انٹرویو میں سردار جعفری سے سوال کیا "کیا یہ درست ہے کہ برصغیر میں جدیدیت کی تحریک کو فروغ اس لیے حاصل ہوا کہ ترقی پسند ادیب اور شاعر اپنے آپ کو دہرانے لگے تھے" سردار جعفری نے زور دے کر کہا "ہرگز نہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ تکرار، ایک تخلیقی ذہن کی خصوصیت ہے۔ اردو غزل کی ہی مثال موجود ہے، جس میں کوئی دو صدیوں سے تشبیہات اور استعارے دہرائے جاتے رہے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ علامہ اقبال سے زیادہ کسی اور شاعر نے اپنے آپ کو دہرایا ہوگا۔ علامہ اقبال نے فلسفہ خودی پر کس قدر زور دیا اور پھر اپنے اشعار میں فلسفہ خودی کو مختلف پیرایوں سے برابر پیش کرتے رہے۔ اس کے باوجود اقبال کی عظمت سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ 336

7/جون 1991ء کو لیے گئے انٹرویو میں حسن عابدی نے سردار جعفری سے سوال کیا "آپ کے ایک مجموعے کا نام ہی "ایک خواب اور" ہے۔ کیا آپ ہمیں یہ بتائیں گے کہ آیا آپ کے کسی خواب نے حقیقت کا قالب اختیار کیا؟

سردار جعفری نے جواب دیا "ایک بھی نہیں۔ خواب کبھی پورے نہیں ہوتے۔ پیغمبروں کے خواب بھی کبھی پورے نہیں ہوئے لیکن اصل بات یہ ہے کہ آدمی کو خواب دیکھتے رہنا چاہئے۔ اس سے انسانی زندگی میں بہتری کی صورت نکلتی ہے۔ اگر تمہارے کچھ خواب ہیں۔ زندگی میں کچھ مقاصد ہیں تو انھیں تازہ رکھو اور ان کے حصول کی جدوجہد کرتے رہو۔ خواب تمہیں پیہم جدوجہد پر آمادہ رکھتے ہیں۔ ان سے تمہاری تحریروں میں ایک گہرا جمالیاتی احساس پیدا ہوگا۔

سردار جعفری نے اپنے مجموعے "ایک خواب اور" کے دیباچے میں لکھا ہے:

خواب اور شکست خواب اس دور کا مقدر ہے اور نئے خواب دیکھنا انسان کا ایک ایسا حق ہے جس سے کوئی طاقت کوئی اقتدار اسے محروم نہیں کرسکتا اور شاید یہی انسان اور انسانیت کے مستقبل کی ضمانت ہے۔ 337

ادیبوں کی باہم ملاقاتوں اور انجمنوں کی ضرورت اجاگر کرتے ہوئے سردار جعفری نے کہا:

حسن عابدی نے اپنے انٹرویو میں سردار جعفری سے سوال کیا "ترقی پسند تحریک، برصغیر پاک و ہند میں نصب صدی پرانی ہے اور ادیبوں اور مفکروں میں ترقی پسندانہ افکار بہت مقبول ہیں۔ ایسے میں کیا ترقی پسند مصنفوں کی انجمن کی ضرورت باقی رہتی ہے؟ جعفری صاحب نے جواب دیا "جی ہاں۔ ایسی کسی انجمن کی موجودگی کی ضرورت بہر حال رہتی ہے۔ ادیبوں کو مسائل پر غور و بحث کرنے کے لیے اور تبادلۂ افکار کے لیے ملتے رہنا چاہئے۔ 338

سردار جعفری نے ادب میں آمریت کی گنجائش کے نہ ہونے کی بات کی ہے۔

آمریت دنیا میں چاہے جہاں بھی اپنی گرفت قائم کرے لیکن ادب میں آمریت نہیں چلتی۔

جلد یا بدیر اسے بہر طور ختم کرنا ہوگا۔ 339

ادب میں سوشلزم کے روشن مستقبل کے بارے میں سردار جعفری کہتے ہیں:

معاشرے میں جب تک نابرابری اور بے انصافی موجود رہے گی، سوشلزم کا خواب ایک زندہ حقیقت کے طور پر باقی رہے گا، اور ادب میں اس خواب کی تعبیر کے لیے اپنی مدد فراہم کرتا رہے گا۔ 340

ترقی پسندوں اور غیر ترقی پسندوں میں فرق کرتے ہوئے سردار جعفری نے بتایا ہے:

ایک بات جو ہم ترقی پسندوں کو غیر ترقی پسندوں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ ہم فن، حسن اور افادیت تینوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں، ہمارے ہاتھوں یہ تینوں قدریں کسی کامیاب فن پارے کے ضروری اجزاء ہیں جب کہ ان کے ہاں فن اور حسن کاری پر اصرار تو ہے لیکن افادیت کی آمیزش کو نہ صرف غیر قانونی جانتے ہیں بلکہ اسے مہلک تک کہتے رہے ہیں اور یہی ہمارا اور انکا بنیادی اختلاف رہا ہے۔341

ڈاکٹر اسلم پرویز نے سردار جعفری کے ہاں کمٹ منٹ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

جہاں تک کمٹ منٹ کی بات ہے ادب ہو یا زندگی ہر شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر کسی نہ کسی طرح کی اقدار سے وابستہ ہوتا ہے۔ محض زندگی کی حد تک یہ اقدار اچھی بری کسی بھی طرح کی ہو سکتی ہیں لیکن ادب میں عام طور پر صالح اقدار ہی کا علم بلند کیا جاتا ہے۔ غیر شعوری طور پر ادیب کا کسی نہ کسی نوعیت کا کمٹمنٹ ہوتا ہے اس لیے ادب پر بہر حال زندگی کا عکس ہوتا ہے اور یہ عکاسی ادیب کے ہاں کسی نظام قدر کے حوالے سے ہوتی ہے۔ زندگی کے واضح نظریات اور فلسفے کی صورت میں یہ کمٹ منٹ شعوری ہو جاتا ہے جو کبھی کبھی hyperbole کی شکل بھی اختیار لیتا ہے۔ یہ صورتحال سردار جعفری کے ہاں بیشتر جگہوں پر دیکھنے کو ملتی ہے۔342

اوائل 1966 میں احمد جلیس سے بات چیت کرتے ہوئے سردار جعفری نے تخلیق کار اور قاری کے رشتہ پر روشنی ڈالی۔

حالی، سرسید اور شبلی کو اس قدر مقبولیت اس لیے حاصل رہی ہے کہ ان کی آواز عوام پہچانتے تھے اور خود وہ اپنے عوام سے اچھی طرح متعارف تھے، پھر جب ہم لوگ آئے تو ہمارے سامنے بھی قارئین موجود تھے۔ ہم ان کے دکھ درد اور ان کے مطالبوں سے واقف تھے۔ ہر زمانے میں شعر و ادب کی مقبولیت کا سبب یہی رہا ہے کہ ادیب اور قاری ایک دوسرے سے قریب رہے۔ آج سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ آج کل کے لکھنے والوں کے سامنے ان کا مخاطب متعین اور واضح نہیں ہے۔ 343

عظمیٰ ناز سے ایک ملاقات میں سردار جعفری نے شاعر کے فرائض اور معاشرے کو دین کے تعلق سے کہا:

شاعر دراصل معاشرے کا ضمیر ہوتا ہے اور ان ساری کیفیات کو جو سارا معاشرہ دیکھتا ہے ان کو لفظوں کے پیکر دے کر ان کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ دوسری چیز یہ کہ شاعر احساس جمال کو عام کرتا ہے اور اس طرح اپنے معاشرے کو زبان بنانے میں مدد دیتا ہے۔ وہ معاشرے کے لیے صرف خیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کاروبار سے زندگی کی سخت جدوجہد سے محنت و مشقت سے تھک جانے کے بعد روحانی سکون اور بالیدگی کے لیے شاعری ضروری ہے اور اس عمل میں شاعر نیکی اور بدی میں تمیز کرتا ہے، خواہ وہ ذاتی ہو یا اجتماعی، سیاسی ہو یا غیر سیاسی اور اس طرح انسانوں کو جینے کا سلیقہ عطا کرتا ہے۔ معاشرے سے الگ ہو کر اور بے نیاز ہو کر وہ شاعری نہیں کر سکتا وہ ایک حد تک معاشرے کا مقروض ہوتا ہے۔ زبان کا خالق نہیں ہوتا وہ اسے معاشرے سے ملتی ہے لیکن وہ زبان کا معمار ہوتا ہے۔344

آزاد شاعری کے تعلق سے سردار جعفری کہتے ہیں:

ہمارے یہاں پابند شاعری زیادہ تر غزل کی نہج پر ہے پورا پورا خیال دو مصرعوں میں ادا ہو جاتا ہے اور اس میں قافیے اور ردیف کی جھنکار بہت مدد دیتی ہے۔ مقبولیت کے لئے بھی اور اثر آفرینی کے لیے بھی! آزاد شاعری میں مصرعوں کی تعمیر ایک

پورے بند کی تعمیر ہوتی ہے اور خیال پورے چار چار، پانچ پانچ مصروں میں مکمل ہوتا ہے۔اس طرح مسلسل فکر اور خیال کا ارتقاء ساتھ ساتھ چلتا ہے۔آزاد شاعری کے اندر ایک اندرونی آہنگ کی ضرورت پڑتی ہے اور شعری تشبیہیں اور پیکر تراشی کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔مثلاً میری ایک نظم ہے "نیند" جو میں نے جیل میں کہی تھی، اس میں رات کا سراپا ہے۔وہ اس طرح کہ۔

رات خوب صورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی
شب کی شوخ دوشیزہ
خاردار تاروں کو
آہنی حصاروں کو
پار کر کے آئی ہے
بھر کے اپنے دامن میں
جنگلوں کی خوشبو اور
ٹھنڈکیں پہاڑوں کی
میرے پاس لائی ہے
نیل گوں جوان سینہ
نیل گوں جواں بانہیں
کہکشاں کی پیشانی
نیم چاند کا جوڑا
مخملیں اندھیرے کا
پیرہن لرزتا ہے
وقت کی سیہ زلفیں
خامشی کے شانوں پر
خم بہ خم مہکتی ہیں
اور زمین کے ہونٹوں پر
نرم شبنمی بوسے
موتیے کے دانتوں سے
کھلکھلا کے ہنستے ہیں

آزاد نظم کہنا زیادہ مشکل کام ہے کیوں کہ ہماری ادبی تاریخ میں اس کی کوئی روایت نہیں ہے۔345

عظمیٰ ناز سے اسی ملاقات میں سردار جعفری نے نو جذبات "نورس" کے بارے میں بتایا:

جو بنیادی جذبات ہیں وہ گنے ہوئے تو جذبات ہیں۔اس کو ہندوستان میں "نورس" کہا جاتا ہے نفرت، محبت، غصہ، شجاعت، رحم وغیرہ اور ساری شاعری انھیں جذبات میں ہوتی ہے۔شاعری بھی انھیں نو جذبات کے پس منظر اور پیش نظر سے منتج ہے، کہی اور لکھی جاتی ہے۔346

سردار جعفری نے اچھی شاعری کے لیے جن چیزوں کی اہمیت بتلائی ان میں عقیدت بھی شامل ہے۔انھوں نے کہا اچھی شاعری کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ شاعر اپنے عہد کے مسائل سے بخوبی واقفیت رکھتا ہو کیونکہ ان سے بے نیاز ہو کر کوئی شاعری نہیں کی جا سکتی۔شاعری کے لیے یہ بھی ضروری ہے ک ہشاعر اپنے عہد کے انسانوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو سن سکے۔ محسوس کر سکے اور ان سے بات ان کی زبان میں کر سکے۔وہی زبان جو عوام بولتے ہیں۔شاعر جب ان کے مسائل کو تخلیقی شکل دیتا ہے تو اس تخلیقی کیفیت کے کارن ان کے شعری پیکر بن جاتے ہیں۔تشبیہیں اور استعارے آجاتے ہیں۔یہ جتنے سلیس اور عام فہم ہو سکتے ہیں اتنے ہی زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔شعر کی سچائی خود بخود سامنے آجاتی ہے شاعر کائنات کے سمندر کا ایک قطرہ ہے جو اپنے اندر اس سمندر کو سمیٹے ہوئے ہے۔یہ سب چیزیں جن سے مل کر اچھی شاعری منتج ہے۔یہ سارا مواد ہے اور اس کو تخلیقی پیکر شاعر جو پیدا کرتا ہے اور اس میں اپنی ذات کا اضافہ کر دیتا ہے اور ذات کا یہ اضافہ ہی شاعری کو بہتر اور کمتر بناتا ہے اور شاعری کو خوبصورت بناتا ہے۔کمزور تخلیق کے شاعر کا شعر کمتر ہو جائے گا اور بہتر شاعر کا شعر بہتر اور خوب صورت ہوگا۔347

بڑی شاعری:

سردار جعفری نے بڑی شاعری کے سلسلہ میں لکھا ہے:

میں بڑی شاعری کے لیے تین چار چیزیں استعمال کرتا ہوں، سہولت اظہار، (فارسی کے اعتبار سے یہ ترکیب غلط ہے لیکن میں استعمال کرنا چاہتا ہوں اس کے ساتھ 2 ندرت اظہار کہ جو تخئیل کی کارفرمائی ہے اور اس کے بعد 3 عظمت اظہار، جو فکر کی کارفرمائی ہے۔اس کی وجہ سے اس میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔

سردار جعفری کی تنقید نگاری اور اسلوب پر دوسرے نقادوں کی آراء:

متعدد نقادوں اور ادیبوں نے سردار جعفری کی تنقید نگاری اور ان کی تنقید کے اسلوب کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ ذیل میں چند نقادوں اور ادیبوں کی آراء پیش کی جا رہی ہیں۔

ملاحظہ کیجیے:

ڈاکٹر انیس اشفاق نے سردار جعفری کے تنقیدی اصولوں اور زاویوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

ہم تو صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ سردار اپنے سیاسی اور سماجی معتقدات کی بناء پر اپنے زمانے کے ادب سے کس نوع کے تخلیقی جوہر کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس جوہر کا مطالبہ کرنے کی غرض سے انھوں نے ادب کو پرکھنے کے لیے جو اصول مقرر کیے ہیں کیا وہ ان کے زمانے کے اعتبار سے اپنا کوئی جواز رکھتے ہیں اور کیا ان کے معاصرین میں کسی دوسرے شخص نے اتنے

گہرے ادبی اور سماجی شعور کے ساتھ اتنی منظم اور مرتب شعریات وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔

(ڈاکٹر انیس اشفاق، سردار جعفری کی شعریات، مشمولہ علی سردار جعفری:

ایک مطالعہ، گجرات اردو ساہتیہ اکادمی ص 115-114

سردار جعفری کی شعریات کی اصل روح کے اجزاء کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر انیس اشفاق لکھتے ہیں :

1۔ترقی پسند تحریک ادب کو تاریخ کی حرکت اور سماج کی جنبش کے ساتھ دیکھتی ہے اور ادب کو بھی تاریخ کی جنبش اور سماج کا آلہ کار سمجھتی ہے یعنی یہ تحریک مادی، تاریخی اور عمرانی نقطہ نظر سے ادب کا جائزہ لیتی ہے۔

2۔ترقی پسند ادب کا تعلق چوں کہ مقصدی اور عوامی ادب سے ہے اور اس کے مخاطب چوں کہ مزدور، کسان اور نچلے طبقے کے لوگ ہیں اس لیے ادب کی زبان آسان، عام فہم، انداز بیان سیدھا سادھا اور پر جوش، ہیئت خوبصورت اور معنویت سے بھرپور ہونا چاہئے۔

3۔چونکہ موضوع پہلے بدلتا ہے اور ہیئت بعد میں، اس اعتبار سے موضوع کو ہیئت پر اولیت حاصل ہے کیوں کہ ہیئت موضوع کے اظہار کی شکل ہوتی ہے۔

4۔اقبال بلاشبہ اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں لیکن ان کی عظمت کا راز ان ترقی پسند اور مفید عناصر میں ہے جو باقی رہ جائیں گے۔(باقی تاریخ اور وقت کے طاق نسیاں میں رکھ دیئے جائیں گے)

5۔بہ زبان گور کی حقیقت نگاری کا مطلب ہے عوام کی زندگی اور ان کے حالات کی سچی اور ملمع کاری سے پاک تصویر کشی اور رومانیت سے مراد وہ انقلابی احساس ہے جو انسان کو زندہ رہنے کی خواہش کو تقویت پہنچائے اور اسے حقیقت اور اس کے مسائل کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کرے۔

اس کے بعد ڈاکٹر انیس اشفاق لکھتے ہیں:

سردار جعفری نے انھیں اصول و نظریات کی روشنی میں ادب کو دیکھا اور انھیں اصولوں کی رہنمائی میں ادب کی تخلیق کا مطالبہ کیا۔انھوں نے ترقی پسند ادب کو پرکھنے کے لیے شروع سے جس نقطہ نگاہ کو مناسب اور جس طریقہ کار کو موزوں سمجھا، آخر تک وہ اس پر قائم رہے۔

2۔لیکن ان کی شعریات سازی کا مطالعہ کرتے وقت ہم پر ایک اور انکشاف بھی ہوتا ہے۔ جب وہ دلیلوں سے اپنے مباحث کی وضاحت کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے موقف کی مجبوری کی وجہ سے بعض ایسے حقائق سے چشم پوشی کر رہے ہیں جنھیں ان کا آفاقی شعور تسلیم کر لینے پر مائل کر رہا ہے۔ جب وہ میر، غالب اور پریم چند وغیرہ پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کے مطلوبہ عناصر کے علاوہ ہمیں دوسرے ادبی اور شعری زاویے بھی روشن ہوتے ہوئے معلوم ہونے لگتے ہیں لیکن ایسے موقعوں پر سردار جعفری اپنے مباحث اور نتائج کے آئینہ کا رخ بدل دیتے ہیں اور ہمیں پھر وہی عکس نظر آنے لگتا ہے جو انھیں اس آئینے سے مطلوب ہے۔ وہ متقدمین کا مطالعہ کریں یا معاصرین کا محاکمہ، اس عمل میں وہ اپنے موقف سے ہٹ کر دوسرے امکانات کی جستجو کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں یعنی وہ جس قلم سے اپنا میر، اپنا غالب اور اپنا اقبال تراش کر سامنے لاتے ہیں، اسی

قلم سے وہ ہمارا میر، ہمارا غالب اور ہمارا اقبال بھی سامنے لاسکتے ہیں لیکن مادی، تاریخی اور عمرانی اقدار پر ایمان رکھنے والا ان کا ادبی مسلک انھیں ایسا کرنے سے باز رکھتا ہے۔ یہی نہیں وہ اپنی شعریات کو نافذ کرنے کے سلسلے میں اتنے حساس ہین کہ انھیں ہر موقع پر اپنے موقف کی تائید اور تکرار ضروری معلوم ہوتی ہے۔

3۔ اقبال پر گفتگو کرتے ہوئے بھی وہ اسی عمل کو دہراتے ہیں ایک طرف وہ اقبال کی ہمہ گیری اور وسعت کے قائل ہیں اور دوسری طرف وہ ان کی شاعری میں صرف ترقی پسند اور مفید عناصر کے باقی رہ جانے کی بات کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اقبال کی وسعت اور ہمہ گیری میں وہ عناصر بھی شامل ہیں جن کا اعتراف سردار اپنے موقف کے باطل ہو جانے کے خوف سے نہیں کرتے لیکن اس موقف پر سختی سے قائم رہنے کے باوجود کبھی کبھی سردار اس راہ پر نکل ہی آتے ہیں جس کی طرف وہ جان بوجھ کر آنا نہیں چاہتے۔

4۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ سردار کی مختلف الجہات ادبی شخصیت میں نتائج اخذ کرنے کی وہ صلاحیت موجود ہے جو ان کی اصل شعریات کے علاوہ ایک اور شعریات بھی مرتب کرسکتی ہے۔ ایک ایسی شعریات جو ان کے نظریات پر یقین نہ رکھنے والوں کے لیے بھی قابل قبول ہو لیکن اپنے سماجی نقطہ نظر کی بندش کی بنا پر انہوں نے وہ شعریات مرتب کیں جو ان کے عہد کے ادبی اور سماجی تقاضوں کے عین مطابق تھی اور جس کا مرتب کرنا ان کا سماجی فریضہ تھا۔

5۔ سردار نے اپنی شعریات مرتب کرتے وقت اسی نکتے کو نگاہ میں رکھا تھا کہ ان سے پہلے کے اصول و نظریات ان کے ادب کی تفہیم و توسیع کے لیے بے معنی ہو چکے ہیں۔ ادب کے نئے تقاضوں کے پیش نظر نئی تنقید نے سردار کی اصول سازی پر سوالیہ نشان قائم کیا اور اب ادب کے نئے منظر نامے کی روشنی میں نئی تنقید کے نظریوں پر نظر ثانی کی جارہی ہے۔ گویا ادب کے مخصوص مطالبوں کی بناء پر ایک عہد کی وضع کی ہوئی شعریات کی تبدیلی کا عمل جاری رہتا ہے۔ سردار نے حرف آخر میں اس عمل کی طرف اشارہ بھی کیا ہے اور اپنی شعریات سے اختلاف کے دروازے کھلے رکھے ہین۔ اپنی گفتگو ختم کرتے کرتے انھوں نے لکھا ہے کہ ''نقطہ نظر جتنا حقیقت پسندانہ ہوگا اتنا ہی صحیح ہوگا اور سردار کے عہد کے سماجی مطالبوں کے اعتبار سے ان کا نقطۂ نظر جتنا حقیقت پسند ہے واقعی وہ اتنا صحیح بھی ہے اور یہی سردار کی شعریات کا کمال ہے۔ 348

ڈاکٹر سید محمود الحسن رقمطراز ہیں:

''کسی شاعر و ادیب کے فن کا تجزیہ کرتے ہوئے سردار جعفری نے نفسیاتی تنقید کے پہلوؤں کی طرف بہت کم جگہوں پر اشارہ کیا ہے۔ خاص کر عملی تنقید کی طرف ان کی توجہ بہت کم رہی ہے۔ ان کا تنقیدی سرمایہ زیادہ تر اسی مقصد کی غمازی کرتا ہے کہ وہ ترقی پسند نظریات کی وضاحت کر کے انھیں اصولوں کی روشنی میں فنی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیں اور اپنے اس مقصد میں وہ ہر جگہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ چنانچہ شاعری و ادب میں ان کے پیش نظر یہی رہا ہے کہ وہ کہاں تک اپنے سماجی مسائل کی ترجمان ہے۔ کہاں تک اس میں زندگی کے مقاصد شامل ہیں اور کہاں تک اس میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ زندگی کو آگے بڑھانے میں مدد دے سکتی ہے اور ان مبادیات کی روشنی میں سردار جعفری نے ادبی تخلیق کا جو تجزیہ کیا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ 349

سردار جعفری کی تنقید نگاری کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) پہلا دور:

ابتداء اور اس کے بعد بیس پچیس برس

(۲) دوسرا دور:

ترقی پسند تحریک کی نصف صدی (مصنف سردار جعفری) کی اشاعت دوم (1957) کے بعد یعنی بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے آغاز سے ان کی وفات (2009) تک۔ اس دور میں سردار جعفری کی تصانیف پیغمبران سخن اور اقبال شناسی اور اردو اور انگریزی میں شائع شدہ تنقیدی مضامین اور ان کا لیکچر ترقی پسند تحریک کی نصف صدی جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

ادوار کی تقسیم کا جواز یہ ہے کہ سردار جعفری کی ایک ہی موضوع پر لکھی گئی دو کتابوں "ترقی پسند ادب اور (2) ترقی پسند تحریک کی نصب صدی کا موازنہ کریں تو دونوں کے درمیان سردار جعفری کے تنقیدی رویے کا نمایاں فرق نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر اسلم پرویز نے بڑے فن کار کے ہاں تضادات کو تبدیلی قرار دیتے ہوئے وضاحت کی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

ہر بڑے فن کار کے ہاں تضادات کا ہونا ایک لازمی سی بات ہے۔ آپ جتنا زیادہ لکھیں گے، جتنا طرح طرح کا لکھیں گے جتنے طویل عرصے تک لکھتے رہیں گے اس میں آپ کے ہاں تضادات رونما ہونے کے امکانات وخدشات اسی قدر زیادہ ہوں گے۔ سردار جعفری کا میدان شاعری کے علاوہ تنقید، صحافت، مکتوب نگاری، رپورتاژ نگار، تقریریں، مباحث، ریڈیو، ٹی وی، فلم سبھی کچھ رہے ہیں۔ ان تمام شعبوں میں فکر کی یکسانیت کا مظاہرہ یوں بھی اسٹیریو یونائپ ہو جاتا ہے۔ پھر تضاد تکرار سے بہتر ہے کہ یہ تبدیلی کی علامت ہے۔ ان کے ہاں گفتگو کا سلسلہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ 350

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے سردار جعفری کی تنقید کے پہلے دور پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

(1) سردار جعفری کے پہلے دور کی تقریباً تمام تنقیدی تحریریں "ترقی پسند ادب" (مصنف سردار جعفری) میں شامل تصورات کا واضح عکس معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے ان تحریروں میں ان کا ناقدانہ کردار انفرادی ہونے سے کہیں زیادہ تحریک کی مدافعت یا وکالت کا تنظیمی انداز لیے ہوئے ہے۔ جب تنقید دفاع یا وکالت کا فریضہ انجام دیتی ہے تو اس کو سب سے پہلے معروضیت اور غیر جانبداری سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ ان کے دور اول کی تنقیدی تحریروں میں کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ انھوں نے انفرادی انداز میں تعین قدر کرنے کے بجائے اپنی تنقید میں اجتماعی اور سیاسی قدروں پر زور دیا، پرانی شعری، حتی کہ اخلاقی اقدار کو سامنتی اقدار سے تعبیر کیا، ادب کی ماہیت کو اس کی افادیت پر قربان کیا اور اپنے ادبی سرمایے کے بارے میں جانبدارانہ تنظیمی نوعیت کے فیصلے صادر کیے اور اس ضمن میں ان کا عام رویہ پرانے اسالیب پر تنقید اور نئے اسالیب کی تقلیل کا رہا مگر تضاد کی صورت وہاں نمایاں ہوتی ہے جب وہ اس عمومی رویے کے باوجود ابتدائی تحریروں میں نئی ہیتی تبدیلی اور تجربے کو بھی ہدف تنقید بناتے ہیں۔ انھوں نے نظم کی آزاد ہیئت یا بلینک ورس کو اردو ادب کے دامن پر بدنما دھبہ قرار دیا تھا۔

(2) سردار جعفری، ادب کی ماہیت کا تعین کیوں کر کرتے ہیں اور ترقی پسند شعریات کے لازمی عناصر کن چیزوں کو شمار کرتے ہیں، اس کا ایک خاکہ مندرجہ ذیل بیانات سے مرتب کیا جا سکتا ہے۔

(i) میرے نقطہ نگاہ کی بنیاد یہ ہے کہ وہ کسی داخلی تعصب کے بجائے مادی، تاریخی اور عمرانی حقائق پر مبنی ہے۔

(ii) جو لوگ جمالیاتی ذوق کو وجدانی، داخلی اور بالکل انفرادی سمجھتے ہیں وہ خیال پرستی، تصوریت، عینیت اور مادرائیت کے مرتکب ہوتے ہیں اور شعوری یا غیر شعوری طور سے رجعت پرستی کے لیے راستے کھولتے ہیں جن کے پیچ و خم بظاہر کتنے ہی حسین کیوں نہ ہوں بہر حال ہوتے ہیں خطرناک۔

(iii) ہر دور کا عظیم ادب وہی ہے جس میں عوامی سچائی اور عوامی قدریں ہیں۔

(iv) آج ترقی پسند ادیبوں کے سامنے بنیادی سوال عوامی ادب کی تخلیق کا سوال ہے۔ دنیا کا بہترین ادب ہمیشہ عوامی رہا ہے۔ عوامی قدروں کے بغیر ادب کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔

(v) اگر تجزیہ کیا جائے تو آخر میں ہر حسین چیز انسان کے مفاد سے وابستہ نظر آئے گی۔ جو چیز مفید نہیں وہ حسین نہیں ہو سکتی۔

(vi) اردو کی پرانی غزل جو اپنا رشتہ عوام سے نہیں جوڑ سکی اس کے بھی شاہکار اپنے عہد کی ایک دل دوز تنقید ہیں، خواہ ان کی لے میں میر کے سوز و گداز، تڑپ اور ٹیس ہو، خواہ غالب کا نشاط انگیز حزن و ملال۔

ان بیانات میں سردار جعفری ایک آزاد قاری یا تنقید نگار کے بجائے ایک مخصوص تنظیم کے ترجمان اور مبلغ نظر آتے ہیں۔ یوں تو سردار جعفری نے ترقی پسند ادب کے پیش لفظ میں لکھا تھا کہ میری کتاب کا موضوع صرف نظریاتی مباحث اور ترقی پسند تحریک کے محرکات اور رجحانات تک محدود ہے۔ اس لیے بیشتر ادیبوں اور ان کی تخلیقات کا ذکر صرف حوالوں اور مثالوں کی شکل میں آیا ہے لیکن جب وہ (سردار جعفری) ادیبوں اور شاعروں کا انفرادی جائزہ لیتے ہیں تو ان کی رائے تجزیاتی سے زیادہ مفتیانہ اور ضمنی سے زیادہ بنیادی نوعیت اختیار کر لیتی ہے۔ ترقی پسند ادب میں راشد، اختر الایمان، حتی کہ فیض اور مخدوم پر جس طرح کے اعتراضات کیے گئے ہیں یا منٹو اور عصمت چغتائی کے بارے میں جس طرح کی رائے کا اظہار کیا گیا ہے، ان کو خود ترقی پسند حلقوں میں قبول نہیں کیا جا سکا اور ان ادیبوں اور شاعروں کی فنی اور جمالیاتی قدروں نے اس طرح کی کسی رائے کو رائج ہونے کا موقع نہیں دیا۔

ترقی پسند ادب کے ساتھ سردار جعفری کی تنقید نگاری کا ایک دور ختم ہوتا ہے۔351

ابوالکلام قاسمی نے سردار جعفری کی تنقید کے دوسرے دور پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

سردار جعفری کے پرانے فیصلوں سے انحراف اور بدلی ہوئی صورت حال میں تنقید نگار کی حیثیت سے اپنے جواز کی صورتیں صحیح معنوں میں ان کی دو کتابوں پیغمبران سخن اور اقبال شناسی میں نظر آتی ہیں۔ ان تحریروں میں مصنف کا زاویہ نظر نسبتاً لچکدار قدرے معروضی اور ادبی اقدار سے ہم آہنگ ہے۔ پیغمبران سخن، دراصل کبیر، میر اور غالب کے انتخابات کے تنقیدی مقدمات پر مشتمل ہے جن مین ان تینوں شاعروں کو ہندوستانی سماج کی مخصوص صورت حال اور ادبی روایات کے تناظر میں

سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ترقی پسند ادب میں انھوں نے تصوف کو بے وقت کی راگنی قرار دیا تھا اور ان کا خیال تھا کہ تصوف میں عوامی بھلائی کا کوئی تصور نہیں ملتا۔مگر جب وہ کبیر یا میر کے حوالے سے تصوف اور بھگتی پر گفتگو کرتے ہیں تو تصوف، قرون وسطیٰ کی ایک اہم اور ہمہ گیر تحریک نظر آتا ہے۔انکا خیال ہے کہ ''جدید عہد کی سیاسی، انقلابی تحریکوں کو قرون وسطیٰ کی انقلابی فکر سے رشتہ جوڑنا چاہیے۔اس منزل میں صوفیوں اور بھگتوں کی روایتوں کے ساتھ کبیر، میر، اور غالب ہمارے لیے اہم ہیں۔ سردار جعفری کی اس فکر میں تبدیلی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری کی روایات کے تئیں رویے میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ ایک طرف ادب فہمی کے معاملے میں سردار کی ان کے پختہ کاری کا پتہ چلتا ہے وہیں اس بات کا بھی اندازہ ان کے پہلے دور کی تنقید میں شاعری کی تہ داری، تفہیم اور ہمہ گیری سے صرف نظر کرنے کا انداز صحیح معنوں میں ان کے مزاج سے زیادہ تنظیمی ضرورتوں کا تابع تھا۔پیغمبران سخن کی طرح سردار جفری نے اقبال شناسی کے مضامین میں بھی اپنی پختہ کار اور تجزیاتی تنقیدی صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔سردار جعفری کی تنقیدی فکر اور نقاد کی حیثیت سے ان کے تغیر پذیر تنقیدی شعور کی روشنی میں اگر یہ بات کہی جائے تو غلط نہ ہوگی کہ ان کی ابتدائی زمانے کی تنقید دراصل ترقی پسند جمالیات کی ترتیب وتدوین کے باعث قابل قدر ہے اور قدرے بعد کی تنقیدی تحریرون میں انھوں نے شعر وادب کے محاسن و معائب کو ایک کہنہ مشق نقاد کی حیثیت سے دیکھا ہے اور یہی تنقید ان کے تنقیدی رویوں کی معراج ہے۔

ان کی (سردار جعفری) ناقدانہ فکر کے ارتقا اور تبدیلی کا سلسلہ پیغمبرانہ سخن کے ابتدائی صفحات سے شروع ہو جاتا ہے۔

شافع قدوائی نے لکھا ہے:

ترقی پسند ادب کی حد تک تو سردار جعفری کا تنقیدی نقطہ نظر خاصہ محدود اور یک رخا محسوس ہوتا ہے مگر پیغمبران سخن میں شامل دیباچوں اور بعض دیگر مضامین کے مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے کہ سردار جعفری کے تنقیدی نقطہ نظر میں خاصی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔353

سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' اور اس سے قبل کی تحریروں پر تنقید نگاری کا تقابل بعد میں لکھی گئیں، ان کی کتابیں پیغمبران سخن اور اقبال شناسی سے عمر رضا نے کیا ہے اور دونوں کے فرق کی وضاحت کی ہے۔

ملاحظہ کیجیے:

ترقی پسند ادب اور اس سے قبل کی تحریروں میں سردار کی تنقید نگاری:

1۔ترقی پسند ادب سردار جعفری کی پہلی باقاعدہ تنقیدی کتاب ہے جو 1951ء میں شائع ہوئی۔

2۔(i) اس زمانے میں سردار جعفری ادب کو محض مقصدی اور افادی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے۔

(ii) سردار جعفری نے ترقی پسند ادب میں جو جائزہ لیا ہے وہ ان کے اپنے نقطۂ نگاہ سے لیا ہے جس کی بنیاد مادی، تاریخی اور عمرانی حقائق پر ہے۔انہوں نے وضاحت بھی کی کہ ان کی ذاتی رائے کو پوری تحریک کی رائے نہیں سمجھنا چاہیے۔

(iii) سردار جعفری نے ادبی، فنی اور جمالیاتی ضرورتوں کو قدرے نظر انداز کرتے ہوئے سماجی، معاشی، اور سیاسی ذمہ

داریوں کی طرف توجہ مرکوز کی ہے۔

3۔(i) ترقی پسند ادب اور اس سے قبل کی تحریروں میں انہوں نے تصوف کو جاگیر دارانہ معاشرے کی فرسودہ اقدار اور مابعدالطبیعاتی حوالوں کے باعث وجدان اور درون بینی کا زائیدہ کہا ہے۔

(ii) ترقی پسند ادب میں سردار جعفری نے لکھا ہے درویشی اور قلندری، شاہ پرستی اور انفرادیت پرستی، تجدید مذہب اور احیائیت اور تصوف ہمارے کام کی چیزیں نہیں ہیں کیوں کہ ان سے آج عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

4۔ترقی پسند ادب میں بولی ٹھولی اور عوامی زبان کو شاعری کے لیے آئیڈیل قرار دیا ہے۔

5)۔غالب کے معاملے میں سردار جعفری نے شروع ہی سے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا ہے اور غالب کو ہندوستان اور یونانی فلسفے کی روایت کے ساتھ غیر عوامی لسانی ساخت کے وسیلے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔اس سلسلے میں امیجری اور حرکی پیکروں کی تخلیق اور حواس کو متحرک کرنے والی لفظیات اور تراکیب کا انہوں نے جس طرح جائزہ لیا ہے وہ قابل ذکر ہے کیوں کہ اس رائے میں جہاں ایک طرف غالب کی رقصاں امیجری کو انہوں نے نشان زد کیا ہے وہیں اشعار سازی کو بھی اس کا لازمہ بتایا ہے۔یہ وہی اشعار سازی ہے جس کی بدولت شاعری میں پیدا ہونے والے دھندلکے اور ابہام کو سردار جعفری نے اپنی ابتدائی تحریروں میں سب سے زیادہ ہدف تنقید بنایا ہے۔

6)۔ترقی پسند ادب میں سردار جعفری نے اقبال کے شاہین کو تیمور، ابدالی، نپولین اور مسولینی کی شکل میں دیکھا ہے اور لکھا ہے کہ:

''اقبال نے اپنے شاہین کو تیمور، ابدالی، نپولین اور مسولینی کی شکل میں دیکھا تھا اور اقبال کے نزدیک پوری انسانی تاریخ ایسے ہی خودی سے سرشار افراد کے اشاروں پر چلتی ہے اور فوق البشر کی تلاش میں ہے۔یہ انفرادیت پرستی اور ہیرو پرستی خالص بورژوا تصور ہے جو اپنی آخری شکل میں فاشسٹ ڈکٹیٹر کا روپ دھار لیتا ہے اور یہ ڈکٹیٹر (شاہین) لہو گرم رکھنے کا بہانہ ڈھونڈنے کے لیے جاتا ہے تو اقبال کا انسان دوست دل تڑپ اٹھتا ہے''۔

(علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ:108)

پیغمبران سخن اور اقبال شناسی میں سردار جعفری کی تنقید نگاری:

1۔پیغمبران سخن سردار جعفری کی مرتب کردہ تین کتابوں کبیر بانی، دیون میر اور دیوان غالب کے دیباچوں پر مشتمل ہے جو 1958ء اور 1965ء کے درمیان تحریر کیے گئے تھے، بعد میں انہوں نے ان تینوں مضامین کو یکجا کر کے کتابی شکل میں پیغمبران سخن کے نام سے 1970ء میں شائع کرادیا۔

2۔پیغمبران سخن اور اقبال شناسی میں سردار جعفری کا نظری ادب قدرے معروضی اور ادبی اقدار سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

3۔اس عہد میں وہی تصوف مذکورہ شعراء کے حوالے سے عوامی اقدار کی بنیاد بن جاتا ہے اور تصوف کے عوامی پہلوؤں پر سردار جعفری نے بعض مذہبی حوالوں سے بحث کی ہے مثلاً پیغمبران سخن میں کبیر کو بھگتی تحریک کا نمائندہ اور انسان دوستی یا ہمہ گیر

عوامی اپیل کے باعث اسلامی تصوف سے قریب تر دکھایا ہے۔کبیر اور میر کے حوالے سے تصوف اور بھگتی پر گفتگو کرتے وقت سردار جعفری کو تصوف قرون وسطیٰ کی ایک اہم اور ہمہ گیر تحریک نظر آتا ہے اور لکھتے ہیں ''جدید عہد کی سیاسی، انقلابی تحریکوں کو قرون وسطیٰ کی انقلابی فکر سے رشتہ جوڑنا چاہیے''۔اس منزل میں صوفیوں اور بھگتوں کی روایتوں کے ساتھ کبیر، میر اور غالب ہمارے لیے اہم ہیں۔

4۔اس عہد میں جب وہ میر کی زبان پر گفتگو کرتے ہیں تو وہ لکھتے ہیں کہ ''میر اور ان کے ہم عصر شعرا ایک طرف عام بول چال کی زبان کو شعروں میں ڈھال کر خوبصورت اور ادبی بنا رہے تھے اور الفاظ کے نئے نئے جوڑ بٹھا کر اظہار و بیان کے لیے وسعتیں پیدا کر رہے تھے اور دوسری طرف فارسی کی ادبی روایتوں سے استفادہ کر رہے تھے اور محاوروں کا اردو ترجمہ کر کے ہندی اور ریختہ میں کھپاتے جاتے تھے۔(علی سردار جعفری، پیغمبران سخن، صفحہ 73)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اب سردار جعفری کو عام بول چال کی زبان اور اسے قبول عام کی سطح تک لانے کے لیے ترکیبوں کی تراش خراش اور مقامی زبان سے فارسی کی ہم آہنگی کی صورتوں کا بخوبی اندازہ ہو چلا تھا۔

5)۔اقبال شناسی میں سردار جعفری نے اقبال کو مسلم بیداری اور ایشیائی بیداری، ہندوستان کی بیداری، عالم انسانیت کی بیداری اور صحیح معنوں میں عالمی شاعر ثابت کیا ہے جن کی شاعری میں سامراج دشمنی کی لے شعلہ نوائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔اس کتاب کے دیباچے میں انہوں نے اقبال کے متعلق پہلے ہی یہ وضاحت کر دی ہے کہ:

''چوں کی اقبال نے اپنی شاعری میں اسلامی فکری روایات اور استعارات کا استعمال زیادہ کیا ہے اور قوم پرستی (نیشلزم) کو سیاسی سطح پر قبول نہیں کیا اس لیے بعض لوگوں نے ان پر فرقہ پرستی کا الزام لگا دیا جو اس عظیم شاعر کی توہین ہے۔اقبال کے یہاں حب الوطنی ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔ان کی شاعری میں سامراج دشمنی کی لے شعلہ نوائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کا خون بہا کی طرح ان کے اشعار میں رواں دواں ہے۔وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی ترقی کے خواہاں تھے اور انسانی تخلیقی قوتوں کے مداح اور قصیدہ خواں تھے۔ایسا شاعر فرقہ پرستی کے تنگ دائرے میں سانس نہیں لے سکتا''۔

(علی سردار جعفری، اقبال شناسی، صفحہ:11)

مذکورہ بالا (۱) تا (۵) بحوالہ عمر رضا، علی سردار جعفری صفحہ:335,533, 534, 535

علی سردار جعفری کو اپنے پہلے دور کی تنقید (''ترقی پسند ادب'') میں تبدیلی کا اعتراف ہے۔

ندا فاضلی سے بات چیت کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''جعفری صاحب! آپ نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں اصغر، یگانہ، فانی کے مقابلے میں جگر کی شاعری سے زیادہ بحث کی ہے۔جگر ان تینوں میں کمزور شاعر بھی ہیں اور پھر جن شعروں میں آپ نے سماجی شعور کو تلاش کیا ہے وہ بھی جگر کی شاعری میں کچھ زیادہ اہم نہیں''۔

''یہ صحیح ہے۔حسرت'' یگانہ اور اصغر کا ذکر بھی وضاحت سے ہونا چاہئے تھا۔کتاب کے اگلے ایڈیشن میں اس کا خیال رکھوں گا۔جگر کی شاعری زیادہ سطحی ہے ''ترقی پسند ادب'' سے اب تک میری سوچ کی بنیادی سطح تو وہی ہے، ہاں! اس کے

اطلاق میں تبدیلی ہوگئی ہے۔ کچھ شاعروں اور ادیبوں میں بھی نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔میرا جی کے بارے میں میری جو رائے پہلے تھی، وہی اب بھی ہے۔منٹو نے کچھ بڑی کہانیاں بھی لکھی ہیں جیسے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور ''کھول دو'' وغیرہ۔ یہاں وہ اپنے کرافٹ میں دوسروں کو اپنے قریب تک نہیں بھٹکنے دیتا۔یہ عالمی معیار کی کہانیاں ہیں۔مگر ''سرکنڈوں کے پیچھے'' اور ''بو'' گھٹیا کہانیاں ہیں۔مجھے آج بھی یہ کہانیاں بری لگتی ہیں''۔ 354

سردار جعفری کی تنقید پر لکھی گئی کتابوں ''ترقی پسند ادب (1951) اور پیغمبران سخن (1958 اور 1965ء کے درمیان لکھے گئے مقدمے) کے تعلق سے ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے لکھا ہے کہ دونوں کتابوں کا مزاج کئی مماثلتوں کے باوجود مختلف ہے۔

انہوں نے دونوں کتابوں کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میرے لیے کبیر، میر، غالب شاعرانہ دنیا کی بازیافت خود میری شعر گوئی کے لیے ضروری ہے'' اسی لیے انہوں نے ان مقدموں میں پیشہ ور نقادوں کا سا رویہ اختیار نہیں کیا۔لیکن ان کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' ایک پیشہ ور نقاد کے قلم سے نکلی ہوئی فکر و خیال کا نتیجہ لگتی ہے۔شاید اس وقت ایسی ہی ضرورت تھی۔ جہاں ترقی پسندی ایک ضرورت تو تھی ہی اس سے زیادہ ایک بحث تھی۔اسلیے اس کتاب میں جتنی بحثیں ہیں کم و بیش اس کتاب کو لے کر ہوئیں جس سے کم از کم یہ فائدہ تو ہوا ہی کہ یہ کتاب ترقی پسندی کی طرح خوب مقبول ہوئی اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ان دونوں کے مابین ایک فرق یہ بھی تھا کہ ان تینوں شاعروں کی انسان دوستی، ترقی پسندی ایک فارمولے، ایک نظریہ سے زیادہ ایک جذبہ، ایک فطرت کا درجہ رکھتی تھی اور بیسویں صدی کے بیشتر فن کاروں میں بالعموم اور ترقی پسند فنکاروں میں بالخصوص ایک سوچا سمجھا اور کبھی کبھی اوڑھا ہوا فلسفہ اور فیشن زدہ فکر کا درجہ رکھتی تھی اس لیے بحث طلب تھی اور تحقیق و توجہ طلب تھی۔پھر بھی اس رجحان اور اس کتاب کی تاریخی حیثیت سے کون انکار کر سکتا ہے''۔ 355

سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' اور ''پیغمبران سخن'' کے تعلق سے مختلف ادیبوں اور نقادوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی:

''سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' اسی دور کی یادگار ہے۔ان سے کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے مگر اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب ترقی پسند تحریک کے ایک عہد کی اہم ترین دستاویزات میں ہے جس کے بغیر اس عہد کی ادبی تاریخ کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا''.....

سردار جعفری نے ان ادبی شخصیات (کبیر داس، غالب، میر، کبیر، میرابائی) کے کلام کو نہ صرف دونوں زبانوں (ہندی اور اردو) میں بیک وقت شائع کیا بلکہ ان پر جو تفصیلی مقدمے لکھے وہ خیالات، تجزیے اور سخن فہمی اور اسلوب غرض کہ ہر اعتبار سے نہایت اہم ہیں''۔ 356

پروفیسر سید محمد عقیل:

''میر غالب میرابائی اور کبیر کا اردو ہندی میں ایسا محاسبہ کیا جو کم از کم اردو کے کسی ادیب سے ممکن نہ ہو سکا''۔ 357

''سردار نے اپنی نثری تحریروں کے توسط سے اردو تنقید میں بھی اپنے لیے ایک منفرد اور نمایاں مقام پیدا کیا۔ ''ترقی پسند ادب'' ''ترقی پسند تحریک کی نصف صدی'' اور انگریزی اور اردو میں شائع شدہ متعدد مضامین کے علاوہ کبیر، میرابائی، میر اور غالب کے انتخابات اور ان کے مقدمات نے اردو دنیا میں ان کی تنقیدی بصیرت، کلاسیکی آگہی اور ادبی دوروں بینی سے متعارف کرایا۔ سردار نے ''اقبال شناسی'' کے اپنے مضامین کے توسط سے فکر اقبال اور کلام اقبال کا محاسبہ کر کے اقبال شناسی میں نئی جہتوں اور نئے زاویوں کا اضافہ کیا''۔ 358

سردار جعفری نے 27/نومبر 1993ء میں اپنے تہنیتی جلسہ میں تقریر کے دوران اپنی شاعری کی انفرادیت کے بارے میں کہا ہے۔ نیز چند نقادوں کی آرا اور ان کے جوابات بھی دیے ہیں۔

چند اقتباسات پیش ہیں:

(ا) ''میں اپنے آپ کو اردو شاعروں کے اس گروہ میں شامل کرتا ہوں جنھوں نے روایت سے انحراف کیا ہے، کچھ گستاخیاں کی ہیں۔ میں نے اپنی بیوی کو کبھی لیلیٰ یا شیریں نہیں کہا ہے بلکہ وینس اور ہیلن کہا ہے۔ اردو والوں نے اسے پسند نہیں کیا۔ اردو کا یہ مزاج برداشت نہیں کر پاتا، بس وہی تہذیب کا مسئلہ آڑے آتا ہے میں شاعری کو گل و بلبل تک محدود نہیں رکھتا، اس سے نکلنا چاہتا ہوں''۔ پتھر کی دیوار'' دیکھئے۔ آپ کو اس میں بدلی ہوئی، میجری ملے گی لیکن کیا کسی نقاد نے اسے محسوس کیا کسی پر اقبال سوار ہیں، کسی پر جوش، کسی پر فیض۔ اب میں کیا کروں۔ اگر انہیں انفرادیت نظر نہیں آتی تو اس کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں۔

مجھ پر کس کس کے اثرات ہیں یہ تو تلاش کر لیا لیکن کیا اثر ترتیب دے رہا ہوں اسے تلاش کرنے کی کسی نے زحمت نہیں کی .....

(2) ''شمس الرحمن فاروقی نے میری کتاب ''ایک خواب اور'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس پر فیض کی نقل ہے۔ میں نے انہیں لکھا آپ فیض کو سمجھ سکے اور نہ مجھے (اس کے بعد وہ فیض اور اپنی شاعری کے فرق کو بیان کرتے رہے)۔ اسی طرح اسی مجموعے کے بارے میں پروفیسر محمد حسن پچھلے چالیس سال سے یہ کہتے آرہے ہیں کہ سردار دراصل شکست خواب کے شاعر ہیں۔ حالاں کہ میں ایک اور خواب دیکھنے اور دکھانے کی بات کر رہا ہوں''.....

(3) ''میں نے اپنے یہاں کلاسیکی تشبیہات سے الگ ہٹ کر نئی تشبیہات پیش کرنے کی کوشش کی ہے مثال کے طور پر میری نظم ''نیند'' (پوری نظم سنائی) نئی دنیا کو سلام میں میں نے روایتی تصور حسن کو توڑنے کی کوشش کی۔ اس نظم میں میں نے پہلی بار اردو شاعری میں ایک حاملہ عورت کا کردار پیش کیا ہے۔ اس کے ذریعے تاریخ اور وقت کی گردش کو بھی اٹھایا ہے۔ اگر ہماری تنقید اس نئی امیجری کی داد نہیں دیتی تو میں کیا کروں۔ میں نے رقص کائنات کو نئے سرے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ناقد اس کا ساتھ نہیں دے پاتا''۔

(4) ''مجھ پر سیاست کے حوالے سے بھی اعتراض ہوتا ہے مگر اس قسم کا اعتراض ولوگ کرتے ہیں جن کی تنقید ابھی آہ اور واہ سے آگے نہیں نکل سکی''.....

(5) ''مجھ سے یہ بھی سوال کیا جاتا ہے کہ جس مستقبل کی آپ بشارت کرتے ہیں کیا وہ مستقبل آیا؟ میں نے کبھی ایک مستقبل کی بات نہیں کی۔کوئی بھی نہیں کرسکتا۔اقبال نے بھی نہیں کیا۔میں ''ہر منزل ایک منزل ہے نئی آخری منزل کوئی نہیں'' کا قائل ہوں.....

(6) '' کچھ لوگ نعرہ بازی کی شاعری کو بُری شاعری کہتے ہیں۔اقبال کا شکوہ کیا ہے۔نعرہ ہی تو ہے لیکن بڑی شاعری بھی ہے۔ہر شاعر کے یہاں نعرے ملتے ہیں۔ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان میں کون سے کھوکھلے جاتے ہیں لیکن ہم پھر بھی لگاتے ہیں اور آج ضرورت پڑے گی تو ہم پھر لگائیں گے۔جب دلوں میں چنگاری ہوتی ہے تو نعرے بھی لگتے ہیں، پرچم بھی بلند ہوتے ہیں اور انسان کی جدوجہد کا سفر اسی طرح جاری رہتا ہے''۔ 359

سردار جعفری کی نظر میں ترقی پسندی:

سردار جعفری نے لکھا ہے: ''میں ترقی پسند ہوں لیکن ایک انقلابی نقطۂ نگاہ کا حامل ہوں۔میں نے ترقی پسندی کو ہمیشہ ایک دھنک، ایک قوسِ قزح کہا ہے جس میں بہت سے رنگ ہیں اور ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے اور آج کے عہد میں جب احتجاجی ادب زیادہ لکھا جارہا ہے اس دھنک کے رنگوں میں کچھ میل بھی آگیا ہے۔سارا کا سارا احتجاجی ادب ترقی پسند نہیں ہوسکتا اگر میں انتہائی مبالغہ آمیز مثال دوں تو اس بات کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ برطانوی سامراج کے خلاف ہٹلر اور مسولینی کے ہم خیالوں کا احتجاجی ادب کسی طرح ترقی پسند ادب نہیں تھا جس طرح نازی جرمنی کی نیشنل سوشلزم کا سوشلزم سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا''۔ 360

شاعری میں نئی لوازمات سے متعلق سردار جعفری کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے پروفیسر علیم اللہ حالی لکھتے ہیں:

''شاعری میں وہ کسی مخصوص فارم کی قائل نہیں تھے۔نظم وغزل دونوں ان کی دسترس میں تھیں،بحر وزن کے سلسلے میں اگر چہ وہ رہین روایات نہیں تھے مگر شاعری میں صوتی اتار چڑھاؤ اور نغمگی بہر حال ضروری سمجھتے تھے چنانچہ ان کی نظمیں وزن وبحر کی حامل ہیں۔شعری صوتی نظام کے بارے میں ان کا ایک متعین تصور تھا اسے وہ عملاً برتتے تھے۔وہ یہ سمجھتے تھے کہ اردو شاعری پڑھنے والے لوگوں کا ایک طبقہ بھی قدیم اوزان پر اصرار کرتا ہے اور مصارع کے متوازی اور برابر ہونے نیز قافیہ ردیف سے انہیں آراستہ کرنے پر زور دیتا ہے لیکن وہ محسوس کرتے تھے کہ قافیہ ردیف پر اصرار بیجا کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر اپنے افکار و خیالات کو اس آزادی اور فطری بہاؤ کے ساتھ ادا نہیں کرسکتا جو سچی شاعری کی خصوصیت ہوتی ہے ..... جب کہ سردار جعفری خیالات کے استحکام اور ان کے اظہار میں روانی و برجستگی کے قائل تھے۔.....وہ اپنا موقف بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

''میں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مختلف قسم اور مختلف سطح کی شاعری کرتا رہا ہوں۔میری تمام تر کوشش یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ آدمیوں کے لیے اپنی شاعری کو آسان بنا سکوں۔اس کوشش میں میں ان حدوں کو توڑ دینا چاہتا ہوں جو بول چال کی زبان اور ''شاعرانہ'' زبان کے بیچ میں حائل ہے۔جہاں میں ان حدود کو نہیں توڑ پاتا اور بول چال کی زبان میں اپنا

مطلب ادا کرنے سے قاصر رہتا ہوں وہاں ''شاعرانہ'' زبان بھی استعمال کرلیتا ہوں۔یہ دراصل بول چال کی زبان کا عجز نہیں بلکہ میری تربیت کا قصور ہے''(پتھر کی دیوار)۔ 361

ڈکٹر سید سراج الدین اجملی نے ان نکات کو بتلایا ہے جن سے سردار جعفری کی شاعری کا مطالعہ مناسب وموزوں ہے۔

انہوں نے سردار جعفری کے شعری مجموعے ''پتھر کی دیوار'' کے دیباچے سے اقتباسات بھی پیش کیے ہیں۔

''سردار جعفری نے بار بار اپنے دیباچوں،خطبات اور بیانات کے ذریعہ اپنی مذکورہ شاعری کا جواز فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔عصر اور عصری مسائل پر ان کا زور خارجیت سے ان کی حد درجہ وابستگی،انسان دوستی،عالمی امن اور بھائی چارے کے جذباتی نعروں سے ان کا لگاؤ اس امر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ ان کی شاعری کا مطالعہ ایک خاص زاویے سے ہی مناسب و موزوں ہے۔

''پتھر کی دیوار'' کے دیباچے سے یہ تین اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''(ا)ہر شاعر اپنے فن کے دامن میں روح عصر کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔کوئی کم اور کوئی زیادہ لیکن کسی نہ کسی حد تک ہر شاعر روح عصر کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔جو اپنی اس کوشش میں جتنا کامیاب ہوتا ہے وہ اتنا ہی اچھا شاعر ہوتا ہے۔آج کی حقیقت کی کوکھ سے کل کی حقیقت پیدا ہورہی ہے۔کل کے عہد کی رگوں میں آج کے عہد کے خون کے کچھ نہ کچھ قطرے ضرور ہوں گے۔اس اعتبار اور تناسب سے آج کے شاعر کے نغموں میں کل کچھ دیرپا قدریں پائی جائیں گی۔دیرپا قدروں کی اس سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں ہے جنہیں کبھی کبھی ابدی قدریں کہہ دیا جاتا ہے ورنہ اس تبدیل ہوتی ہوئی کائنات میں جہاں ہر چیز وجود میں آکر عدم میں کھو جاتی ہے۔ابدی چیز کیا ہوسکتی ہے۔اسی لیے میں شاعری کو آج کی حقیقت یا روح عصر کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں''(دیباچہ ''پتھر کی دیوار،صفحہ:4)

(2)''حقیقت یہ ہے کہ بول چالی کی زبان ہی سب سے زیادہ شاعرانہ زبان ہے لیکن جب کبھی بول چال کی زبان سے ہٹ کر ''شاعرانہ زبان'' بنائی جائے تو وہ مصنوعی ہوجاتی ہے''(صفحہ:11)

(3)''پرانی تشبیہیں اور استعارے پرانی علامتیں ایک بہت بڑا خزانہ ضرور ہیں لیکن اس خزانے پر قناعت کرلینا نادانی ہے کبھی تو ان کے استعمال سے بڑا حسن پیدا ہوجاتا ہے لیکن کبھی وہ خیالات اور حساسات کو جکڑ بھی لیتے ہیں اور اصلیت پر دہ ڈال دیتے ہیں''۔ (صفحہ:11) 362

شافع قدوائی نے سردار جعفری کی تنقید کے بارے میں لکھا ہے:

(1)''علی سردار جعفری نے ترقی پسند تصور ادب کی توضیح وتشریح کو اپنے تنقیدی اکتسابات کا بنیادی حوالہ بنایا۔''ترقی پسند ادب''،''پیغمبران سخن''،''اقبال ایک مطالعہ''اور بعض ادبی جرائد میں شائع شدہ ان کے متعدد تنقیدی مضامین اسی مرکزی نکتہ کی تعبیر وتشریح سے عبارت ہیں''۔

(2)ادب کی ماہیت،ادب کے عوامی اور سماجی کردار کا تصور حسن اور جمالیاتی احساس کے بارے میں علی سردار جعفری کے خیالات کسی نئی بصرت کی خبر نہیں دیتے مگر جہاں انہوں نے نظری مباحث کے ساتھ ادیبوں اور شاعروں کے انفرادی

مطالعہ پر توجہ مرکوز کی ہے اور ان کا باہمی موازنہ کیا وہاں انہوں نے خیال انگیز نکات تنقیدی بصیرت کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ ان مضامین میں ایک نئی تنقیدی فضاء کا احساس ہوتا ہے۔ جوش اور پریم چند کا موازنہ بظاہر بے جوڑ سا لگتا ہے مگر سردار جعفری کا تجزیہ دیکھیئے جوان کی تنقیدی بصیرت پر دال ہے:

پریم چند اور جوش دونوں قومی تحریک آزادی کے ابال کی تخلیق ہیں لیکن ان کا ادب اس تحریک کی کمزویوں اور سمجھوتے بازیوں کے خلاف ایک زبردست احتجاج کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک کے احتجاج نے حقیقت نگاری کی شکل اختیار کی اور دوسرے کے احتجاج نے رومانی بغاوت کی۔ اس طرح پریم چند کی حقیقت نگاری اور جوش کی رومانی بغاوت ایک ہی تصویر کے دورخ بن جاتے ہیں۔۔۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پریم چند کی حقیقت نگاری میں رومانیت کی چاشنی ہے ورنہ ان کے ادب میں بھونڈا پن پیدا ہو جاتا اور جوش کی رومانیت میں حقیقت کی آمیزش ہے۔

(3) ترقی پسند ادب کی حد تک تو سردار جعفری کا تنقیدی نقطۂ نظر خاصہ محدود اور یک رخا محسوس ہوتا ہے مگر پیغمبران سخن میں شامل دیباچوں اور بعض دیگر مضامین کے مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے کہ سردار جعفری کے تنقیدی نقطۂ نظر میں خاصی وسعت پیدا ہوگئی ہے اور انہوں نے فن پارہ کی تعین قدر کے لیے تنقید کے مختلف دبستانوں سے بیک وقت استفادہ کیا ہے۔ اگرچہ سردار جعفری خود اپنے کو نقاد کہلانے سے انکاری ہیں، تاہم ان کا تنقیدی نقطۂ نظر Electic جو سردار جعفری کے رچے ہوئے ادبی ذوق پر دال ہے"۔ 364

سردار جعفری کی تنقید میں تاریخی شعور کی کارفرمائی اور تاریخ کی اہمیت کو ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے اپنے ایک مضمون میں اجاگر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

(1) سردار جعفری ہمارے ادب کی ان معدودے چند شخصیتوں میں سے تھے جن کے ادبی کارنامے پچاس پچپن سال کے طویل عرصے کو محیط ہیں............ "پچپن برس سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے ہندوستان کی تاریخ کے بے حد اہم سال ہیں۔ ان میں انقلاب کی دھمک بھی ہے، جنگ آزادی کے فلک شگاف نعرے بھی، سرفروشوں کا لہو بھی، سنگینوں کا شور بھی، فرنگیوں کا زور بھی، صبح آزادی کی روشنی بھی اور آزادی کی مایوسیاں اور ناکامیاں بھی اور جمہوریت کی ابھرتی ہوئی تصویر بھی۔ بدلتے ہوئے ہندوستان کے مختلف رنگ بھی۔ پنج سالہ پلان اور صنعتی ترقی بھی گاندھی، نہرو، ابوالکلام آزاد اور لال بہادر شاستری کی موتیں بھی۔ اندرا گاندھی اور راجیو گاندی کا سفاکانہ قتل بھی۔ چین، پاکستان اور بنگلہ دیش کی جنگیں بھی۔ کشمیر کا مسئلہ بھی اور تاشقند معاہدہ بھی۔ گولڈن ٹمپل آپریشن اور بابری مسجد کا سانحہ بھی "دل بدلو" سیاستیں بھی اور حوالے گھوٹالے بھی۔ 1992ء کے منحوس واقعات اور خون ریز فسادات بھی۔ بم بلاسٹ بھی اور پوکھرن کا ایٹمی دھماکہ بھی۔ یہی نہیں بلکہ ایک عالمی منظرنامہ بھی ان کے سامنے رہا جس میں ویت نام، فلسطین، اسرائیل، عراق، ایران، افغانستان اور جنوبی افریقہ کی جنگیں اور تحریکیں بھی شامل ہیں۔ روس کا پارہ پارہ نظام بھی۔ وہ نظام جس کے نقیبوں میں خود سردار جعفری بھی تھے۔ 365

(سردار جعفری کا شعری سفر مطبوعہ سہ ماہی جامعہ، اکتوبر 1980ء)

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے 1980ء میں لکھے ہوئے اپنے ایک مضمون کا اقتباس دینے کے بعد سردار جعفری کے تاریخی

شعور پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

(ا) یہ سارے واقعات جو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اور ماضی کے وہ تمام قصے جو انہوں نے اپنے کانوں سے سنے تھے سردار جعفری کے تاریخی شعور کی نشوونما اور پختگی کے لیے کافی تھے۔ ویسے بھی تاریخ ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اور اس کا مطالعہ وہ بے حد ضروری خیال کرتے تھے ....''

2)......ان کا خیال تھا کہ کسی بھی آرٹ یا لٹریچر کو تاریخی پس منظر جانے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا............''

3)۔''سردار جعفری کا تاریخی شعور اتنا پختہ، اتنا قوی اور اتنا بیدار تھا کہ ان کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک تحریر سے ٹپکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ چاہے وہ ان کی نثر نگاری ہو تنقید ہو، افسانہ ہو، ڈرامہ ہو، مکتوب ہو، کوئی خطبہ ہو یا پھر ان کی شاعری بلکہ یہاں تک کہ انہوں نے کلاسیکی شعراء کے جو دواوین مرتب کیے ہیں ان کے پیش لفظ یا مقدمے بھی اسی تاریخی شعور کے غماز ہیں............

4)۔''......وہ ادب کے مطالعے کے لیے تاریخی شعور کو لازمی قرار دیتے تھے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ ماضی کے ادیبوں کو ان کے عصری ماحول کے پس منظر ہی میں رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے تبھی ان فن پاروں کی تنقید کا حق ادا ہو سکتا ہے بلکہ ماضی کے ان ادبی کارناموں سے ہم نہ صرف یہ کہ استفادہ اور بصیرت حاصل کر سکتے ہیں۔ بلکہ انہیں اپنے اندر انگیز کر کے اپنے ذوق جمال کی تربیت بھی کر سکتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ''ماضی کی صحت مند روایات کو حقارت سے دیکھنے کا جذبہ اصل میں تاریخ کو مٹانے کا جذبہ ہے اور تاریخ کو وہی مٹاتا ہے جس میں کچھ احساس کمتری ہوتا ہے''۔(ترقی پسند ادب صفحہ:6)

............ان کے نزدیک کلاسیکی روایات کے مطالعے ہی سے ایک تنقیدی نظر پیدا کی جا سکتی ہے وہ چاہتے تھے کہ ترقی پسند نقاد آگے بڑھ کر ''ماضی کے پتھروں کے نیچے سے ان سرچشموں کو ڈھونڈ نکالیں جن سے صدیوں تک ہماری کشت ادب کی آبیاری ہوتی رہی'' ....

5)۔پیغمبران سخن، میں وہ کبیر، میر اور غالب کی شخصیت اور ان کے فن پر عام نقادوں کی طرح رائے نہیں دیتے بلکہ ہر فن کار کے تاریخی پس منظر میں اس کے فن کا تجزیہ کرتے ہیں۔

(6)............تدوین و ترتیب کے اہم کارناموں کے علاوہ ان کی جو تنقیدی تحریریں ہیں ان میں بھی ان کا تاریخی شعور نمایاں طور پر جھلکتا نظر آتا ہے مثلاً شبلی (جنہوں نے اردو میں تاریخ نگاری اور سوانح نگاری کو فروغ دیا) کے فردوسی پر لکھے گئے مضمون کا سردار جعفری نے جو تجزیہ کیا ہے وہ نہ صرف خود ان کے تاریخی شعور کا غماز ہے بلکہ شبلی کے تاریخی شعور کی طرف اشارہ کناں ہے''۔............

(7)''............سردار جعفری ادب کو اپنے عہد کے تاریخی حالات کی دین قرار دیتے ہیں اور تاریخی حالات دراصل سماجی حالات کے آئینہ دار ہوتے ہیں............''

(8)''............ادب میں تاریخی شعور کا مطلب یہ قطعی نہیں ہے کہ انسانی سماج کی یا کسی مخصوص علاقے کی یا کسی مخصوص دور یا ادوار کی تاریخ سلسلہ وار بیان کر دی جائے، بلکہ مختلف سماجی حقائق کی صحیح تفہیم اور زمان و مکان کے اعتبار سے ان کا بیان

اور اظہار اصل تاریخی شعور ہے۔366

سردار جعفری کی تنقید نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر شارب ردولوی نے لکھا ہے:

1۔سردار کے تنقیدی مضامین ان کی شاعری سے کم اہم نہیں ہیں اس لیے کہ وہ ادبی مطالعہ اور تفہیم کی ایک نئی سمت و رفتار کا تعین کرتے ہیں جس کی بنیاد متن، تہذیب، شعر اور شعر کی جمالیات پر ہے۔انھوں نے اس سارے کام میں تخلیقی جمالیات، لسانی اقدار اور تہذیب کو سامنے رکھا ہے۔

2۔بقول سردار جعفری تاریخ محض واقعہ نگاری نہیں بلکہ سماجی اور معاشی رشتوں کی تبدیلی کی داستان بھی ہے اور فکر و شعور کا سفر بھی۔ (پیغمبران سخن صفحہ 14)

تاریخی واقعات عصری حالات کی بنیاد پر رونما ہوتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں۔ان کی حیات اور اثرات وقتی ہوتے ہیں لیکن ان سے نمو پانے والی فکر عصری قیود کو توڑ کر باہر نکل جاتی ہے اور صدیوں بعد بھی اس کے اثرات باقی رہتے ہیں۔

3۔سردار جعفری ایک انسان دوست تحریک کے علمبردار ہیں اور ساری زندگی اپنی تحریروں اور اپنی شاعری کے ذریعہ اسی انسان دوستی کی تبلیغ کرتے رہے ہیں۔ان کے لیے انسان دوستی ہر طرح کی لسانی، مذہبی اور تہذیبی تفریق سے بلند ہے۔وہ زبان کی قید و بند کو توڑ کر موسم بہار کے پھولوں کی خوشبو کی طرح پھیل جاتی ہے۔وہ عطار، رومی، حافظ اور کبیر، میرا، میر، غالب اور اقبال کے فرق اور لسانی امتیازات کو نہیں جانتی۔وہ نسلوں اور رنگوں کے فرق سے بھی نہیں واقف ہے۔وہ تو صرف درد کو پہچانتی ہے اور مشترک اقدار کے درمیان پل بناتی جاتی ہے۔

4۔سردار جعفری نقد شعر میں بنیادی طور پر متن پر زور دیتے ہیں لیکن متن کے ثقافتی، تہذیبی اور سیاسی سیاق کو فراموش نہیں کرتے اس لیے کہ کبھی کبھی متن اس کے بغیر نامکمل رہ جاتا ہے اور الفاظ، استعارے اور علامتیں پورا اظہار نہیں کر پاتیں۔سردار جعفری اس کے پورے سیاق میں شاعر اور اس کے کلام کو دیکھتے ہیں۔367

5۔سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے زبردست مبلغوں میں ہیں۔انہوں نے اپنے مضامین اور تحریروں کے ذریعے ترقی پسند نقطہ نظر کو عام کیا اور ادب کو ان کے ذریعے پرکھنے کی کوشش کی۔ان کی بعض تحریریں تحریک میں زبردست اعتراض اور بحث کا موضوع بنیں۔قدیم ادب، کلاسیکی ادبی قدروں اور ترقی پسندی کے مفہوم کے بارے میں ان کے رویے پر شدید اعتراضات ہوئے ہیں جو وقتی جوش اور انقلاب کی جذباتی تاویل کا نتیجہ تھا۔لیکن ان کی تنقید کی اہمیت ان کے اُن مضامین یا ترقی پسند تحریک کی تاریخ سے نہیں بلکہ کبیر بانی، میرا اور دیوان غالب کے دیباچے کی شکل میں شامل ان کے مضامین اور ان کے بعد کے دوسرے مضامین سے ہے جو یقیناً اردو تنقید میں کلاسیکی ادب کے تجزیے کے ترقی پسند معیار کو پیش کرتے ہیں۔368

سردار جعفری کی تنقید نگاری کو بہت سے ادیبوں نے وقیع مانا۔ذیل میں چند ادیبوں کے اقتباس پیش ہیں:

پروفیسر شارب ردولوی:

سردار جعفری کو ایک بلند پایہ شاعر اور ایک ترقی پسند تحریک کے علمبردار کی حیثیت سے جو شہرت ملی وہ ایک ناقد کی حیثیت سے نہیں ملی۔ایک ناقد کی حیثیت سے اگر کبھی کوئی حوالہ آیا بھی تو وہ ان کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' کے مباحث میں الجھ کر رہ

گیا۔وہ بنیادی طور پر شاعر تھے۔انھوں نے خود بھی اصطلاحی معنوں میں نقاد کی حیثیت سے کبھی خود کو ظاہر (project) نہیں کیا حالاں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ بہت سے سکہ بند ناقدوں کی تحریروں سے زیادہ وقیع ہے۔دراصل سردار جعفری کو بہ حیثیت ناقد سمجھنے میں اسی لیے دشواری ہوئی کہ وہ اپنی نثری تحریروں میں اپنی شاعرانہ شخصیت سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔ اسی لیے اردو کے ان ناقدوں نے بھی ان کی طرف توجہ نہیں دی جو تنقید سے زیادہ نظریہ سازی کے شکار تھے۔369

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید:

میں اپنے آپ کو نقادوں کی صف میں شمار نہیں کرتا (سردار جعفری، پیغمبران سخن دیباچہ) سردار جعفری خود کو نقاد نہ کہتے ہوں لیکن ان کے نکھرے ہوئے تنقیدی شعور سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔چنانچہ ان کی تنقیدی بصیرت اردو ادب کے لیے وجہ افتخار ہے۔ 370

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے لکھا ہے:

خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان کے (سردار جعفری) جن تنقیدی افکار پر سخت تنقید کی ہے اور ان افکار کو ان کی ذہنی اور فکری سوانح عمری قرار دیا ہے،ان کا تعلق بھی ''ترقی پسند ادب'' میں شامل بیانات اور اسی زمانے میں شائع شدہ مضامین میں سامنے آنے والے تنقیدی رویوں سے ہے مگر سردار جعفری کے پرانے فیصلوں سے انحراف اور بدلی ہوئی صورت حال میں تنقید نگار کی حیثیت سے اپنے جواز کی صورتیں صحیح معنوں میں ان کی کتابوں ''پیغمبران سخن'' اور ''اقبال شناسی میں نظر آتی ہیں۔ان تحریروں میں مصنف کا زاویہ نظر نسبتاً لچک دار،قدرے معروضی اور ادبی اقدار سے ہم آہنگ ہے۔371

ابوالکلام قاسمی رقمطراز ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ سردار جعفری کی تنقید کا بنیادی رویہ تاثراتی تنقید کے دبستان کے قریب معلوم ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی انھوں نے مارکسی تنقید کے علاوہ نئی مغربی تنقید کے طریق کار سے بھی استفادہ کیا ہے۔372

بقول شافع قدوائی:

معنی کی تشکیل میں قاری کے عمل پر اصرار قاری اساس تنقید کا مابہ الامتیاز عنصر ہے۔متن اصلاً جامد اور بے جان شئے ہوتا ہے اور جن کی زندگی کا انحصار قرأت پر ہوتا ہے۔اس طرح موضوع اور معروض کی حد بندی ختم ہوجاتی ہے اور معنی indeterminate ہوجاتے ہیں اور اس طرح ہر قاری subjected object سے معنی کی ایک نئی جہت پیدا کرتا ہے۔سردار جعفری کو بھی قرأت کے عمل میں قاری کے اساسی کردار کا احساس ہے اور وہ لکھتے ہیں:

''دراصل شعر گوئی کی طرح شعر فہمی کی بھی تخلیقی سطح ہوتی ہے اور اس کا اپنا جمالیاتی عمل ہے جس طرح شاعر تخلیق کرتا ہے اس طرح قاری کو بھی از سر نو ایک اور مگر ذرا کم شدت کے تخلیقی عمل سے گذرنا پڑتا ہے۔اس لیے جس طرح ایک شخص شعر کو سمجھتا اور لطف اندوز ہوتا ہے اس طرح دوسرے کے لیے ممکن نہیں۔373

ان کے (سردار جعفری) خیال میں انسانی عظمت محض اسی وجہ سے قائم ہے کہ زندگی کا تسلسل کبھی ختم نہیں ہوتا۔لوگ مرتے ہیں مگر انسان زندہ رہتا ہے۔اس کے اندر سانس لینے والی نیکیاں اور سچائیاں زندہ رہتی ہیں اور ہر دور میں اپنے آپ کو

منواتی رہتی ہیں۔374

پروفیسر سید فضل امام رضوی نے ''سردار جعفری کا انتقادی عمل'' عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں سردار جعفری کی تنقید نگاری پر اظہار خیال کیا ہے۔اس مضمون کے چند اقتباسات پیش ہیں۔

ملاحظہ فرمایئے:

1۔ان (سردار جعفری) کی انتقادی کاوشیں بھی بالکل سعی لاحاصل کے ذیل میں نہیں آتیں۔

2۔ وہ (سردار جعفری) کوئی بہت بڑے نقاد یا نظریہ ساز نقاد نہیں ہیں لیکن شعروادب کی افہام وتفہیم کے کچھ اہم نکات بیان کیے ہیں جس میں جوش، جذبہ اور ذہانت وفطانت کے عنصر نمایاں ہیں۔ وہ وسیع المطالعہ تھے۔اردو، ہندی، انگریزی، فارسی کے ساتھ روسی زبان وادب پر اچھی نظر رکھتے تھے۔وہ ایک اچھے خطیب بھی تھے اور یہی انداز خطابت ان کی تنقیدوں میں بھی اکثر جھلکیاں دکھلا دیتا ہے۔ان کی پہلی تنقیدی کاوش جدید اردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات، علی گڑھ میگزین میں 1936ء میں شائع ہوئی، دوسری کاوش، ترقی پسند مصنفین کی تحریک نیا ادب لکھنو کے اپریل 1939ء میں شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے ترقی پسند ادب جیسی کتاب تحریر کر کے اس کے مختلف جہات اور نشیب وفراز سے متعارف بھی کرایا ہے۔

3۔ دیوان میر اور دیوان غالب پر لکھے جانے والے ان کے مقدمات بھی انتقادی اہمیت کے حامل ہیں۔ان مقدمات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فن وادب کے ذیل میں ان کا نقطۂ نظر خالص اشتراکی ہے۔کبیر کے سلسلہ میں بھی ان کا انداز فکر بھکتی سے زیادہ مارکسی ہے اور وہ کبیر کی شاعری میں مارکسی فکر ونظر کا سراغ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔انھوں نے ترقی پسند تحریک کو ادبی سائنس کی حیثیت سے اپنایا ہے۔وہ رقمطراز ہیں: میں نے ترقی پسند تحریک اور اس کے رجحانات کا جائزہ مادی، تاریخی اور سماجیاتی (عمرانی) نقطۂ نظر سے لیا ہے۔یہ نقطۂ نظر میرے لیے سائنس کی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ ادب کے لیے خارجی کسوٹی ضروری ہے۔(ترقی پسند ادب 67)

4۔علی سردار جعفری کی تنقیدی کاوشوں میں ہر مقام پر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ فن وادب کوئی الہامی شئے اور ماورائی طلسم نہیں ہے بلکہ کائنات فن وادب ہمارے طبقاتی سماج کے مادی وخارجی حقائق کی سچی دستان ہے جس میں ہمارے عوام اور محنت کش طبقے کے افراد کی زندگیاں رقص کناں ہیں۔سردار جعفری کی انتقادی نگارشات ہمیں یہی باور کراتی ہیں کہ جو ادب ہمارے سماج کی عوامی زندگی کو نظر انداز کر کے سماج کے صف اعلی اور خوش حال طبقے کو مرکزی فن وادب بناتا ہے جس میں صرف عیش و عشرت سامانیاں اور اس کے ترانے گونجتے ہیں وہ صحیح معنوں میں فن اور ادب نہیں کہا جا سکتا ہے۔

5۔وہ بہر طور پر ہر لحہ ادب اور زندگی کے رشتے کے ارتباط کو قائم رکھنا چاہتے ہیں لہٰذا وہ کسی بھی ایسے حسن کو حسین کہنے کے حق میں نہیں ہیں جو حیات انسانی کے لیے سماجی، اخلاقی، ذہنی یا جسمانی کسی بھی طرح سے مفید وکارآمد نہیں ہو۔ان کا خیال ملاحظہ ہو، اگر تجزیہ کیا جائے تو آخر میں ہر حسین چیز انسان کے لیے مفاد سے وابستہ نظر آئے گی۔(ترقی پسند ادب صفحہ 89)

6۔وہ مواد اور ہیئت کی ہم آہنگی میں یقین رکھتے ہیں اور رقمطراز ہیں 'بغیر ہیئت کے موضوع اور بغیر موضوع کے ہیئت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ (ترقی پسند ادب صفحہ 78)

7۔ابتدأ سردار جعفری مشرقی انتقادیات اور اس کے پیمانوں میں یقین رکھتے تھے جیسا کہ خود لکھتے ہیں ''روایت قافیہ اور بحر کی یک رنگی ایشیائی شاعری مین ایک ایسی چیز ہے جس سے اس کا حسن دوبالا ہوگیا ہے لیکن بعض نوجوان اسے بے جا قیود کا نام دے کر مغرب کی تنقید میں بلینک ورس کی طرف راغب ہو گئے ہیں اور ایسی چیز پیش کر رہے ہیں جو اردو ادب کے دامن پر بدنما دھبا ہیں، لیکن بعد میں خود اپنے اس معیار و میزان پر وہ قائم نہیں رہ سکے اور اسی بلینک ورس میں ''نئی دنیا کو سلام'' لکھ کر شہرت حاصل کی۔

8۔سردار جعفری عوامی ادب اور عوامی زبان پر زور دیتے ہیں اور لکھتے ہیں: اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے کہ ترقی پسند تحریک کا ایک بنیادی جزو عوامی کردار ہے اور ہماری ساری جدوجہد یہ ہے کہ ہمارا ادب عوامی ادب بنے (ترقی سند ادب صفحہ 227) اس ذیل میں انھوں نے ایک مشاعرہ کا واقعہ مجروح سلطان پوری کے حوالے سے درج کیا۔ مجروح سلطان پوری نے جب مزدوروں کے سامنے ایک غزل پڑھی جس میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق
خار سے گل اور گل سے گلستان بنتا گیا

تو مزدور آپس میں باتیں کرنے لگے ''مجروح بھی ہمارے شاعر ہیں'' مشاعرہ ختم ہونے کے بعد تو ایک مزدور نے آکر مجھ سے پوچھا ''آبلہ پایانِ شوق کا کیا مطلب ہے؟ یہ الفاظ اس نے گھٹیا قسم کی سگریٹ کی ڈبیہ پر لکھ لیے تھے جسے مزدور اپنا شعر کہہ دیں اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔(ترقی پسند ادب صفحہ 56)

حالاں کہ خود سردار جعفری کے یہاں اس طرح کی تراکیب اور الفاظ ملتے ہیں جیسے شیوۂ دلداری، شعلہ شعر و دانش فسوں کاری، رفیق محبس و زنداں، شعلہ پیکر گل عذاروں، سیل رواں، خفیف ارتعاش وغیرہ، درج بالا الفاظ کیا عوامی شاعری کے ترجمان ہیں؟ اور مزدوران کے مطلب اور معانی سے آشنا ہوں گے؟ معلوم نہیں اس طرح کے الفاظ مزدوروں نے کس معیار کی سگریٹ کی ڈبیا پر لکھے ہوں گے؟ 375

ڈاکٹر وحید اختر نے سردار جعفری کی تحقیق و تنقید میں ناقدانہ نظر کی کارفرمائی اور کٹر ترقی پسندی سے کلاسیکیت کی طرف مراجعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شاعر کے ساتھ جعفری نظریہ ساز بھی ہیں اور نقاد بھی۔انہوں نے میر اور غالب کے دیوانوں کا انتخاب کرنے کے ساتھ ان پر بسیط مقدمے بھی لکھے ہیں جن کے لیے انہیں کلاسیکی روایت اور تصوف کے مسائل کی دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑا۔اسی کے ساتھ انہوں نے کبیر اور میرابائی کا انتخاب بھی کیا۔بظاہر یہ تحقیق و تدوین کے کام ہیں لیکن جعفری صرف محقق نہیں، ان کی ناقدانہ نظر اور سیاسی سماجی شعور تحقیق میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔کٹر ترقی پسندی سے کلاسیکیت کی طرف یہ مراجعت ان کے ذہنی سفر کی ایک اور سمت ہے۔وہ عصر حاضر اور اس کے تقاضوں سے باخبر ہونے کے ساتھ کلاسیکی روایت کے بھی مزاج دان ہیں۔اس طرح ان کی نظم و نثر کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے ایک عمر میں کئی عمریں گزارنے کے ساتھ ہر عمر کو کئی سطحوں پر بھی تخلیقی لحاظ سے برتا ہے''۔376

سردار جعفری کی تنقید نگاری کے بارے میں عمر رضا نے اپنی تصنیف علی سردار جعفری (سنہ اشاعت 2008) میں لکھا ہے:

سردار جعفری نے اپنی مختلف تنقیدی تحریروں میں فکر وفن کے حسین امتزاج کی بات کی ہے لیکن ابتداء میں انہوں نے فکر کو مقدم رکھا تھا۔ رفتہ رفتہ اگر چہ ان کے یہاں فکر وفن کے حسین امتزاج پر زور ملنے لگتا ہے۔ لیکن پھر بھی کسی نہ کسی شکل میں وہ طبعاً اور مزاجاً فن سے زیادہ فکر کو اہمیت دینے کی بات کہتے ہیں ا۔ البتہ مذکورہ عہد کی تخلیقات پر اپنی توجہ مرکوز کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اب وہ فکر وفن کے حسین امتزاج کو خصوصی اہمیت دینے لگے تھے۔ تنقیدی تحریروں کا معاملہ یہ ہے کہ ان میں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام تک موضوع اور مواد ہی کو ادب کے حسن سے تعبیر کیا۔ اگر چہ اسے ھی قطعی نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ اس مسئلے کو لے کر سردار کے یہاں مختلف نشیب وفراز آئے"۔ 377

سید محمد مہدی نے سردار جعفری کی تنقید نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"ان (سردار جعفری) کی نثری تحریروں میں ان کا یہ مارکسی نقطہ نظر ان کی اہم تصنیف "ترقی پسند ادب" میں سب سے پہلے واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ ادب اور فن کے ارتقاء کی تاریخ کے متعلق جو کچھ انہوں نے اس کتاب میں لکھا ہے وہ اہم بھی ہے اور معلوماتی بھی لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسی کتاب میں اور اس کے علاوہ بھی کچھ مضامین میں انہوں نے کچھ شاعروں، خاص کر دو ایک اہم ہمعصر شاعروں کے متعلق ذرا درشتی سے کام لیا ہے۔ دراصل وہ اپنے نظریات کی حد تک بہت راسخ العقیدہ تھے.....

.....اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ چند ہم عصر ادیبوں پر درشت تنقید کی وجہ سے سردار جعفری کی ابتدائی تحریریں بے معنی ہیں۔ ادب اور فن کی تاریخ ارتقا کو سمجھنے کے لیے اور انجمن ترقی پسند مصنفین غرض وغایت کے متعلق ان کی کتاب "ترقی پسند ادب" ایک اہم کتاب ہے لیکن ابی وہ دوسرے مارکسی عالموں کا سہارا لے کر اپنی بات کہتے نظر آتے ہیں۔ ان کے ساتھ تھامس، کاڈویل، پلاخنوف وغیرہ بولتے محسوس ہوتے ہیں اور وہ آگے بڑھتے ہیں۔ نظر میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ کبیر، میر، غالب، اقبال پر ان کی پر مغز اور انتہائی دلکش تحریریں ان شاعروں پر ان کی شاعری پر اور ان کے عہد پر ایک نئی روشنی ڈالتی ہیں۔ یہ مارکسی سوشیالوجی اور جمالیات کے بہترین نمونے ہیں اور تخلیقی نثر کے شہ پارے۔ یہ ان کی شاعری اور تنقید نگاری کا دوسرا دور نہیں ہے۔ یہ ان کے تخلیقی سفر کی توسیع ہے۔ اس سفر کے دوران انہیں نئے مناظر نظر آتے ہیں، نئے زمین و آسمان نظر آتے ہیں۔ نئے امکانات روشن ہوتے ہیں، نئے تجربات عوت دیتے ہیں"۔ 378

ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے سردار جعفری کی تنقید نگاری کے عمدہ نمونوں کی نشاندہی کی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

"جعفری صاحب ایک نقاد کی حیثیت سے بھی معروف تھے۔ ان میں مقابلے وموازنے کی قوت شدید اور نکتہ فہمی کی صلاحیت بے پناہ تھی۔ ایک ناقد کی حیثیت سے انہوں نے تنقید کی کوئی بوطیقا مرتب کی اور نہ ہی تنقید کے اصول اور ضابطوں کو احاطہ تحریر میں لا کر تنقید کی ماہیت اور منصب سے بحث کی ہے۔ ان کی تنقید میں وہی اصول وضابطے ملتے ہیں جو ترقی پسند تحریک یا مارکسی تنقید سے عبارت ہے۔ ان کی سب مشہور تنقیدی تصنیف "ترقی پسند ادب" ہے جسے ترقی پسندی کی تاریخ بھی کہہ سکتے

ہیں اور تجزیہ بھی۔کٹر ترقی پسند نقاد ہونے کے باوجود جعفری صاحب کو جمالیات سے عار نہیں تھا۔انسان اور دوستی کا سبق ان کے تنقیدی رویے میں بھی ملتا ہے۔''اقبال شناسی'' اور ''پیغمبران سخن'' انہیں ایک اعلیٰ تنقیدی منصب پر لا کھڑا کرتی ہے۔صرف یہ دونوں کتاب ہی انہیں اردو نقادوں کی پہلی صف میں رکھنے کے لیے کافی ہیں۔یہاں ان کا قلم خاصا منجھا ہوا اور چوکس معلوم ہوتا ہے۔سردار جعفری میں ایک بڑا نقاد چھپا ہوا تھا۔ان کی قوت تنقید کا اندازہ صرف ''ترقی پسند ادب'' کی بنیاد پر نہیں لگایا جا سکتا ہے بلکہ اس امر کا اندازہ ان کے لکھے ہوئے دیباچوں،مقدموں،تبصروں،تنقیدی مضامین اور اداریے کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے۔میر،غالب،کبیر داس،میرا،اقبال اور دیگر شعرا پر تحریر کردہ مضامین سے بھی ان کی قوت استدلال،منطقی توضیحات،استدلالی تجزیے اور جمالیاتی احساسات کا بھرپور اظہار ہوتا ہے''۔379

پروفیسر کوپی چند نارنگ نے سردار جعفری کی تنقیدی نظر کی ستائش کرتے ہوئے لکھا ہے۔''میرا خیال ہے کہ ترقی پسندوں میں جیسی تنقیدی نظر علی سردار جعفری کی تھی ویسی کسی کی نہیں۔میر تقی میر،میرا بائی اور کبیر کے انتخابات بھی انہوں نے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں اپنے مقدمات کے ساتھ شائع کیے۔بعد میں ان کے یہ مضامین ''پیغمبران سخن'' نام کی کتاب میں شائع ہوئے،غالب،حافظ،رومی اور اقبال کے وہ عاشق تھے۔اساتذہ کا بیشتر کلام ان کو حفظ تھا۔''ترقی پسند ادب'' میں انہوں نے جن لوگوں کو اچھے لفظوں میں یاد نہیں کیا،ان میں اقبال اور قرۃ العین حیدر بھی تھے۔بعد میں ان کی رائے میں تبدیلی آئی اور انہوں نے ''اقبال شناسی'' شائع کی اور اقبال صدی منانے میں بھی پیش پیش رہے۔نظریاتی طور پر جس طرح ان کی پسند و ناپسند میں تبدیلیاں آتی رہیں''۔380

تنقید کا اسلوب کے سلسلہ میں راشد انور راشد نے لکھا ہے:

(1)۔تنقید بذات خود جس سنجیدگی کا تقاضہ کرتی ہے،اس کے پیش نظر انشا پردازی کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا کئی سطحوں پر حد درجہ مشکل دکھائی دیتا ہے۔ایک خاص دائرے میں مقید رہ کر شعور کی گتھیوں کو سلجھانا نقاد کی مجبوری ہوتی ہے،کیونکہ ذرا سی غفلت کی بنا پر ساری محنت رائیگاں ہو جانے کا اندیشہ بنا رہتا ہے۔ان حالات میں تنقید تخلیقیت اور انشا پردازی کی دولت سے مالا مال کرنا اپنے آپ میں ایک ایسا اجتہادی قدم ہے جس سے نئی منزلوں کا سراغ ملتا ہے''۔

(2)''عام طور پر تنقید سے بے رغبتی کی ایک بنیادی وجہ خشک اور ثقیل زبان کا استعمال بھی ہے۔اگر کوئی تحریر اظہار بیان کے فطری بہاؤ سے محروم ہو تو مطالعے کے دوران قاری کی دلچسپی خود بخود کم ہوتی چلی جاتی ہے۔اردو تنقید کے سرمایے پر اگر ہم اپنی نگاہ مرکوز کریں تو اندازہ ہوگا کہ تنقید کے نام پر وہی چیزیں آج بنیادی حوالوں کا درجہ رکھتی ہیں جن میں تنقید اور تخلیق کی سرحدیں آپس میں ملنے لگتی ہیں''۔ 381

تنقید میں اسلوب کے سلسلہ میں فدا المصطفیٰ فدوی لکھتے ہیں:

(3)''تنقید میں طرز اور اسلوب سے زیادہ مواد اور موضوع کی اہمیت مسلّم ہے،نقاد کے پیش نظر کس طرح کہنا چاہیے؟ اس سے زیادہ اہم کیا کہنا چاہئے؟ ہوتا ہے۔اس لیے یہی کافی سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنی بات سادہ و سلیس زبان میں کسی پیچیدگی اور الجھاؤ کے بغیر بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہو لیکن غیر معمولی ذہن و فکر کے حامل نقاد کیا کہنا چاہئے کے ساتھ،کس طرح کہنا

چاہئے، یہ بھی جانتے ہیں کیوں کہ وہ اس راز سے بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ اسلوب یا طرز نگارش میں تحریر کو تا دیر زندہ و تابندہ رکھنے کی قوت ہوتی ہے"۔381

ابوالفیض سحر نے سردار جعفری کے اسلوب کے بارے میں لکھا ہے:

''ایک اور خدمت سردار نے یہ بھی انجام دی ہے کہ حالی، عبدالحق اور ڈاکٹر زور کی مقدمہ نگاری کے فن کو نہ صرف آگے بڑھایا ہے بلکہ بہت اونچا اٹھایا ہے۔ دیوان میر، دیوان غالب اور کبیر بانی، کے دیباچے اردو ادب میں یقیناً اہمیت رکھتے ہیں۔ سردار کے مزاج کی طرح تقریر، اور ان کی تقریر کی طرح ان کی تحریر میں ایک بلند آہنگ ملتا ہے، جس میں زندگی کا حوصلہ اور جینے کا جذبہ پایا جاتا ہے جو تحریر کی ہر سطح پر رواں دواں رہتا ہے۔ اس طرح کی شدت احساس اور قوت اظہار سے ہی عظمت تحریر عبارت ہوتی ہے۔ رجز یہ جوش، جذبہ اور حرکت، رومانی رنگینی اور روانی جعفری کی نثر کے مخصوص عناصر ہیں۔

(ابوالفیض سحر، سردار جعفری کا اسلوب نگارش، شاعر، ستمبر 1970 ص:10)

''اسی کے ساتھ غالب کی متحرک اور رقصاں امیجری ہے، جو تصویر گری کی معراج ہے، جب وہ اپنی اچھوتی تشبیہوں اور نادر استعاروں کا جادو جگاتا ہے تو ایک ایک حرف نرت کرنے لگتا ہے۔ ٹھہرے ہوئے نقوش سیال ہو جاتے ہیں۔ مجرد خیال ایک پیکر رنگ و بو بن کر سامنے آجاتا ہے، دشت گرمئی رفتار سے جلنے لگتے ہیں"۔382

تنقید میں سردار جعفری کے اسلوب کا تجزیہ کرتے ہوئے نصرت جبین نے مثالیں بھی پیش کیں۔

چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

''بحیثیت نقاد سردار جعفری کے سفر کا آغاز 1950ء میں اس وقت ہوا جب ترقی پسند تحریک اپنے سنہرے دور کی تکمیل کر چکی تھی سردار جعفری نے اپنے تنقیدی مضامین کے لیے توضیحی نثر کا استعمال کیا۔ توضیحی نثر سے مراد وہ نثر ہے جس میں کسی خیال کی وضاحت کی جائے۔ خیال ایک مجرد حقیقت ہے۔ اس مجرد حقیقت کا اظہار ہم جن صوتی علامتوں کی مدد سے کرتے ہیں وہ الفاظ کہلاتے ہیں۔ الفاظ کے تانے بانے سے فقرے اور جملے بنتے ہیں اور اس طرح خیال ظہور میں آتا ہے۔ گویا الفاظ کی ایک منطقی ترتیب توضیح خیال کے لیے اولین شرط قرار پائی۔ اب جہاں تک خیال کی ساخت کا تعلق ہے یہ مشتمل ہے دو چیزوں پر۔ ایک دعویٰ دوسرے دلیل۔ دعویٰ اگر دلیل سے عاری ہے تو خیال وضاحت سے محروم رہ جائے گا۔ یہ تو ہوئے وہ لوازم جن کے بغیر توضیح خیال ممکن ہی نہیں۔ اب لکھنے والے کا کمال ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطلب ادا کرے۔ نثری اسلوب کے اسی وصف کو کمیت الفاظ کے اعتبار سے ایجاز اور کیفیت الفاظ کے لحاظ سے بلاغت کہتے ہیں۔ گویا توضیحی نثر کی چار بنیادی خصوصیات قرار پائیں۔

(i) وضاحت۔ (ii) ترتیب۔ (iii) استدلال۔ (iv) ایجاز اور بلاغت۔ وضاحت اور استدلال کے بہت سے طریقے ہیں جن میں سے ایک خطابت بھی ہے، علی سردار جعفری نے اپنی نثر کے لیے خطیبانہ اسلوب کو ہی منتخب کیا ہے۔ الفاظ کا آہنگ، جملوں کا زیر و بم، تشبیہوں سے بیان کی دلکشی بڑھانا۔ استفہامیہ لہجہ فن خطابت کے ناگزیر اجزا ہیں ..... وہ اپنی باتوں کو دلیلوں سے منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(II) ''غالب کی تعریف میں انہوں نے جو زبان استعمال کی ہے اس سے نثر کے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ انہوں نے بہت منضبط اور مرتب انداز میں الفاظ کا استمال کیا ہے جس سے جملے زیادہ مربوط اور مستحکم ہوجاتے ہیں۔

''اس شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لیے صرف لفظی معنوں سے واقف ہونا ضروری نہیں ہے۔ شعروں کو بار بار پڑھنا بھی ضروری ہے۔ پھر لفظ حرفوں کے مجموعہ کی شکل میں نہیں بلکہ تصویروں کی شکل میں پہچانے جائیں گے۔ آدمیوں کے چہروں کی طرح وہ آہستہ آہستہ مانوس ہوں گے اور اپنی شخصیت ظاہر کریں گے۔ لفظوں کا صوتی لوچ محسوس ہوگا اور ان کے باہمی ٹکراؤ کی جھنکار سے کان آشنا ہوں گے تب جا کر معنوی ترنم اور داخلی آہنگ کے دروازے کھلیں گے۔ اس طرح لفظی مفہوم سے گزر کر شاعرانہ مفہوم تک پہنچنے کا راستہ ملے گا اور وہ وجدانی کیفیت پیدا ہوگی جہاں وفا کا لفظ محبوب کی زلفوں کی طرح مہک اٹھے گا اور سرو چراغاں کرتا نظر آئے گا۔ عشق ذوق اور عمل بن جائے گا۔ حسن محبوب حسن کائنات میں تبدیل ہوجائے گا۔ نازو آدرش بن جائے گا جس کے حصول کے لیے دل وجان کی بازی لگانا خوش مذاقی کی دلیل ہے۔ شمشیر وسناں کا جلال اور انداز و ادا کا جمال جلوہ گر ہوگا۔ فراق کا درد آرزو کی لطافت میں تبدیل ہوجائے گا اور وصال لذت طلب کی سرشاری میں۔ شوق ایک قوت تخلیق بن کر ابھرے گا اور جستجو بن جائیگا جس کی راہیں کبھی زندان کی زنجیریں روکیں گی اور کبھی دیر وحرم کی دیواریں۔ جنہوں نے اپنے اندر شوق کی درماندگی کو سجا رکھا ہے اور میخانہ مکمل انسانیت اور مکمل آزادی کی منزل بن کر ابھرے گا۔ پھر ''دیوان غالب'' کے ورق پر اس کے تخئیل کی مخلوق انگڑائیاں لینے لگے گی۔ اس کے سراپا ناز محبوب آنکھوں کے سامنے مسکرائیں گے اور اور دنیا زیادہ خوبصورت ہوجائے گی اور انسان زیادہ قابل احترام''۔

جلال و جمال، فراق و وصال، دیر وحرم وعلامتیں ہیں جن کو اکثر شاعر اپنی شاعری میں خوبصورتی پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن سردار جعفری نے ان علامتوں کو نثر میں استعمال کر کے نثر کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ ان علامتوں میں معانی کی وہ وسعتیں پنہاں ہیں جن کی گہرائی میں جا کر ہی ہم مفہوم سمجھ سکتے ہیں۔ حروف عطف اور مترادفات کا بکثرت استعمال خطابت کا مخصوص طریقۂ کار ہے۔ سردار جعفری نے اپنی نثر میں جوش وولولہ کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے ان دونوں چیزوں کا بکثرت استعمال کیا ہے۔ شمشیر وسنان، انداز وادا، دشت وصحرا، دیر وحرم جیسے الفاظ کا استعمال ان کی نثر کے زوریاں کو اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ الفاظ کی تکرار بھی خطابت کا لازمہ ہے اور سردار جعفری نے اپنی نثر میں الفاظ کی تکرار سے بھی جوش وولولہ اور زور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن انہوں نے خطابت کی اس خوبی کا استعمال نثر میں بہت کم کیا ہے۔ کہیں کہیں الفاظ کی تکرار کے نمونے مل جاتے ہیں جیسے:

''غالب کی شاعری میں ترک دنیا، ترک لذت اور ترک طلب کے مضامین شاذونادر ہی ملیں گے۔''

ترک دنیا، ترک لذت اور ترک طلب جیسے الفاظ عبارت کو خطابت سے قریب تر کر دیتے ہیں۔

(III) ''علی سردار جعفری نے جہاں فن خطابت کی بیشتر فنی خصوصیات کو اپنی نثر میں استعمال کر کے جوش وولولہ اور بیان میں زور پیدا کیا ہے وہیں الفاظ کا شکوہ، لہجہ کی گونج، تشبیہ و کنایہ کا استعمال، جملوں کی نحوی ساخت کا استعمال ان کی نثر کو شاعرانہ نثر کی حدوں میں داخل کر دیتے ہیں''۔

(IV) ''میر کی شاعری کی تعریف میں الفاظ کے تضادات سے نثر میں ایک خوبصورت کیفیت پیدا کی ہے:

''میر کی شاعری کے تمام بکھرے ہوئے جلوے ایک صدرنگ گلستان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔اس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی۔بلبل بھی ہے صیاد بھی۔نشیمن بھی ہے اور بجلی بھی، زندہ رہنے کی امنگ بھی ہے اور مر جانے کا حوصلہ بھی۔اور یہی وجہ ہے کہ یہ شاعری آج بھی عظیم ہے اور زمانے کے بھول جانے کے بعد بھی دو سو برس پرانی زبان میں ہمارے جذبات اور احساسات کا ساتھ دے رہی ہے''۔

(V) ''اقبال شناسی'' میں اقبال کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس منزل پر پہنچ کر اقبال کی شاعری بے انتہا حسین اور زوردار ہو جاتی ہے۔اس میں سیلاب کا بہاؤ اور آبشاروں کی روانی آجاتی ہے اور ایک ایسا آہنگ پیدا ہوتا ہے جس کی مثال ایک ہزار برس کی فارسی شاعری اور اردو شاعری کی روایت میں نہیں ہے۔اس کی سامنے کوئی منزل منزل نہیں ہے، کوئی حد حد نہیں۔بے قراری اور آگے بڑھے جانے کا جذبہ۔جب کسی حسین چہرہ پر نظر پڑتی ہے تو دل اس سے زیادہ خوبصورت محبوب کے لیے تڑپ اٹھتا ہے۔شرر سے ستارے اور ستاروں سے آفتاب بن رہے ہیں۔فقط ذوق پرواز ہے زندگی، سکون و قرار موت کا دوسرا نام ہے''۔

اس اقتباس میں ''سیلاب کا بہاؤ'' اور آبشاروں کی روانی'' جیسے الفاظ عبارت میں ایک شان پیدا کر دیتے ہیں۔منزل منزل نہیں، حد حد نہیں، بے قراری اور تڑپ ایسے الفاظ ہیں جو عبارت میں خوبصورتی پیدا کر دیتے ہیں۔

(VI) ''سردار جعفری نے اپنی نثر میں تشبیہات کا استعمال کیا ہے لیکن دوسرے نثر نگاروں کی طرح نثری آرائش و زیبائش کیلیے نہیں بلکہ جملے کی معنی خیزی اور تہہ داری کو بڑھانے کے لیے کیا ہے''۔

''غالب نے یقیناً اس عقیدے سے بڑا رجائی نقطۂ نگاہ اختیار کیا ہے جو اس کی شاعری میں خون بہار کی طرح دوڑ رہا ہے۔''

اس جملے میں سردار جعفری نے جو تشبیہ استعمال کی ہے اس سے جملے کی معنی خیزی اور تہہ داری میں اضافہ ہو گیا ہے۔

''سبط حسن کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ستر سے پاؤں تک عشق کا مجسمہ، کسی افسانوی سرزمین کے شہزادے کی طرح جو یادوں کے محلوں اور بارہ دریوں میں سوئی ہوئی شہزادیوں کو جگا لاتے ہیں۔حسین چہرہ، جامہ زیب جسم، نفیس ترشے ہوئے ہونٹ، بڑی بڑی بے قرار آنکھیں اور نہایت مہذب اور سلجھی ہوئی زبان۔'' 384

تنقید میں علی سردار جعفری کے اسلوب میں سادگی، سلاست، نرمی شگفتگی، روانی، وضاحت، جامعیت، ساری دنیا کے اہم ادیبوں سے مثالیں، تقابل، تشبیہات، اتفاق کی جگہ فراخ دلی، اختلاف کی جگہ دلائل جیسی خصوصیات ملتی ہیں۔

☆☆☆

حواشی

1۔ڈاکٹرمحمدنسیم الدین فریس،عملی تنقید:ایک مطالعہ:شاداب،حیدرآباد،مارچ 1992،صفحہ 19

2۔پروفیسرفصیح احمدصدیقی،اردو یک بابی ڈراما:جنگ آزادیٔ ہند(85)تاحصول آزادیٔ ہند،1947ء،
تاریخی،تحقیقی وتنقیدی جائزہ،صفحہ 242

3۔پروفیسرسیدمحمودالحسن،اردونقید میں نفسیاتی عناصر،(جدیدتنقیدی رجحانات کی روشنی میں)،صفحہ 263تا265۔

4۔ڈاکٹرظہیراحمدصدیقی،ادب میں جمالیاتی اقدار:ایک مطالعہ،صفحہ 93،92

5۔خالدعلوی،غزل کےجدیدرجحانات،صفحہ 78

6۔خالدعلوی،غزل کےجدیدرجحانات،صفحہ 77,78

7۔ڈاکٹرسیدمحمدعقیل،مارکسی ادب اورادیب مشمولہ سماجی تنقیداورتنقیدی عمل ازسیدمحمدعقیل رضوی،
صفحہ 37,46,53,59۔

8۔پروفیسرشارب ردولوی،احتشام حسین اورجدیدتنقید مشمولہ تنقیدی مطالعے،صفحہ 51

9۔ڈاکٹرعرشیہ جبیں،شارب ردولوی:شخصیت اورتنقیدنگاری،صفحہ 174

10پروفیسرشارب ردولوی،جدیداورتنقید:اصول ونظریات،چھٹاایڈیشن،1994ء،صفحہ 479

11۔پروفیسرشارب ردولوی،اردوتنقید کےدس سال مشمولہ تنقیدی مطالعے،صفحہ 39

12۔پروفیسرشارب ردولوی،جدیداردوتنقید:اصول ونظریات،صفحہ 355

13۔فداالمصطفیٰ ندوی،احتشام حسین:حیات اورشخصیت،صفحہ 104

14۔ڈاکٹرعبدالمغنی،تشکیل جدید(تنقیدی مقالات)صفحہ 173,174,175

15۔ ڈاکٹرمحمدنسیم الدین فریس،عملی تنقید:ایک مطالعہ:شاداب،حیدرآباد،مارچ 1992،صفحہ 29تا34

16۔ڈاکٹرمحمدنسیم الدین فریس،عملی تنقید:ایک مطالعہ:شاداب،حیدرآباد،مارچ 1992،صفحہ 35

17۔ڈاکٹرمحمدنسیم الدین فریس،عملی تنقید:ایک مطالعہ:شاداب،حیدرآباد،مارچ 1992،صفحہ 35

18۔راشدانوورراشد،سرورکی تنقیدی بصیرت،آج کل،جون 2002ء،صفحہ 23

19۔سردارجعفری:دیباچہ،پیغمبران سخن،صفحہ 8

20۔راہی معصوم رضا،سردارجعفری،گفتگوبندنہ ہو،افکار،سردارجعفری نمبر،نومبر،دسمبر 1991،صفحہ 94

21۔علی سردارجعفری،کالوبھنگی:ایک کردار،ایک علامت مشمولہ کرشن چندر:شخص اورادیب،
مرتبہ پروفیسرعبدالستاردلوی،صفحہ 105

22۔محمدایوب واقف،مکاتیب علی سردارجعفری مشمولی علی سردارجعفری(شخص،شاعراورادیب)
مرتبہ پروفیسرعبدالستاردلوی،صفحہ 446

23۔علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، صفحہ 9,10

24۔علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، صفحہ 15

25۔علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، صفحہ 18

26۔عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 326 تا 331

27۔پروفیسر قمر رئیس، سردار جعفری اور مارکسی تنقید مشمولہ تعبیر و تحلیل مرتبہ پروفیسر قمر رئیس، صفحہ 285,283,282۔

28۔پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، ادبی ڈائری (جلد اول) صفحہ 38,39

29۔محمد اجمل خان، علی سردار جعفری کی نثری خدمات کا تنقیدی مطالعہ،
مقالہ برائے پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی 2010 (غیر مطبوعہ) صفحہ 116,115

30۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ 49

31۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ 40,62,63

32۔عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 338,339

33۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب صفحہ 102 تا 108، بحوالہ علی سردار جعفری از عمر رضا، صفحہ 339,340,341

34۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب صفحہ 114 تا 116، بحوالہ عمر رضا، علی سردار جعفری 340,342

35۔عمر رضا علی سردار جعفری، صفحہ 342

36۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ 234

37۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ 117

38۔عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 201,202

39۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ 106

40۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، طبع دوم، 1957، صفحہ 256

41۔منٹو کے ادبی مضامین، صفحہ 297

42۔ڈاکٹر صادق، ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، صفحہ 145,146,149,150

43۔شافع قدوائی، علی سردار جعفری کی تنقید، آج کل، اپریل 1998ء، صفحہ 30

44۔شافع قدوائی، علی سردار جعفری کی تنقید، آج کل اپریل 1998ء، صفحہ 30

45۔ علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، طبع اول، علی گڑھ، صفحہ 165

46۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ 165,166,167

47۔پروفیسر گوپی چند نارنگ، ہندوستانی کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، صفحہ 484,485,500

48۔کلیم الدین احمد، ترقی پسند ادب پر دو کتابیں مشمولہ اردو تنقید پر ایک نظر، صفحہ 366,368,375

49۔عقیل احمد صدیقی، جدید اردو نظم: نظریہ و عمل (1936 تا 1970) صفحہ 70

50۔سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ 244

51۔پروفیسر بیگ احساس، کرشن چندر: شخصیت اور فن، صفحہ 230

52۔پروفیسر محمد حسن، ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے: سردار جعفری کو آخری سلام،
ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 9

53۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ 71

54۔پروفیسر قمر رئیس، سردار جعفری اور نیا تنقیدی شعور، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1981، ص 457,459

55۔شافع قدوائی، علی سردار جعفری کی تنقید آج کل، اپریل 1998ء، صفحہ: 28

56۔شافع قدوائی، علی سردار جعفری کی تنقید، آج کل اپریل 1998 ص: 30

57۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، ص: 152

58 علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، ص: 158

59۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، ص: 114

60۔پروفیسر سید فضل امام رضوی، سردار جعفری کا انتقادی عمل مشمولہ سردار جعفری،
شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، ص: 155- 154

61 عمر رضا، علی سردار جعفری، ص: 327

62۔پروفیسر یوسف سرمست، ترقی پسند تحریک اور اقبال مشمولہ ادب نقد حیات (مرتبہ یوسف سرمست)
ص: 36, 38, 39

63۔شافع قدوائی۔علی سردار جعفری کی تنقید، آج کل، اپریل 1998ء صفحہ 29

64۔ڈاکٹر عبدالقیوم، ترقی پسند ادب پر ایک نظر، صفحہ 55,65,69,70,80,81

65۔پروفیسر قمر رئیس، علی سردار جعفری اور نیا تنقیدی شعور، افکار،
سردار جعفری نمبر نومبر، ڈسمبر 1991ء ص: 459, 460

66 عمر رضا، علی سردار جعفری، ص: 517

67 علی سردار جعفری، دیباچہ، اقبال شناسی، ص: 11-12

68 عمر رضا، علی سردار جعفری، ص: 518, 521, 522

69 علی سردار جعفری، اقبال شناسی ص: 43 بحوالہ علی سردار جعفری، از عمر رضا، ص: 521 , 522

70 علی سردار جعفری، اقبال اور فرنگی، فکر اقبال، مقالات حیدرآباد سمینار مرتبین ڈاکٹر عالم خوندمیری،
ڈاکٹر مغنی تبسم، ص: 58, 59

71۔علی سردار جعفری، اقبال اور فرنگی، فکر اقبال، فکر اقبال۔مقالات۔حیدر آباد سمینار۔
مرتبین ڈاکٹر عالم خوندمیری، ڈاکٹر مغنی تبسم، ص: 82
72۔علی سردار جعفری، اقبال اور فرنگی، فکر اقبال، مقالات۔حیدر آباد سمینار۔
مرتبین ڈاکٹر عالم خوندمیری، ڈاکٹر مغنی تبسم، ص: 89, 90,91
73۔علی سردار جعفری، اقبال شناسی، ص:89
74۔علی سردار جعفری، اقبال شناسی، ص: 90
75۔علی سردار جعفری، اقبال شناسی، 91
76۔علی سردار جعفری، اقبال شناسی، صفحہ:95
77۔علی سردار جعفری، اقبال شناسی، صفحہ:102, 103
78۔علی سردار جعفری، اقبال شناسی، صفحہ:107 , 108
79۔علی سردار جعفری، اقبال شناسی، صفحہ:108
80۔علی سردار جعفری، اقبال شناسی، صفحہ:110
81۔علی سردار جعفری، اقبال شناسی، صفحہ:111
82۔عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ:528تا533
83۔مظہر جمیل، سردار جعفری اور اقبال شناسی، افکار، سردار جعفری نمبر، صفحہ 576
84۔مظہر جمیل، سردار جعفری اور اقبال شناسی، افکار، سردار جعفری نمبر، صفحہ 576 تا 580۔
85۔ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، معاصر تنقیدی رویے، صفحہ 188,189
86۔پروفیسر قمر رئیس سے انٹرویو، شرکا محمد علی صدیقی، پروفیسر عتیق احمد، پروفیسر حسن عابدی، مسلم شمیم،
راحت سعید، مظہر جمیل، اشفاق حسین، سہ ماہی تناظر، نئی دہلی، دسمبر 1987ء ص:135
87۔علی سردار جعفری، پیغمبران سخن (دیباچہ) ص:8,9
88۔شافع قدوائی، علی سردار جعفری کی تنقید، آج کل، اپریل، 1998ء، ص:30
89۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی، سردار جعفری اور ترقی پسندی مشمولہ نئی تنقید۔نئے اقدار از علی فاطمی، ص:146 تا148
90۔ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، معاصر تنقیدی رویے، ص:184
91۔پروفیسر قمر رئیس، سردار جعفری، اور نیا تنقیدی شعور، ص:461
92۔شافع قدوائی، علی سردار جعفری کی تنقید، آج کل، اپریل، 1998ء، ص:31
93۔سردار جعفری، پیغمبران سخن، ص:28-27
94۔عمر رضا، علی سردار جعفری، ص:494، 496، 498، 499

95۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی، سردار جعفری اور ترقی پسندی مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفسر عبدالستار دلوی، صفحہ:302
96۔عمر رضا، علی سردار جعفری، ص:510 '509 '502'508 '500
97۔علی سردار جعفری، پیغمبران سخن، ص:50
98۔علی سردار جعفری، پیغمبران سخن، ص:49۔بحوالہ: شافع قدوائی، علی سردار جعفری کی تنقید،
آج کل، اپریل1998، ص:31-32
99۔ڈاکٹر صاحب علی، علی سردار جعفری کے مرتبہ کلاسیکی دواوین، مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، ص:454'455
100۔سردار جعفری، پیغمبران سخن، ص:173
101۔عمر رضا، علی سردار جعفری، ص:516 '515 '513'514 '511
102۔ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، معاصر تنقیدی رویے، ص:187
103۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی، سردار جعفری اور ترقی پسندی مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفسر عبدالستار دلوی، صفحہ:304 '303 '302
104۔علی سردار جعفری، پیغمبران سخن، ص:157
105۔علی سردار جعفری، پیغمبران سخن، ص:173
106۔پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، غالب کے چند نقاد، صفحہ:205 '203 '201 '200
107۔علی سردار جعفری، دیباچہ۔دیوان غالب (مرتبہ سردار جعفری) ص:27۔بحوالہ سلیمان اطہر جاوید،
سردار جعفری کی شاعری مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، ص:
108۔پروفیسر شارب ردولوی، سردار جعفری اور نقد شعر، مشمولہ، علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ:391
109۔پروفیسر شارب ردولوی، کلیدی خطبہ، سردار جعفری: ترقی پسند ادب کا ایک بلیغ استعارہ،
مشمولہ سردار جعفری (شخصیت اور فن) مرتبہ اصغر عباس، صفحہ:32-33
110۔ڈاکٹر اسلم پرویز، شاعر علی سردار جعفری، مشمولہ علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، گجرات اردو ساہتیہ اکادمی،
گاندھی نگر، صفحہ 94-95
111۔علی سردار جعفری، کالو بھنگی: ایک کردار، ایک علامت، مشمولہ کرشن چندر: شخص اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 110
112۔ خالد علوی، غزل کے جدید رجحانات، ص:84

113۔پروفیسر نظیر صدیقی،علی سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس،صفحہ 54-61

114۔مظہر امام،سردار جعفری کی ہمہ جہتی،اردو دنیا،ستمبر 2000،صفحہ 26

115۔پروفیسر شارب ردولوی،تنقیدی مباحث،صفحہ 46-45

116۔سید شاہد مہدی،پیش گفتار،سرمایہ سخن جلد اول از علی سردار جعفری،صفحہ 10-9

117۔عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 572

118۔عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 575

119۔علی سردار جعفری،سرمایۂ سخن،صفحہ 31-30

120۔علی سردار جعفری،سرمایۂ سخن،صفحہ 47 -46

121۔عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ:591 - 590

122۔سردار جعفری،ذوق جمال مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں،صفحہ:333-332-331-328

123۔عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ: 589- 586 - 585

124۔سردار جعفری،ذوق جمال مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز،صفحہ:327 - 326

125۔آج کل،اکتوبر 2001،صفحہ:43

126۔محمد اجمل خاں،علی سردار جعفری کی نثری خدمات کا تنقیدی مطالعہ(مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی)
شعبہ اردو،دہلی یونیورسٹی،2010(غیر مطبوعہ)،صفحہ:357

127۔۔محمد اجمل خاں،علی سردار جعفری کی نثری خدمات کا تنقیدی مطالعہ(مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی)
شعبہ اردو،دہلی یونیورسٹی،2010(غیر مطبوعہ)،صفحہ:22

128۔پروفیسر محمد حسن،خطبہ صدارت:سردار جعفری کی وراثت مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن
مرتبہ اصغر عباس،صفحہ:22

129۔ڈاکٹر صاحب علی،علی سردار جعفری کے مرتبہ کلاسیکی دواوین مشمولہ علی سردار جعفری(شخص،شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ:468 ,464 ,463 ,460 ,456 ,453

130۔علی سردار جعفری،جدید اردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات،مشمولہ علی گڑھ میگزین،
جلد:14 نمبر 3،جولائی 1936ء،صفحہ:15

131۔عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ: 85 , 74

132۔عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ: ,76, 77

133۔علی سردار جعفری،نوجوانوں کے ادبی رجحانات مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں
مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز،صفحہ:69 - 74

134۔علی سردار جعفری،نوجوانوں کے ادبی رجحانات مشمولہ عربک کالج میگزین (دہلی)
شمارہ مارچ 1938ء صفحہ:38بحوالہ علی سردار جعفری از عمر رضا،صفحہ:86
135۔علی سردار جعفری،نوجوانوں کے ادبی رجحانات مشمولہ عربک کالج میگزین (دہلی)
شمارہ مارچ 1938ء صفحہ:42بحوالہ علی سردار جعفری از عمر رضا،صفحہ:86
136۔عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ:86
137۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی،سردار جعفری اور ترقی پسندی مشمولہ نئی تنقید۔نئے اقدار نظر از علی احمد فاطمی،صفحہ:151 ,150
138۔علی سردار جعفری،کالو بھنگی:ایک کردار،ایک علامت،مشمولہ کرشن چندر:شخص اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 105
139۔شافع قدوائی،علی سردار جعفری کی تنقید،آج کل،اپریل 1998،صفحہ:29
140۔یوسف ناظم،مجروح کو الوداع کہتے ہوئے،نیا سفر،علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری نمبر،
جولائی تا دسمبر 2000،صفحہ:168-167
141۔سردار جعفری،بدزبان،افکار،منٹو نمبر،1945،صفحہ:53
142۔سردار جعفری،بدزبان،افکار،منٹو نمبر،1945،صفحہ:54
143۔سردار جعفری،بدزبان،افکار،منٹو نمبر،1945،صفحہ:,54,55
144۔سردار جعفری،بدزبان،افکار،منٹو نمبر،1945،صفحہ:55,64
145۔عبدالشکور،تنقیدی سرمایہ حصہ دوم،صفحہ:,129,126
146۔ای اے حیدری،ہندوستان میں نئی اردو غزل کا مزاج و میلان،صفحہ:43
147۔۔ای اے حیدری،ہندوستان میں نئی اردو غزل کا مزاج و میلان،صفحہ:,131,132
148۔پروفیسر ابوالکلام قاسمی،معاصر تنقیدی رویے،صفحہ:182 ,181
149۔ڈاکٹر ایوب مرزا،فیض نامہ،صفحہ:,74,75
150۔ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید،اردو شاعری میں اشاریت،صفحہ:,200 ,199
151۔فیض احمد فیض،میزان،ناشرین لاہور،فروری 1962،طبع اول،صفحہ:
17بحوالہ اردو شاعری میں اشاریت از ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید،صفحہ:200
152۔ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید،اردو شاعری میں اشاریت،صفحہ:210
153۔پرکاش،پنڈت،ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس (17/اپریل 1976بمقام دہلی)
مشمولہ اردو میں رپورتاژ نگاری از عبدالعزیز،صفحہ:256
154۔عقیل احمد صدیقی،جدید اردو نظم:نظریہ و عمل 1936 تا 1970،صفحہ:75

155۔نظیرصدیقی،فیض احمدفیض (نقش فریادی سے زنداں نامہ تک)مشمولہ نقدفیض

مرتبہ نسیم عباسی،صفحہ:210, 209

156۔ہمعصر ادبی مسائل،سردارجعفری سے انٹرویو،عالمی اردوادب،سردارجعفری نمبر 2001ء صفحہ:142,143

157۔ہم عصر ادبی مسائل،سردارجعفری سے ایک انٹرویو،عالمی اردوادب،سردارجعفری نمبر،

سردارجعفری:فن اور شخصیت،صفحہ:, 148,150,165,166,167

158۔پروفیسرمحمدحسن،خطبہ صدارت:سردارجعفری کی وراثت مشمولہ سردارجعفری شخصیت اورفن

مرتبہ اصغرعباس،صفحہ:17

159۔پروفیسرمحمدحسن،خطبہ صدارت:سردارجعفری کی وراثت مشمولہ سردارجعفری شخصیت اورفن

مرتبہ اصغرعباس،صفحہ:, 16,17

160۔پروفیسروارث کرمانی،ملک الشعراءسردارجعفری مشمولہ سردارجعفری،شخصیت اورفن

مرتبہ اصغرعباس،صفحہ:, 103, 104

161۔سردارجعفری،ادب میں تنگ نظری،شاہراہ،دہلی،فروری مارچ 1952،صفحہ: 6,27

162۔علی سردارجعفری،عوامی شاعری اورعوامی زبان،شاہراہ دہلی،اکتوبر 1952،صفحہ:6تا12

163۔علی سردارجعفری،یہ ترقی پسندی نہیں ہے،شاہراہ دہلی،ستمبر اکتوبر 1954ء،صفحہ:, 57,64,65,67

164۔ سردارجعفری،وجد کی شاعری،مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں

مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:, 157,158,159

165۔سردارجعفری،وجد کی شاعری،مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:160 تا165

166۔سردارجعفری،کفن بردوش،مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:, 168,169

167۔سردارجعفری،کفن بردوش،مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:171 ,170

168۔سردارجعفری،کفن بردوش،مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:173,174

169۔سردارجعفری،کفن بردوش،مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:175 ,174

170۔سردارجعفری،میرتقی میر کی شاعری مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:182

171۔سردارجعفری،میرتقی میر کی شاعری مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:182,183

172۔سردارجعفری،میرتقی میر کی شاعری مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں

مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:, 183,184,185,190

173۔سردارجعفری،میرتقی میر کی شاعری مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:192

174۔سردارجعفری،میرتقی میر کی شاعری مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:201

175۔سردار جعفری، میر تقی میر کی شاعری مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:203

176۔سردار جعفری، نیا عہد نامہ، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:205

177۔سردار جعفری، نیا عہد نامہ، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:207,208

178۔علی سردار جعفری لمحوں کے چراغ (موت زندگی کے آئینے میں) آج کل، جنوری 1996ء، صفحہ:4,5,6,

179۔علی سردار جعفری لمحوں کے چراغ (موت زندگی کے آئینے میں) آج کل، جنوری 1996ء، صفحہ:8

180۔علی سردار جعفری لمحوں کے چراغ (موت زندگی کے آئینے میں) آج کل، جنوری 1996ء، صفحہ:12

181۔علی سردار جعفری لمحوں کے چراغ (موت زندگی کے آئینے میں) آج کل، جنوری 1996ء، صفحہ:8

182۔علی سردار جعفری لمحوں کے چراغ قسط 1 تا قسط 4، آج کل، جنوری 1996، صفحہ:4,5,6,8,

183۔سردار جعفری، مراٹھی زبان کا انقلابی شاعر نارائن سروپ، ماہنامہ کتاب، لکھنو،
اپریل مئی 1974ء، صفحہ: 85, 86,

184۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی، سردار جعفری اور ترقی پسندی مشمولہ، نئی تنقید نئے اقدار، از علی احمد فاطمی، صفحہ:153

185۔علی سردار جعفری، غالب کی شاعری کا ہندی ترجمہ اور جمالیاتی فضاء کی بازیافت، نقوش،
غالب نمبر 3، شمارہ:116، 1971ء، صفحہ:345, تا 356

186۔ سردار جعفری، رقص شرر، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:266, 267,

187۔ سردار جعفری، رقص شرر، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:269

188۔ سردار جعفری، ن۔م۔راشد، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:261

189۔ سردار جعفری، ن۔م۔راشد، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:263,264

190۔علی سردار جعفری، میری دھرتی میرے لوگ (ایک مطالعہ)، پونم، اگست 1977، صفحہ:3,4,

191۔علی سردار جعفری، میری دھرتی میرے لوگ (ایک مطالعہ)، پونم، اگست 1977، ص:5

192۔سردار جعفری، اقبال کی غزل، سہ ماہی گفتگو، مارچ 1977، ستمبر 1977، ڈسمبر 1977، صفحہ:25 تا 29

193۔علی سردار جعفری، کالو بھنگی: ایک کردار، ایک علامت، مشمولہ کرشن چندر: شخص اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 110, تا 118

194۔علی سردار جعفری، کالو بھنگی: ایک کردار، ایک علامت، مشمولہ کرشن چندر: شخص اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 108,

195۔علی سردار جعفری، کالو بھنگی: ایک کردار، ایک علامت، مشمولہ کرشن چندر: شخص اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 105,106,

196۔علی سردار جعفری، کالو بھنگی: ایک کردار، ایک علامت، مشمولہ کرشن چندر: شخص اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 117,

197۔علی سردار جعفری، کالو بھنگی: ایک کردار، ایک علامت، مشمولہ کرشن چندر: شخص اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 110,
198۔علی سردار جعفری، کالو بھنگی: ایک کردار، ایک علامت، مشمولہ کرشن چندر: شخص اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 110, 111,
199۔سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ: 236, 244,
200۔سردار جعفری، دیباچہ، ''ہم وحشی ہیں'' بحوالہ کرشن چندر: شخصیت اور فن از پروفیسر بیگ احساس، صفحہ:225
201۔علی سردار جعفری، کیفی اعظمی: عکس اور جہتیں مرتبہ شاہد ماہلی، صفحہ:199
202۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی، سردار جعفری اور ترقی پسندی مشمولہ نئی تنقید۔نئے اقدار نظر از علی احمد فاطمی، ص: 151,152,
203۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب صفحہ:140
204۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب صفحہ:160
205۔شافع قدوائی، علی سردار جعفری، آج کل، اپریل 1998، صفحہ:29
206۔سردار جعفری، قتیل شفائی، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ: 279,280,
207۔سردار جعفری، قتیل شفائی، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ: 281,
208۔''لمحے لمحے'': راحت اندوری: شاعر اور شخص مرتبہ طارق شاہین و عزیز عرفان، الف پبلی کیشنز، خضر آباد،
کھجرانہ، اندور، 2002، صفحہ:378
209۔پروفیسر ضیاء (علیگ)، جعفری صاحب کینڈا میں، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991 صفحہ:246
210۔علی سردار جعفری، عندلیب گلشن نا آفریدہ، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں، مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:286
211۔سردار جعفری، ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری بحوالہ عزیز قیسی سردار جعفری کی نظمیں،
افکار، نومبر 1991، صفحہ:475
212۔سردار جعفری، حرف حق کے شدید احساس کی شاعری (تمنا کا دوسرا قدم: پروین فنا)
مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ 453, 452,
213۔سردار جعفری: حرف حق کے شدید احساس کی شاعری (تمنا کا دوسرا قدم: پروین فنا)
مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:450
214۔سردار جعفری: حرف حق کے شدید احساس کی شاعری (تمنا کا دوسرا قدم: پروین فنا)
مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:452
215۔سردار جعفری، انیس کی معجز بیانی مشمولہ انیس شناسی مرتبہ پروفیسر کوپی چند نارنگ، صفحہ:30
216۔سردار جعفری، انیس کی معجز بیانی مشمولہ انیس شناسی مرتبہ پروفیسر کوپی چند نارنگ، صفحہ:33 تا 35

217۔سردار جعفری، چراغ لالہ مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ: 297,298

218۔سردار جعفری، چراغ لالہ مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ: 305,306,307,

219۔سردار جعفری، چراغ لالہ مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ: 301 تا 304

220۔سردار جعفری، پابلو نرودا، نیا ورق، فبروری تا جولائی 2004ء، ص: 47,48

221۔سردار جعفری، پابلو نرودا، نیا ورق، فبروری تا جولائی 2004ء، ص: 54

222۔علی سردار جعفری، اقبال اور کمیونزم مشمولہ اقبال اور مغرب مرتبہ آل احمد سرور، ص: 125, تا 141

223۔علی سردار جعفری، کمیونیزم کی ناکامی؟ افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء، ص: 47

224۔علی سردار جعفری، کمیونیزم کی ناکامی؟ افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء، ص: 47

225۔علی سردار جعفری، کمیونیزم کی ناکامی؟ افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء، ص: 48

226۔ڈاکٹر تاج پیامی، شعور تنقید، ص: 80,81,83,

227۔عمر رضا، علی سردار جعفری، ص: 558

228۔عمر رضا، علی سردار جعفری، ص: 558

229۔ظفر امام، مارکسزم: ایک مطالعہ، مسلمانوں کا سوشلسٹ سنٹر، نئی دہلی، 1971ء، ص: 111

230۔عمر رضا، علی سردار جعفری ص: 558 تا 563

231۔عمر رضا، علی سردار جعفری ص: 142

232۔حسن عابدی، سوویت روس میں نئی تبدیلیوں کا پس منظر، افکار، سردار جعفری نمبر، ص: 74,71

233۔عمر رضا، علی سردار جعفری، ص: 558 تا 566

234۔علی سردار جعفری، تین ہندوستانی: ایک بادشاہ، ایک شہنشاہ، ایک شاعر، نیا دور، مارچ اپریل 1993ء، ص: 12

235۔سردار جعفری، شہری کلچر کا پہلا شاعر، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں،

مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص: 394,395,397,398,400

236۔عمر رضا، علی سردار جعفری، ص: 567 تا 571

237۔علی سردار جعفری، سرمایہ سخن جلد اول، صفحہ: 189,190,

238۔علی سردار جعفری، میر انعرہ روئی اور کتاب ہے مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں

مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص: 401,402,

239۔سردار جعفری، دیباچہ: ہم وحشی ہیں از کرشن چندر مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں،

مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص: 414,415,

240۔سردار جعفری، دیباچہ: چغد از سعادت حسین منٹو مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں،

مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص: 416,417,

241۔سردار جعفری، دیباچہ:چغدا زسعادت حسین منٹومشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 417,
242۔سردار جعفری، دیباچہ:چغدا زسعادت حسین منٹومشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 417,
243۔سردار جعفری، پیش لفظ،نئی دنیا کوسلام،ازسردار جعفری،ص:8
244۔پروفیسر زاہدہ زیدی،نئی دنیا کوسلام،ایک تجزیاتی مطالعہ،نیا سفر،
علی سردار جعفری ومجروح سلطان پوری نمبر، جولائی تا دسمبر 2000ص:57
245۔سردار جعفری، پیش لفظ،نئی دنیا کوسلام،ازسردار جعفری،ص:9
246۔پروفیسر زاہدہ زیدی،نئی دنیا کوسلام،ایک تجزیاتی مطالعہ،نیا سفر،
علی سردار جعفری ومجروح سلطان پوری نمبر، جولائی تا دسمبر 2000ص: 58,59,60,78,79,
247۔سردار جعفری، دیباچہ:جب کھیت جاگے از کرشن چندر مشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 419,
248۔سردار جعفری، دیباچہ:جب کھیت جاگے از کرشن چندر مشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 420,421,
249۔سردار جعفری، دیباچہ:جب کھیت جاگے از کرشن چندر مشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 425,
250۔سردار جعفری، دیباچہ:جب کھیت جاگے از کرشن چندر مشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 426,427,
251۔سردار جعفری، دیباچہ:جب کھیت جاگے از کرشن چندر مشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 428,
252۔سردار جعفری،تعارف،غزل ازمجروح سلطان پوری،مشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 430,
253۔سردار جعفری،تعارف،غزل ازمجروح سلطان پوری،مشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 430,431,432,
254۔سردار جعفری،تعارف،غزل ازمجروح سلطان پوری،مشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 434,
255۔سردار جعفری،تعارف،غزل ازمجروح سلطان پوری،مشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص:431

256۔علی سردار جعفری، دیباچہ، پرچھائیاں از ساحر لدھیانوی، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں،
مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص:435

257۔علی سردار جعفری، دیباچہ، پرچھائیاں از ساحر لدھیانوی، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں،
مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص:437

258۔علی سردار جعفری، دیباچہ، پرچھائیاں از ساحر لدھیانوی، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں،
مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص:438,439۔

259۔علی سردار جعفری، دیباچہ، پرچھائیاں بحوالہ، آؤ کہ کوئی خواب بنیں: ساحر لدھیانوی،
ص:90 بحوالہ ساحر لدھیانوی: حیات اور کارنامے از ڈاکٹر انور ظہیر انصاری، ص:65

260۔علی سردار جعفری، دیباچہ: پرچھائیاں، از ساحر لدھیانوی بحوالہ کلیات ساحر مرتبہ صفدر حسین، ص:168

261۔ڈاکٹر انور ظہیر خاں، ساحر لدھیانوی: حیات اور کارنامے، ص:83,84

262۔علی سردار جعفری، دیباچہ: ساحر لدھیانوی، از ساحر لدھیانوی مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں
مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص:435

263۔سردار جعفری، حرف آغاز: آتش تر، از خمار بارہ بنکوی مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں
مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص:440,441,442

264۔علی سردار جعفری، پیش لفظ: ابلیس کی دوسری مجلس شوریٰ (از کیفی اعظمی)
مشمولہ کیفی اعظمی: عکس اور جہتیں مرتبہ شاہد ماہلی، ص: 471,472

265 ۔ علی سردار جعفری، پیش لفظ: ابلیس کی دوسری مجلس شوریٰ (از کیفی اعظمی)
مشمولہ کیفی اعظمی: عکس اور جہتیں مرتبہ شاہد ماہلی، ص:473,474

266 ۔سردار جعفری، نئی خوشبو، سہ ماہی گفتگو، مارچ 1977، ستمبر 1977
دسمبر 1977 ص:236,237,241

267۔علی سردار جعفری، دیباچہ: ساون بھادوں از رفعت سروش، فکر و آگہی، رفعت سروش نمبر 434

268۔سردار جعفری: دیباچہ: نگاہ از اختر سعید خاں مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں، مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص:459

269۔علی سردار جعفری، عشرت آفریں ی شاری (دیباچہ: کنج پیلے پھولوں کا) مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں
مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص:467,468,470,474,476,477,478,479

270۔سردار جعفری، پیش لفظ: کیا دن تھے از قاضی جلیل عباسی، ص: 11

271۔سردار جعفری، پیش لفظ: خزاں کے پھول از عادل رشید بحوالہ اردو میں رپورتاژ نگاری: فن اور ارتقا از ڈاکٹر ایس
ایم زیڈ گوہر، ص:62,63

272۔ڈاکٹرایس ایم زیڈ گوہر،اردو میں رپورتا ژنگاری:فن اورارتقاء،ص:63

273۔سردارجعفری،پیش لفظ،کیادن تھےازقاضی جلیل عباسی،ص:10,11

274۔شکیل الرحمٰن،مشاہیر کےسوچ فلک پر،انتخاب وترتیب ازافتخارامام صدیقی،شاعر،جولائی 2010،ص:15

275۔انٹرویو18/اپریل 1990 ممبئی،راہی معصوم رضا۔علی سردارجعفری،گفتگوبندنہ ہو،

افکار،سردارجعفری نمبرنومبردسمبر ,1991ص:83

276۔ڈاکٹررفیعہ شبنم عابدی،مشاہیر کےجل ترنگ لہریوں میں،شاعر،مارچ 2010،ص:19

277۔بیکل اتساہی بزرگ اورمعاصرین کےکینوس پر،شاعر،جنوری 2010،ص:14

278۔سردارجعفری:دیباچہ:نگاہ ازاختر سعیدخاں مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں

مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص:454,455

279۔سردارجعفری:دیباچہ:نگاہ ازاختر سعیدخاں مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں،مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص:460

280۔سردارجعفری:تبصرہ:خموشی بول اٹھی ہے(بتقریب رسم اجراء،فبروری, 1991 شاعر،ستمبر 2000،ص:10

281۔ڈاکٹرملک زادہ منظوراحمد،تاثرات مشمولہ لمحے لمحے ازراحت اندوری،شاعراورشخص

مرتبہ طارق شاہین اورعزیزعرفان،الف پبلی کیشنز،فیض آباد کھجرانہ،اندور, 2002،ص:389

282۔ہم عصرادبی مسائل،سردارجعفری سےایک انٹرویو،عالمی اردوادب،سردارجعفری نمبر 2001

سردارجعفری:فن اورشخصیت،ص:142

283۔شکیل الرحمٰن،آشرم(خودنوشت سوانح حیات)ص:277

284۔فن اورشخصیت کملیشورنمبر،ص:34

285۔نکہت کاظمی،سردارجعفری کی ایک خواہش،اردو دنیا،ستمبر 200،ص: 90

286۔ڈاکٹرمحمد نسیم الدین فریس،سردارجعفری کےخطوط،فکروتحقیق،اپریل تاجون 2004ص:90

287۔سردارجعفری،مکتوب بنام سلطانہ جعفری،مورخہ 6/اکتوبر 1949بحوالہ سردارجعفری،خطوط،

ازڈاکٹرمحمد نسیم الدین فریس،فکروتحقیق،اپریل تاجون 2004ص:90

288۔سردارجعفری،مکتوب بنام سلطانہ جعفری،مورخہ 13/مئی 1950بحوالہ سردارجعفری کےخطوط،

ازڈاکٹرمحمد نسیم الدین فریس،فکروتحقیق،اپریل تاجون 2004،ص:89- 90

289۔سردارجعفری،مکتوب بنام سلطانہ جعفری مورخہ 17/مئی 1950بحوالہ سردارجعفری کےخطوط

ازڈاکٹرمحمد نسیم الدین فریس،فکروتحقیق،اپریل تاجون 2004،ص: 90

290۔سردارجعفری،مکتوب بنام ماہنامہ صبا،حیدرآباد،مورخہ 16/اگست 1956،صبا،دسمبر 1956،صفحہ:79

291۔سردارجعفری،مکتوب بنام پروفیسرگیان چندجین،مورخہ 10/دسمبر 1969بحوالہ سردارجعفری کےخطوط

مرتبہ ڈاکٹرخلیق انجم،ص: 50,51

292۔ڈاکٹرمحمدنسیم الدین فریس،سردارجعفری کے خطوط،فکروتحقیق،اپریل تا جون 2004،ص:84,83 اور
سردارجعفری کے مکتوب بنام مظہرامام مورخہ 4/اگست 1995 مشمولہ سردارجعفری کے خطوط،
مرتبہ ڈاکٹرخلیق انجم،ص:94

293۔ڈاکٹرمحمدنسیم الدین فریس،سردارجعفری کے خطوط،فکروتحقیق،اپریل تا جون 2004،ص:,78,79

294۔ڈاکٹرمحمدنسیم الدین فریس،سردارجعفری کے خطوط،فکروتحقیق،اپریل تا جون 2004،ص:87اورسردارجعفری،
مکتوب بنام ڈاکٹرسیدمحمدعقیل رضوی،مورخہ 10/نومبر 1979 مشمولہ سردارجعفری کے خطوط،
مرتبہ ڈاکٹرخلیق احمد،ص:141 to 139

295۔ڈاکٹرمحمدنسیم الدین فریس،سردارجعفری کے خطوط،فکروتحقیق،اپریل تا جون 2004،ص:87-86اور
سردارجعفری،مکتوب بنام سیدمحمدعقیل رضوی،مورخہ،3/مئی، 1991 مشمولہ سردارجعفری کے خطوط،
مرتبہ ڈاکٹرخلیق انجم،ص:,154,155

296۔سردارجعفری،مکتوب بنام عادل اسیردہلوی،مورخہ 23/اپریل 1996
مشمولہ سردارجعفری کے خطوط،مرتبہ ڈاکٹرخلیق انجم،ص:207,208

297۔علی سردارجعفری کے مکتوب بنام جاں نثار،فن اورشخصیت،جاں نثاراختر نمبر،ص:54 تا 51

298۔علی سردارجعفری کے مکتوب بنام جاں نثار،فن اورشخصیت،جاں نثاراختر نمبر،مارچ 1976،ص:51

299۔سردارجعفری،مکتوب بنام ڈاکٹرعلی احمدفاطمی،مورخہ 10/اگست 1998
مشمولہ سردارجعفری کے خطوط مرتبہ ڈاکٹرخلیق انجم ،ص:186

300۔سردارجعفری،مکتوب بنام ڈاکٹرعلی احمدفاطمی مورخہ 16/مارچ،1992
مشمولہ سردارجعفری کے خطوط مرتبہ ڈاکٹرخلیق انجم،ص:174

301۔سردارجعفری مکتوب بنام ڈاکٹرسیدمحمدعقیل رضوی مورخہ 14/جنوری 1988
مشمولہ سردارجعفری کے خطوط مرتبہ ڈاکٹرخلیق انجم،ص:146

302۔علی سردارجعفری،ترقی پسندتحریک کی نصف صدی،ص:,21,22

303۔علی سردارجعفری،ترقی پسندتحریک کی نصف صدی،ص:50

304۔علی سردارجعفری،ترقی پسندتحریک کی نصف صدی،ص:57

305۔عمررضا،علی سردارجعفری،ص:555

306۔ہم عصری ادبی مسائل:سردارجعفری سے ایک انٹرویو،عالمی اردوادب،سردارجعفری نمبر 2001،
سردارجعفری:فن اورشخصیت،صفحہ:146

307۔تقریرسردارجعفری،سمینارعصمت چغتائی اورنیااردوافسانہ،دہلی اردواکادمی،10 تا 12 جنوری 1992
بحوالہ جڑیں اورکونپلیں(دورپورتاژ)ازعلی احمدفاطمی،ص:104,105

308۔تقریر علی سردار جعفری،شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی میں منعقدہ سردار جعفری کا تہنیتی جلسہ 27/نومبر 1993،
بحوالہ جڑیں اور کونپلیں(دو رپو تا ژ)از علی احمد فاطمی،ص:39,38
309۔علی سردار جعفری،اردو اور غالب دونوں کو گھر چاہئے،کتاب نما،جولائی 1998،ص:33
310۔علی سردار جعفری،اردو اور غالب دونوں کو گھر چاہئے،کتاب نما،جولائی 1998،ص:34,35,36
311۔علی سردار جعفری،غالب کی کہانی سردار کی زبانی،انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں منعقدہ پروگرام،
نوائے ادب،اکتوبر تا دسمبر 2000 ص:,5,7,8,9
312۔علی سردار جعفری،میں اور میرا فن،ریڈیائی تقریر،ہماری زبان،8/مئی 1976،سہ ماہی اردو ادب،
جولائی اگست ستمبر 2000ص: ,33,34
313۔علی سردار جعفری،میں اور میرا فن،ریڈیائی تقریر،ہماری زبان،8/مئی 1976،سہ ماہی اردو ادب،
جولائی،اگست،ستمبر ص:34
314۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی،یاترا(رپو تا ژ)،ص:,57,58,59,68,69
315۔سردار جعفری،پتھر کی دیوار،ص:13,12،بحوالہ علی سردار جعفری،میں اور میرا فن،
ریڈیائی تقریر،ہماری زبان، 8/مئی 1976ء،سہ ماہی اردو ادب،جولائی،اگست،ستمبر ،2000،ص:,38,39
316۔محمد علی صدیقی،حسن عابدی،مسلم شمیم،شاہد نقوی،مظہر جمیل،ہم عصر ادبی مسائل،
افکار،سردار جعفری نمبر،نومبر دسمبر 1991ء،صفحہ 128
317۔گفتگو(ترقی پسند تحریک سے متعلق مشاہرین ادب سے بات چیت تالیف مظہر جمیل،مکتبہ دانیال،کراچی،
مارچ 1986)صفحہ 40،بحوالہ بیسویں صدی میں اردو ادب مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ،صفحہ 109۔
318۔یہ صورت گر کچھ خوابوں کے(ادیبوں کے انٹرویو)از طاہر مسعود،مکتبہ تخلیق ادب،کراچی،صفحہ 27،
اشاعت دوم ستمبر 1985،صفحہ 161,160،بحوالہ بیسویں صدی میں اردو ادب،
مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ،صفحہ 109
319۔ڈاکٹر راہی معصوم رضا،سردار جعفری،گفتگو بند نہ ہو،
افکار،سردار جعفری نمبر،نومبر دسمبر 1991ء،صفحہ 89,90,91
320۔ڈاکٹر راہی معصوم رضا،سردار جعفری،(انٹرویو) گفتگو بند نہ ہو
،افکار سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء،صفحہ 98
321۔ڈاکٹر راہی معصوم رضا،سردار جعفری،(انٹرویو) گفتگو بند نہ ہو،
افکار سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء،صفحہ 82,100
322۔ ہم عصر ادبی مسائل،سردار جعفری سے ایک انٹرویو،شرکا محمد علی صدیقی،حسن عابدی،مسلم شمیم،شاہد نقوی،
مظہر جمیل مشمولہ عالمی اردو ادب،سردار جعفری نمبر 2001،جلد 19،صفحہ 135

323۔ ہم عصر ادبی مسائل، سردار جعفری سے ایک انٹرویو، عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001ء،
سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ 162

324۔ فصیح احمد، اردو یک بابی ڈرامہ، جنگ آزادی ہندی 1857 تا حصول آزادیٔ ہند 1947
تاریخی، تحقیقی جائزہ، ص:82

325۔ راہی معصوم رضا، سردار جعفری (انٹرویو)، گفتگو بند نہ ہو،
افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، ص:104,105

326۔ راہی معصوم رضا، سردار جعفری (انٹرویو)، گفتگو بند نہ ہو، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991 ص:84

327۔ اعتراف، اپریل 2005، کتابی سلسلہ 1، ندا فاضلی نمبر، ملاقاتیں، ص:,382,383

328۔ علی سردار جعفری سے ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کی ملاقات، اردو دنیا، جنوری تا مارچ 1998، ص:78

329۔ ہم عصری ادبی مسائل، سردار جعفری سے ایک انٹرویو، عالمی اردو ادب،
سردار جعفری نمبر 2001، سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ:135 تا 137

330۔ ہم عصری ادبی مسائل، سردار جعفری سے ایک انٹرویو، عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001،
سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ,146,147,149,150

331۔ ہم عصری ادبی مسائل، سردار جعفری سے ایک انٹرویو، عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001،
سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ,159,160,161

332۔ ہم عصری ادبی مسائل، سردار جعفری سے ایک انٹرویو، عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001،
سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ 102,103

333۔ ہم عصری ادبی مسائل، سردار جعفری سے ایک انٹرویو، عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001،
سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ,139,140,142

334۔ ڈاکٹر قمر رئیس، سردار جعفری اور نیا تنقیدی شعور، افکار، سردار جعفری نمبر، ص:460

335۔ حسن عابدی، سوویت روس میں نئی تبدیلیوں کا پس منظر۔ انٹرویو حسن عابدی، سردار جعفری،
افکار سردار جعفری نمبر، ص:75

336۔ حسن عابدی، سوویت روس میں نئی تبدیلیوں کا پس منظر۔ انٹرویو حسن عابدی، سردار جعفری،
افکار سردار جعفری نمبر، ص:75

337۔ حسن عابدی، سوویت روس میں نئی تبدیلیوں کا پس منظر۔ (انٹرویو) کراچی، سردار جعفری،
افکار سردار جعفری نمبر، ص:71

338۔ حسن عابدی، سوویت روس میں نئی تبدیلیوں کا پس منظر۔ انٹرویو کراچی، سردار جعفری،
افکار سردار جعفری نمبر، ص:74

339۔حسن عابدی،سوویت روس میں نئی تبدیلیوں کا پس منظر۔انٹرویو کراچی، سردار جعفری،
افکار سردار جعفری نمبر،ص:74

340۔حسن عابدی،سوویت روس میں نئی تبدیلیوں کا پس منظر۔انٹرویو کراچی،سردار جعفری،
افکار سردار جعفری نمبر،ص:74

341۔ہم عصری ادبی مسائل(سردار جعفری سے ایک انٹرویو،عالمی اردو ادب،سردار جعفری نمبر 2001
سردار جعفری:فن اور شخصیت،صفحہ 143

342۔ڈاکٹر اسلم پرویز،شاعر علی سردار جعفری،علی سردار جعفری:ایک مطالعہ،
گجرات اردو ساہتیہ اکادمی،گاندھی نگر،ص:86

343۔احمد جلیس(مرتب)سردار جعفری سے باتیں،صبا،فروری مارچ 1966،ص:23

344۔عظمیٰ ناز،سردار جعفری سے ایک ملاقات،افکار،سردار جعفری نمبر،ص:153

345۔عظمیٰ ناز،سردار جعفری سے ایک ملاقات،افکار،سردار جعفری نمبر،ص:,155,156

346۔عظمیٰ ناز،سردار جعفری سے ایک ملاقات،افکار،سردار جعفری نمبر،ص:153

347۔عظمیٰ ناز،سردار جعفری سے ایک ملاقات،افکار،سردار جعفری نمبر،ص:153

348۔ڈاکٹر انیس اشفاق،سردار جعفری کی شعریات سازی مشمولہ علی سردار جعفری:ایک مطالعہ،
گجرات اردو ساہتیہ اکادمی،گاندھی نگر،ص:114، 121 تا 126

349۔ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی،اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر،ص:512

350۔ڈاکٹر اسلم پرویز،شاعر علی سردار جعفری،علی سردار جعفری:ایک مطالعہ،
گجرات اردو ساہتیہ اکادمی،گاندھی نگر،ص:90

351۔پروفیسر ابو الکلام قاسمی،معاصر تنقیدی رویے،ص:178 تا 181

352۔پروفیسر ابو الکلام قاسمی،معاصر تنقیدی رویے،ص:,184,185,187,189

353۔شافع قدوائی،علی سردار جعفری کی تنقید،آج کل،اپریل 1998،ص:32

354۔اعتراف،اپریل 2005،کتابی سلسلہ 1،ندا فاضلی نمبر(ملاقاتیں)،ص:,384,385

355۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی،سردار جعفری اور ترقی پسندی مشمولہ نئی تنقید اور نئے اقدار از علی احمد فاطمی،ص: 154,155

356۔پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی،عہد عزم و پیکار کی یادگار مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن
مرتبہ اصغر عباس،صفحہ 75

357۔پروفیسر سید محمد عقیل،سردار جعفری:ایک جائزہ،الہ آباد کے حوالے سے،مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن
مرتبہ اصغر عباس،ص:90

358۔ڈاکٹر سلطان احمد، علی سردار جعفری، شخصیت اور فن کے آئینے میں مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن
مرتبہ اصغر عباس، ص:, 265,266
359۔تقریر علی سردار جعفری، شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی میں منعقدہ سردار جعفری کا تہنیتی جلسہ 27/نومبر 1993
بحوالہ جڑیں اور کونپلیں (وو رپورتاژ) از علی احمد فاطمی ص: 38 تا 41
360۔علی سردار جعفری، کالو بھنگی: ایک کردار، ایک علامت مشمولہ کرشن چندر: شخص اور ادیب،
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، ص: 106
361۔پروفیسر علیم اللہ حالی، روح عصر کا شاعر، آج کل، اکتوبر 2000 ص: 24,25
362۔ڈاکٹر سید سراج الدین اجملی، سردار جعفری کا نظریہ شعر، مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن
مرتبہ اصغر عباس، ص: 363، 362 اور پتھر کی دیوار از سردار جعفری ص: (11+11،4)
363۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، ص: 120
364۔شافع قدوائی، علی سردار جعفری کی تنقید، آج کل، اپریل 1998، صفحہ: 28,29,32,
365۔ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری کا شعری سفر، جامعہ، اکتوبر 1980
366۔ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری: تاریخی شعور کا زندہ استعارہ
مشمولہ علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، ص: 92,93,94,95,96,98
367۔پروفیسر شارب ردولوی، سردار جعفری اور نقد شعر مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، ص:, 390,391,392,399
368۔پروفیسر شارب ردولوی، تنقیدی مباحث، ص: 45,46
369۔پروفیسر شارب ردولوی، سردار جعفری اور نقد شعر مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، ص: 390
370۔پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، غالب کے چند نقاد، ص: 195
371۔پروفیسر ابو الکلام قاسمی، معاصر تنقیدی رویے، ص: 184
372۔پروفیسر ابو الکلام قاسمی، معاصر تنقیدی رویے، ص: 189
373۔شافع قدوائی، علی سردار جعفری کی تنقید، آج کل، اپریل 1998، ص: 31 اور
علی سردار جعفری، پیغمبران سخن، ص: 8
374۔ادارہ، حرف آغاز، ماہنامہ ایوان اردو، دہلی، ستمبر 2000 ص: 4
375۔پروفیسر سید فضل امام رضوی، سردار جعفری کا انتقادی عمل مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن، ص: 149 تا 153
376۔ڈاکٹر وحید اختر، سردار جعفری: خواب اور شکست خواب مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، ص: 185

377۔عمر رضا،علی سردار جعفری،ص:570

378۔سید محمد مہدی،سردار جعفری اور ترقی پسندی مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس،ص:

379 ۔ڈاکٹر ہمایوں اشرف،حرکت و انقلاب کا استعارہ علی سردار جعفری،ایوان اردو،ستمبر 2000،ص:90,89

380۔پروفیسر کوپی چند نارنگ،علی سردار جعفری:ترقی پسندی کے تاج کا نگینہ مشمولہ جدیدیت کے بعد

از کوپی چند نارنگ،ص:469,470

381۔راشد انور راشد،سرور کی تنقیدی بصیرت،آج کل،نئی دہلی،جون 2002 ص:21,24

382۔فدا المصطفیٰ فدوی،احتشام حسین:حیات و شخصیت اور کارنامے،ص:187,188

383۔سردار جعفری،دیباچہ:دیوان غالب،ص:21

384۔نصرت جبیں،سردار جعفری بحیثیت نثر نگار،عالمی اردو ادب،سردار جعفری نمبر 2001،

سردار جعفری:فن اور شخصیت،ص:205 تا 209

☆☆☆